ڈاکٹر ذاکر حسین

پیامِ تعلیم

ایڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

سالانہ چندہ : پانچ روپے

فی پرچہ : پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فہرست مضامین

بچّوں سے باتیں

لیجیے آٹھ سال بعد پیام تعلیم پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور انشاء اللہ مسلسل حاضر ہوتا رہے گا۔

یہ رسالہ ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا۔ پورے اکیس [۲۱] سال اس نے آپ کا جی بہلایا، آپ کے لیے اچھی اچھی معیاری کہانیاں چھاپیں، مفید معلومات فراہم کیں۔ مختلف مشغلوں کا شوق دلایا۔ قومیت اور آپس میں بھائی چارے کی تعلیم دینے کے لیے پیام برادری قائم کی جس کی شاخیں ہندوستان بھر میں دور دور تک قائم ہوگئیں۔ لڑکیوں اور بچوں کے لیے ان کے مفید مطلب مضمون شائع کیے۔

۱۹۴۷ء کی گڑبڑ میں یہ شمع گل ہوگئی۔ لیکن ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس کی ضرورت محسوس کی اور جامعہ کی مدد سے یہ غالباً ۱۹۴۹ء میں پھر جاری ہوا۔ کچھ عرصے بعد مکتبہ جامعہ کی حالت سنبھل گئی تو اس نے اسے اپنی نگرانی میں لے لیا اور اب یہ کام جناب اطہر پرویز صاحب کے سپرد ہوا۔ ۱۹۵۶ء تک پرویز صاحب رسالے کو کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے، لیکن اسی سال وہ علی گڑھ تشریف لے گئے اور رسالہ بند ہوگیا۔

لیکن پیام تعلیم کا اس طرح بند ہونا ہمارے، آپ کے، سب کے لیے ایک حادثہ تھا، اس کا اندازہ آپ کے خطوں سے ہوتا ہے۔ یہ خط مکتبے میں لگاتار آتے رہے ہیں۔

اس مدت میں مکتبہ جامعہ کے جنرل مینیجر جناب غلام ربانی تاباں صاحب اور مکتبہ کے سبھی کارکن اسے دوبارہ جاری کرنے کی ضرورت محسوس کرتے رہے۔ مگر دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس طرف پوری پوری توجہ کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

اس سال مکتبے نے خاص سرگرمی اور جوش دکھایا، آخر پیام تعلیم نکالنے کی بات پکی ہوگئی۔

محترم تاباں صاحب نے اس کی ادارت یا اسے ترتیب دینے کا کام میرے سپرد کیا ہے، اور میں نے آپ کے بھروسے اپنے بزرگوں کی سرپرستی، اپنے ساتھیوں کی مدد اور مفید مشوروں کے سہارے پر یہ ذمے داری قبول کرلی ہے۔

میں نے لگ بھگ ۱۰، ۱۱ سال تک پیام تعلیم کے ذریعے آپ کی خدمت کی ہے۔ اس زمانے میں ڈھیر سے بچوں کے لیے لکھنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا۔ بعض بڑے اچھے ادیب پیدا ہوگئے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد یہ حلقہ ٹوٹ گیا۔ میں نے اب پھر اس حلقے کو قائم کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔

اس سلسلے میں مخدوم و محترم ڈاکٹر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب، پروفیسر سرور صاحب نے میری ہمت بڑھائی ہے اور پیام تعلیم کے لیے بڑے اچھے پیغام مرحمت فرمائے ہیں۔ یہ پیام تعلیم کے لیے بڑی نیک فال ہے۔

ان کے علاوہ پرانے ساتھیوں میں

سید محمد ٹونکی صاحب ایم اے (جامعہ ہولانا محمد حفیظ الدین صاحب نائب معتمد انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر محمد غوث انصاری صاحب لیکچرر لیبیا یونی ورسٹی، قیصر حسین زیدی صاحب ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ڈاکٹر سید نورالحسن صاحب ہاشمی پروفیسر لکھنؤ یونی ورسٹی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی لکچرر لکھنؤ یونی ورسٹی۔ اکمل مشتاق صاحب کاکوروی، عبدالحلیم صاحب ندوی لکچرر عربی جامعہ کالج، شجاع احمد صاحب قائد حیدر آباد دکن نے ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے اور ہر طرح کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔

ان سب بزرگوں اور ساتھیوں کی مدد سے ہم آپ کے پیام تعلیم کو انشاءاللہ بہتر سے بہتر صورت میں نکالنے کی کوشش کریں گے۔ خدا نے کیا تو آپ کا رسالہ ہر اعتبار سے اس آزاد دیش کے نئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ اس میں سب کچھ ہوگا۔ جس کی آپ کو ضرورت ہے، یا جس کے آپ خواہش مند ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ رسالہ آپ کا اپنا رسالہ ہوگا۔

اس موقعے پر کچھ پرانے ساتھی رہ رہ کر یاد آرہے ہیں۔ یہ اب اللہ کو پیارے ہوئے ان میں سید ابوطاہر دا(؟) مرحوم، بچوں کے ادیب جناب الیاس مجیبی مرحوم، ڈاکٹر سعید بریلوی مرحوم، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سید ابوطاہر صاحب بچوں کے لیے سائنس کے مضمون آسان سادہ زبان میں بہت انوکھے اور دلچسپ انداز میں لکھتے تھے۔ مجیبی صاحب نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ آخر میں تو وہ بچوں کے ادیب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یہ لوگ زندہ ہوتے تو انھیں پیام تعلیم کے دوبارہ نکلنے کی کتنی خوشی ہوتی!

اچھا اب آپ اپنے پرچے کے سب مضمون پڑھیے اور ان کے بارے ہمیں اپنی رائے بتائیے۔ یہ بھی بتا کہ پرچے میں اور کیا کیا ہونا چاہیے

مخدوم محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مدظلہ
نائب صدر جمہوریہ ہند

۲۱ مئی ۱۹۶۴ء

مجبی حسین حسان صاحب۔ تسلیم
آپ کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ
یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ "پیام تعلیم" دوبارہ جاری کیا جا رہا ہے۔ اس پرچے کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ مجھے ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ایسے لوگ ملے ہیں جو اب اچھا لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے پہلے پہل کچھ "پیام تعلیم" کے لیے لکھا تھا۔ پھر خود آپ کا تعلق اس پرچے سے بہت پرانا ہے۔ ضرور نکالیے، یقین ہے کہ اچھا نکلے گا۔ ہاں زمانے کے ساتھ ساتھ بچوں کی پسند کا معیار بلند ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے پرچہ ایسا نکلے کہ نئی نسل اسے اپنائے۔ یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔

والسلام
مخلص ذاکر حسین

مخدوم و محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ

پیام تعلیم ۲۶ء میں بچوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ بچوں میں وہ بہت ہردلعزیز ہوا اور اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی شوق پیدا کرنے کی ضرورت تھی، کہ وہ بچوں کے لیے لکھ کر اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں جامعہ میں آیا تو مجھے اپنی زبان میں اپنا مطلب ادا کرنے میں کتنی دشواری ہوتی تھی، اور رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم کس طرح میری ادبی تربیت کا ذریعہ بنے، رسالہ جامعہ ۶۰ء سے دوبارہ جاری ہو گیا ہے اور مجھے پرانے طریقے پر فیض پہنچا رہا ہے۔ فیض کا دوسرا چشمہ بھی اب پھوٹ نکلا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسے مبارکباد دوں یا اپنے آپ کو۔

محمد مجیب
۱۳ جون ۶۴ء

جناب پروفیسر آل احمد سرور

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ پیام تعلیم پھر جاری ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے چاہنے والے اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ ولولہ انگیز پیام تو کسی رہ نمائے قوم سے مانگیے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس عرصے میں بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے مسائل خاصے پیچیدہ ہو گئے ہیں اور یقین ہے کہ پیام تعلیم ان نئے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

مخلص آل احمد سرور

مخدوم و محترم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

جامعہ ملیہ کا تعلیمی آرگن "پیام تعلیم" ۱۹۲۶ء میں نکلا اور اس نے بہت جلد غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کا خطاب در اصل بچوں سے تھا مگر خیالات کی تازگی اور انداز بیان کی دلکشی کی بنا پر بڑے بھی اسے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ چند سال پہلے بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ پرچہ بند ہو گیا اس عرصے میں بچوں کے کئی اچھے رسالے نکلے مگر پیام تعلیم کی کمی پوری نہ ہو سکی اس لیے کہ سنجیدگی اور شگفتگی، سادگی و پرکاری کا جو امتزاج اس کے مضامین میں تھا وہ اسی کے حصے کی چیز تھی۔

آج یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ پیام تعلیم کی اشاعت کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور وہ بھی جناب حسین حسان صاحب کی ادارت میں جو روز اول کے بڑے حصے میں اس کے مدیر رہے تھے۔ خدا سے دعا ہے کہ اس بار اسے پہلے سے بھی زیادہ مقبولیت اور صحیح معنی میں "ہر دلعزیزی" حاصل ہو۔

عطا کر قسمتِ تصنیفِ سعدی یارب اس گل کو
پھلے پھولے زمانے میں گلستاں بوستاں ہو کر

سید عابد حسین
۱۵ جون ۱۹۶۴ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی مدظلہٗ

علی گڑھ - ۹ مئی ۱۹۶۴ء

حسان صاحب، سلام شوق - آپ پیامِ تعلیم (دورِ نو) کے لیے مضمون چاہتے ہیں، مضمون نہیں تو پیام سہی! پیامِ تعلیم کا ذکر کرکے آپ نے کتنی اور کیسی کیسی یادیں ذہن میں بیدار و بے قرار کردیں۔ جیسے برسات میں کوئی بڑا دریا دفعتاً طغیانی پر آجائے!

اس وقت جامعہ اور پیامِ تعلیم کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب وہاں کا ہر آتش جوان تھا اور ہر بوڑھا آتش بجاں! کیا دن تھے اور کیسے کیسے کام کرنے والے! دیکھیے تو ادھر ادھر کچھ متفرق و منتشر، مفلس کی اولاد کی طرح خستہ و خوار مکانات، جہاں تہاں کا واک، ناصاف نیچے اونچے میدان، تھوڑے سے طالب علم اسی اعتبار سے معلم، نہ ساز و سامان نہ جلسہ جلوس لیکن گھومیے پھریے، کام کرنے والوں سے ملیے تو دل کے دریچے کھلنے لگتے تھے۔

قرول باغ کی وہ فضا اور گرد و پیش آج ناپید ہیں۔ شاید ان کا تصور بھی مشکل سے کیا جا سکے۔ لیکن اس ویرانے کے مقابلے میں آج دہلی کی کوئی عمارت، کوئی ادارہ، کوئی سیرگاہ، آنکھوں میں نہیں جچتی خود جامعہ و جامعہ نگر بھی! گزشتہ اور موجودہ علی گڑھ کے بارے میں

بھی میرا یہی خیال ہے۔

لیکن میں اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ حال اور مستقبل بوڑھوں کی طرف التفات نہیں کرتے اس لیے بوڑھے بھی حال اور مستقبل سے عداوت رکھتے ہیں۔ یہ عدم التفات اور عداوت ازل سے چلی آرہی ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ حال اور مستقبل تو ماضی میں بدلتے رہیں گے، ماضی کو حال اور مستقبل کی حیثیت کبھی نہ حاصل ہوگی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کتنا ہی شاندار و دل کش کیوں نہ رہا ہو اس کی بازیافت کی بے سود تمنا میں حال اور مستقبل سے بدگمان نہ ہونا چاہیے۔ ایسا کرنے کے معنی تو یہ ہوئے کہ پیچھے جانا پہلے سے ناممکن تھا آگے بڑھنے کے سارے راستے اوپر سے بند کرلیے۔

پیام تعلیم کے دور اول میں جن بچوں کا حال لکھا گیا ماشاءاللہ وہ سیانے ہوچکے ہیں۔ اب وہ ہم پر یا اپنے بچوں پر لکھیں گے۔ اگر ان کا لکھنا زندگی اور ادب دونوں کے صالح و صحت مند روابط کے مطابق ہوا تو اس سے پیام تعلیم کی قائم کی ہوئی روایت کی بڑائی ثابت ہوگی اور آپ اپنی خدمات کا صلہ پانے کے مستحق ہوں گے۔ یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ حال ماضی پر فخر کرے اور مستقبل پر کمند پھینکے!

نیاز مند

رشید احمد صدیقی

مخدوم و محترم منشی تلوک چند صاحب محروم

گھر گھر پہنچے پیامِ تعلیم

اے کشورِ ہند کے محبّو
کم ہے ابھی فیضِ عامِ تعلیم
تعلیم نہ ہو تو کیا ترقی
لازم ہے التزامِ تعلیم
ہر قریہ منسلک ہو اِس میں
اس نہج پہ ہو نظامِ تعلیم
جاتا ہے کہاں ہمائے اقبال
دیکھو تو بچھا کے دامِ تعلیم
دورِ حاضر کا ہے تقاضا
گھر گھر پہنچے پیامِ تعلیم

محمد حسین حسّان
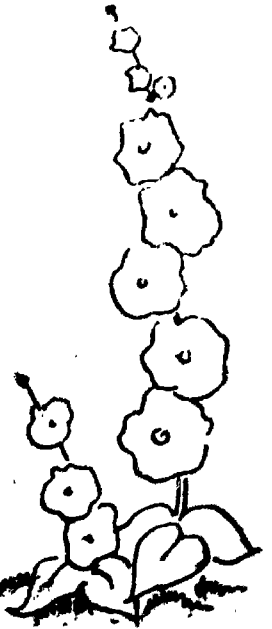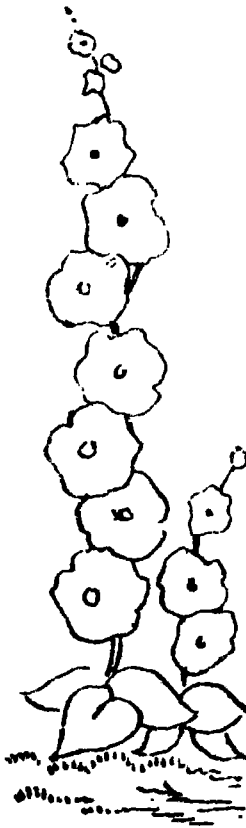
ایک بڑا حادثہ

۲۷ رمئی کو ہمارے دیس میں اچانک ایک بڑا حادثہ پیش آگیا۔ بڑا ہی دردناک حادثہ! سارے دیس پہ سکتا سا چھا گیا۔ ساری دنیا غم والم میں ڈوب گئی!

لگ بھگ دن کے دو بجے ریڈیو پر گانا ہو رہا تھا۔ یکایک یہ گانا بند ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں اعلان کرنے والے نے بہت دھیمی، بہت غمگین آواز میں خبر سنائی کہ پنڈت جواہرلال اس دنیا سے چل بسے۔ سننے والوں کی جیسے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ لوگوں کو اس خبر پر یقین نہیں آرہا تھا یا یوں کہیے کہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پر جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ قدرت نے ہمارے محبوب رہنما کو ہم سے چھین لیا تھا۔ ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کے پاس جانے والے ہیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو دیس کے بڑے پیارے، بڑے محبوب رہنما تھے انھوں نے لگ بھگ پچاس برس تک دیس کی سیوا کی، دیس کی آزادی کی لڑائی میں ہر طرح کی مصیبتیں اٹھائیں اور جب آزادی ملی تو دیس کا انتظام سنبھالنے کے لیے ان ہی کو سب نے آگے بڑھایا، وہی ملک کے سب سے پہلے وزیر اعظم بنے۔

اور انھوں نے دیس کو آگے بڑھانے میں، اسے ترقی دینے میں، اس کا نام اونچا کرنے میں اپنا تن من سچ سچ وار دیا۔

ان میں محبت تھی۔ خلوص تھا۔ سچائی تھی۔ قربانی کا جذبہ تھا، وہ اپنے دیس کو اس غریبی کی حالت سے نکالنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دیس کے سب لوگ مل جل کر رہیں، میل محبت سے رہیں، مل جل کر دیس کو آگے بڑھانے کے کاموں میں جُٹ جائیں

اسی طرح وہ چاہتے تھے کہ دنیا کے سارے ملک لڑائی بھڑائی کا خیال دل سے نکال دیں۔ صلح صفائی سے رہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی نہ کریں۔ انھوں نے اس کے لیے کوشش بھی کی پنج شیل کے نام سے پانچ اصول بنائے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں نے انھیں دل سے قبول کیا۔

انھیں بچوں کے ساتھ بھی بڑی محبت تھی۔ بچوں میں وہ بچہ بن جاتے تھے۔ دیس کے بلکہ دیس کے باہر کے بچے بھی انھیں چاچا نہرو کہنے لگے تھے۔

اپنے ایسے پیارے، ایسے محبوب رہنما، اپنے چاچا نہرو ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئے۔ ہم جتنا بھی غم کریں کم ہے۔

قطعہ

تاریخ وفات پنڈت جواہر لال نہرو

نازشِ انسانیت فخرِ وطن جاتا رہا
انجمن برہم ہے صدرِ انجمن جاتا رہا
بلبلیں ہیں نوحہ خواں، پژمردہ گل بوٹے اداس
لو چمن اجڑا نگہبانِ چمن جاتا رہا
سالِ رحلت تم سے نہرو کا کوئی پوچھے اگر
کہہ دو میرنؔ "دیش بھارت کا رتن جاتا رہا"

۱۹۶۴ء

الٰہ آباد　　حکیم میرنؔ دہلوی

افسردگی میں ڈوب سی جاتی ہے کائنات
تاباں وہ حادثہ ہے کسی دیدہ ور کی موت

پیدائش ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء　　　　وفات ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء
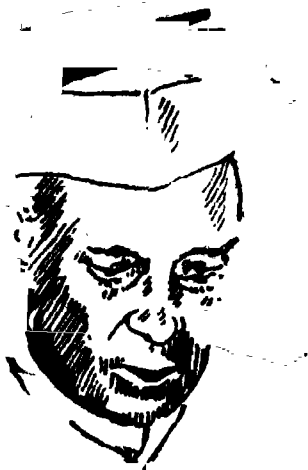
ترجمہ شاکرہ ندیم ام اے

چاچا نہرو کا خط دیس کے بچّوں کے نام

یہ خط ۱۹۴۹ء میں شنکر ویکلی کے ایک خاص نمبر میں چھپا تھا،
ہم اس کا ترجمہ شنکر ویکلی کے شکریہ کے ساتھ اپنے پیامیوں
کے لیۓ شائع کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ ایک طرح سے آزاد ترجمہ
ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ پنڈت جی کے خیالات کو سادہ
اور آسان زبان میں بیان کر دیا جائے۔

"ایڈیٹر"

شنکر نے اپنے شنکر ویکلی کے خاص نمبر" بچوں کا نمبر" کے لیے مجھ سے کچھ لکھنے کو کہا۔ اس وقت رسالے سے زیادہ بچوں کا خیال میرے دماغ پر چھا گیا تھا۔ میں نے وعدہ تو کرلیا مگر فوراً ہی یہ بات محسوس ہوئی کہ میں نے اس معاملے میں جلدی کی۔ اور اب میں لکھوں تو کیا لکھوں۔

بچوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ان سے باتیں کرنا' اتنا ہی نہیں ان کے کھیل کود میں شریک ہونا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس وقت میں یہ بھول جاتا

ہوں کہ اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرے بچپن کو گزرے ایک طویل عرصہ ہو چکا ہے۔

نیک بچو! میں جب بھی تمھیں کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو اپنی عمر کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات میں بھلا نہیں سکتا کہ میرے اور تمھارے درمیان (عمر کا) ایک لمبا فاصلہ ہے۔ یہ لمبا فاصلہ ہم میں تم میں ایک امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

بڑے بوڑھوں کی ایک عادت ہوتی ہے، وہ اکثر بچوں کو وعظ و نصیحت شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے اپنے بچپن میں یہ نصیحتیں مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ شاید تمھیں بھی یہ کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی ہوں گی۔

بزرگوں میں ایک عادت اور ہوتی ہے وہ اپنے کو بہت عقل مند اور سمجھ دار ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگرچہ عقل اور سوجھ بوجھ کی دولت ہم میں سے بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ میں اپنی عقل کے بارے میں بھی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ کبھی کبھی (اپنے بارے میں) لوگوں کی باتیں سن سن کر ایسا لگتا ہے کہ مجھے بہت ہی سمجھ دار بہت ہی ذہین ہونا چاہیے۔ مگر جب میں خود اپنے پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس بات میں شک سا ہونے لگتا ہے۔ سمجھ دار اور عقل مند لوگ اپنی عقل مندی کا چرچا نہیں کرتے پھرتے نہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ دوسروں سے بلند و برتر ہیں۔

اس لیے میں تمھیں کوئی نصیحت نہ کروں گا کہ تمھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ یہ باتیں تو تمھیں اپنے استادوں اور دوسرے لوگوں سے معلوم ہی ہوتی رہتی ہوں گی۔ نہ مجھے ایسا انداز اختیار کرنا ہے جس

سے معلوم ہو کہ ہم دوسروں سے بلند و برتر ہوں۔

تو پھر میں کیا لکھوں۔ کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ تم اگر میرے پاس ہوتے تو مجھے یہی اچھا لگتا کہ اس خوب صورت دنیا کے بارے میں تم سے باتیں کروں، اس کے خوب صورت رنگ برنگے پھولوں، اس کے درختوں۔ اس کے پرندوں اور جانوروں کے بارے میں باتیں کروں۔ اونچے اونچے پہاڑوں اور برف کے تودوں کی باتیں کروں ان عجیب و غریب چیزوں کی باتیں کروں جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم بڑی عمر کے لوگ تو اکثر اپنے روز مرہ کے دفتری کاموں میں بالکل کھو جاتے ہیں اپنے ارد گرد کی خوب صورت فضا اور دل کش ماحول سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم بہت ہی اہم کام انجام دے رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم زیادہ سوجھ بوجھ، زیادہ عقل مندی سے کام لوگے۔ تمھارے چاروں طرف جو زندگی جو حسن اور دل کشی ہے اسے دیکھنے اور سننے کے لیے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھوگے۔

اچھا بتاؤ تم پھولوں کو ان کے نام سے اور چڑیوں کو ان کی آواز سے پہچان سکتے ہو۔ اگر ہم محبت دوستی اور پیار کے جذبے کے ساتھ ان کے پاس جائیں تو ان چیزوں کو اور قدرت کی دوسری چیزوں کو دوست بنانا کتنا آسان ہے۔ تم نے پریوں کی کہانیاں اور بہت پرانے زمانے کی داستانیں ضرور پڑھی ہوں گی، مگر یہ دنیا خود پریوں کی بہت شان دار کہانی ہے۔ ہمت اور مردانگی کی بے مثال داستان ہے۔ ضرورت بس اس بات کی ہے کہ انھیں دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے

کان ہوں۔ سوچنے سمجھنے اور ان چیزوں
کو محسوس کرنے والا دماغ ہو۔
ان بڑی عمر کے لوگوں کی ایک
اور عجیب و غریب عادت ہے۔ اپنے
آپ کو مختلف گروہوں اور حلقوں
میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ تفرقے کی
یہ دیواریں ان کی اپنی بنائی ہوئی
ہوتی ہیں۔ مگر اپنے حلقہ کے
باہر ہر شخص ان کے لیے اجنبی ہے
جس سے نفرت کرنا ضروری ہے
یہ دیواریں طرح طرح کی ہیں۔ مذہب
کی ہیں۔ رنگ و نسل کی ہیں۔
پارٹی کی ہیں۔ قوم پرستی کی ہیں
زبان اور رسم و رواج کی ہیں،
غریبی اور امیری کی ہیں۔ اس
طرح وہ اپنے ہی بنائے ہوئے
قید خانوں میں رہتے ہیں۔ خوش قسمتی
سے بچوں کو آپس کے تفرقے اور
تعصب پیدا کرنے والی ان تمام
جکڑ بندیوں کا احساس نہیں ہوتا۔
وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر
کھیلتے ہیں۔ پڑھتے ہیں اور کام کرتے
ہیں۔ مگر جوں جوں وہ بڑے ہوتے جاتے
ہیں۔ دھیرے دھیرے انھیں اپنے
بڑوں کی باتوں کا علم ہوتا جاتا ہے۔
مگر خیر ابھی تو تمھیں بڑا ہونے
میں کافی دن لگیں گے۔

تھوڑے دن ہوئے میں امریکہ،
کنیڈا، اور انگلستان کے دورے
پر گیا تھا۔ یہ بہت لمبا سفر تھا۔
بس یوں سمجھو کہ میں دنیا کے دوسرے
سرے پر تھا ان ملکوں کے بچوں
کو میں نے اپنے ہاں کے بچوں
سے بہت کچھ ملتا جلتا پایا۔ اس
لیے میں نے بہت آسانی سے ان
سے دوستی کر لی۔ جب بھی مجھے
وقت ملا تو میں ان کے ساتھ
تھوڑی دیر کے لیے کھیل میں ضرور
شریک ہوا۔ بڑوں کی باتیں کرنے
کے مقابلے میں میرے لیے یہ
زیادہ دلچسپ تھا۔ کیونکہ بچے تو
ہر جگہ کے ایک جیسے ہوتے ہیں

یہ تو ہم بڑی عمر کے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں سے الگ تھلگ اور ممتاز ہیں۔

کچھ مہینے گذرے مجھے جاپان کے بچوں نے ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے مجھ سے ایک ہاتھی کی فرمائش کی تھی۔ میں نے ان کو ایک بہت پیارا ہاتھی ہندوستان کے بچوں کی طرف سے تحفہ میں بھیجا۔ یہ ہاتھی میسور سے لایا گیا تھا۔ اور اس نے جاپان تک سارا سفر سمندر کے ذریعہ کیا۔ جب ٹوکیو پہنچا تو ہزاروں ہزار بچے اسے دیکھنے آئے۔ بہت سے بچوں نے تو ہاتھی کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ اس طرح یہ سیدھا سادا شریف جانور جاپان کے بچوں کے لیے ہندوستان کا ایک نشان بن گیا۔ اور ان دو ملکوں کے بچوں کی دوستی کا ذریعہ ثابت ہوا۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ ہمارے اس تحفہ کو پاکر بچے اتنے خوش ہوئے اور انھیں ہمارے دیس کے بارے میں سوچنے کا خیال آیا۔ ہمیں بھی ان کے دیس جاپان اور اس کے ساتھ دنیا کے دوسرے ملکوں کے بارے میں اسی طرح سوچنا چاہیے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ بچے ہر جگہ کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ وہ تمھاری طرح اسکول جاتے ہیں۔ کھیلتے ہیں ان میں جھگڑے بھی ہوتے ہیں، لیکن آخر میں دوست بن جاتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں تم ان ملکوں کے حالات پڑھ سکتے ہو۔ بڑے ہوکر تم ان ملکوں میں جاؤگے مگر دوست بن کر جانا۔ وہاں تمھیں خوش آمدید کہنے والے دوست ملیں گے۔

تم سب جانتے ہو کہ تم میں ایک بہت بڑا آدمی ہو گذرا ہے اس کا نام تو گاندھی تھا۔ لیکن ہم

محبت اور پیار سے ہم انھیں باپو جی پکارتے تھے۔ وہ بہت دانش مند تھے۔ مگر کبھی اس کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ وہ سیدھے سادے اور بہت سی باتوں میں بھولے بھالے آدمی تھے۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کے دوست تھے۔ ہر آدمی چاہے وہ کاشتکار ہو یا مزدور امیر ہو یا غریب، جو بھی ان سے ملتا وہ بڑی محبت سے، بڑے کھلے دل سے اس سے ملتے۔ صرف ہندوستان ہی کے نہیں۔ بلکہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے دوست تھے۔ انھوں نے ہمیں سبق دیا کہ کسی سے نفرت نہ کرو۔ لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ ہر ایک کے ساتھ مل کر کھیلو۔ اور ملک کی خدمت کے لیے ایک ہوکر کام کرو۔ انھوں نے ہمیں سکھایا کہ کسی بات سے نہ ڈرو۔ اور زندگی کی مشکلوں کا مقابلہ ہنس کھیل کر کرو۔

ہمارا دیس بہت لمبا چوڑا دیس ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو مل کر ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اگر ہر بچہ لڑکا یا لڑکی اپنے حصے کا کام کر ڈالے تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ ملک خوش حال ہو گا۔ اور ترقی کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھے گا۔

میں نے اس خط میں تم سے اس طرح باتیں کرنے کی کوشش کی ہے جیسے تم سب میرے سامنے بیٹھے ہو۔ اور جتنا کہنا چاہتا تھا اس سے بہت زیادہ کہہ گیا ہوں۔

تمھارا پیارا
چاچا

اپنے دیس میں نہرو بن کر چمکا ایک ستارا
ہر سو روشن ہو کر جس نے دور کیا اندھیارا

چمکا اپنے دیس میں پہلے پھر جگ کو چمکایا
امن کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر دنیا میں لہرایا

بچوں کا وہ چاچا نہرو دنیا بھر کا پیارا
ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کی آنکھ کا تارا

چھوڑا جس نے سکھ کا جیون دیس پہ تن من وارا
ایسا لیڈر لائیں کہاں سے نہرو جیسا پیارا

دیس کی آزادی کی خاطر جیل میں عمر گذاری
"میری کہانی" جیل میں لکھی جس نے اپنی ساری

"خط بیٹی کے نام" جو لکھے ان میں یہ بتلایا
دنیا کے ملکوں نے کیسے اتنا نام کمایا

جس نے دیس پہ قرباں کر دی اپنی ساری مایا
اس نے "تلاش ہند" میں آخر ہند کو اپنے پایا

جس نے مکمل آزادی کی راہ پہ دیس کو ڈالا
آزادی کا ہم نے نہ دیکھا اس جیسا متوالا
انگریزوں کو دے ہی دیا پھر اس نے دیس نکالا
دیس کی آزادی کا اپنی بنا وہی رکھوالا
لے کر گاندھی جی کی دعائیں کام کیا یہ بھاری
اور عبوری دور کی اس نے لی ذمے داری
لیکن اس اندھیاری میں بھی حق کا دیپ جلایا
دیس کی نیّا طوفانوں سے پار لگا کر لایا
دیس میں جمہوری قدروں کو اس نے کیا پھر جاری
اپنے وطن کو اونچا اٹھایا کام کیے کچھ بھاری
اپنی ان تھک محنت سے پھر دیس کی پلٹی کایا
اتنی اونچی منزل پر وہ اس کو لے کر آیا
اس کی اچانک موت سے دنیا ڈوبی غم میں ساری
دل کی کلی مرجھائی ہوئی ہے زخم بڑا ہے کاری
اس کے مقاصد پورے ہوں ہم ایسے کام کریں گے
اپنے وطن کا جگ میں اونچا ہم بھی نام کریں گے
اُس نے نہرو دکھائیں ہم کو مستقبل کی راہیں
امن کی مشعل جلتی رہے گی ہم سب ایسا چاہیں

مولانا عبد الحلیم ندوی جامعی ایم اے علیگ
ریسرچ اسکالر و ہیومنیٹی لیکچرر
جامعہ کالج

تو ہو جائے مقابلہ!

(ایک عربی کہانی)

ایک دن بی لومڑی کو سیر کی سوجھی۔ جنگل میں تھوڑی دور گئی ہوں گی کہ ایک طرف سے "پھوں پھوں" کی آواز آئی۔ بہت حیران ہوئیں اور چپکے چپکے قدم اٹھاتی آگے بڑھیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ایک ریچھ کسی جنگلی درخت کی جڑیں چبا رہا ہے اور جڑوں سے مٹی صاف کرنے کے لیے بار بار پھونکتا جاتا ہے۔ لومڑی نے قریب جا کر ریچھ سے کہا۔ "بھالو بھیا، بھالو بھیا کیا کر رہے ہو؟"

بھالو نے کہا: "بھئی کر کیا رہے ہیں، بھوک لگی تھی، آج شکار ہاتھ نہ آیا۔ میٹھے درخت کی جڑیں چبا رہے ہیں۔"

لومڑی زور سے ہنسی اور بولی: "اور مجھے دیکھو مزے سے کھاتی ہوں۔ چین کی بنسری بجاتی ہوں اور سب اپنی سوجھ بوجھ کے بل پر۔ اسی لیے تو لوگ عقل مندی میں میری مثال دیتے ہیں۔"

ریچھ کھسیانا ہو گیا۔ بولا: "آے بی بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ، پیٹ بھرا ہے نا، اسی

لیے دوڑ کی ہانک رہی ہو، خالی پیٹ ہوتا تو تارے نظر آتے ہوتے۔"

"ہوں ....." لومڑی بولی" خالی پیٹ ہو مری بلا، میں کوئی تمھاری طرح مورکھ ہوں، کہ جڑیں چبا کر پیٹ بھر لوں، میں تو اپنی چالاکی کی بدولت مزے اڑاتی ہوں اور کچھ نہیں تو کوئی مرغی چرغی پکڑ لائی۔ مزے سے کھائی اور پاؤں پھیلا کر سو گئی۔ تم اپنی قسمت کو روؤ کہ جسم تو پہاڑ جیسا مگر عقل ذرہ بھر بھی نہیں، عقل ہوتی تو تم بھی اس وقت مزے سے نہ ٹہلتے ہوتے۔"

اب تو ریچھ کو اور بھی تاؤ آ گیا۔ اس نے جڑ کو تو دیا پھینک، اور بولا، "یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ ہم میں عقل نہیں ہوتی، اگر ہم میں عقل نہ ہوتی تو آدمی یوں ہی ہم کو پکڑ لے جاتے، طرح طرح کے ناچ سکھاتے اور پھر ہمارا تماشا کر کے پیسہ کماتے اور اپنا پیٹ پالتے۔ بھلا تم نے بھی کسی لومڑی کو تماشا کرتے دیکھا یا سنا ہے۔ ایسی بڑی عقل والی ہوتیں تو آج جنگل میں ماری ماری کیوں پھرتیں۔"

"بھئی واہ واہ" لومڑی منہ چڑھا کر بولی، "یہ تو اور بے وقوفی ہے۔ بھلا محنت کوئی کرے اور مزے کوئی اڑائے بیچارے ریچھ دن بھر مداری کے ڈنڈے کے ڈر سے تماشے دکھاتے ہیں۔ خوب پیسے جمع کرتے ہیں۔ آٹا دال پاتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ مالک لے لیتا ہے اور انھیں شام کو موٹی جھوٹی روٹی دے کر بہلا دیتا ہے، اور خود مزے اڑاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں نہ کسی کی غلامی کرتے ہیں نہ کسی کے ڈنڈے کھاتے ہیں، جب ذرا اپنی عقل سے کام لیا، چالاکی دکھائی پیٹ بھر لیا۔"

"اچھا تو ہو جائے مقابلہ، کان پک گئے تمھاری شیخی کی باتیں سنتے سنتے۔" ریچھ بولا، "اچھا شرط بدتی ہو، دیکھیں تم چالاک نکلتی ہو کہ ہم، ہونھ — ذرا سی جان اور اتنی شیخی۔"

"ہاں ہاں ضرور ہو جائے مقابلہ" لومڑی بولی..... "بھلا ہم پیچھے ہٹنے والے

ہیں!"

"لیکن صاحب خالی مولی مقابلہ نہیں ہوگا کچھ شرط بدنی پڑے گی۔"

"ارے کیوں اترائی جاتی ہو...... بڑی بی"، ریچھ بولا۔ "ہار جاؤ گی، مفت میں نقصان اٹھاؤ گی۔"

"یہ جھکیے اور کسی کو دیجیے گا"۔ لومڑی نے جھنک کر کہا... "ہم تو بغیر شرط کے نہ مانیں گے، بولو اگر ہار گئے تو کیا دوگے"

"اچھا تو یہی سہی ...." ریچھ نے عاجز آکر کہا۔ "ہار گیا تو کیا دوں گا؟ (کچھ سوچ کر) اچھا چلو ایک مرغی!"

"مگر وہ ہے کہاں؟" لومڑی نے پوچھا "نہ بھائی بغیر پتہ نشان پوچھے نہ مانوں گی تم مکر گئے تو؟"

"دیکھو...." ریچھ بولا.... "وہ جو جنگل کے کنارے ایک کسان کی جھونپڑی ہے اس کے پاس بہت سی مرغیاں ہیں اگر تم جیت گئیں تو میں تمہیں اپنی پیٹھ پر بٹھاکر لے جاؤں گا اور جھونپڑی کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تم ایک مرغی پکڑ لینا۔ اور اگر میں جیتا تو تم کو ایک سیر شہد دینا ہوگا۔"

"چلو منظور..... پر دیکھو مکرنا نہیں۔"

"ہاں ہاں مکروں گا کیوں"، ریچھ بولا۔

"لیکن بی لومڑی مقابلہ یوں نہ ہوگا۔ ہم دونوں کو اپنی شکلیں بدلنی پڑیں گی نہ تم لومڑی رہو، نہ میں ریچھ دونوں اپنے اپنے بھیس بدل لیں، اور پھر ایک دوسرے کو چکمہ دیں، جو جیتے وہ انعام پائے۔"

"چلو یہ بھی مان لیا...." لومڑی نے کہا۔

یہ کہہ کر دونوں ایک جنگل میں چل پڑے ایک پچھم کو چلا ایک پورب کو ریچھ نے لومڑی کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ایک ڈراؤنے دیو کا بھیس بدلا۔ جی میں بہت خوش ہوا کہ آج بی لومڑی کو شیخی کا مزہ چکھاؤں گا۔ بھیس بدل کر جنگل میں ادھر ادھر لومڑی کی تلاش میں گھومنے لگا۔ جب تھوڑی دیر گزر گئی اور لومڑی کا کچھ پتہ نہ چلا تو پچھم کی طرف چل پڑا۔ لومڑی اسی طرف گئی تھی، چلتے چلتے ایک دریا کے پاس

پہنچا۔ دریا کے دونوں کناروں پر خوب ہرے بھرے پودے لگ رہے تھے۔ یہ منظر ریچھ کو بڑا سہانا لگا۔ وہ کنارے پر ہو لیا۔ تھوڑی دور آگے جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت ہی خوب صورت سی عورت کنارے پر بیٹھی پھولوں سے دل بہلا رہی ہے۔ ریچھ بڑے ادب سے عورت کی

"کہیے جناب بھالو صاحب، کون ...... چالاک نکلا، میں کہ آپ؟ اب جلدی سے مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھائیے اور لے چلیے کسان کی جھونپڑی کے پاس ..... بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"
بے چارا بھالو کھسیانا ہو گیا.... مگر

طرف بڑھا اور بولا "آپ نے ادھر سے لومڑی کو تو جاتے نہیں دیکھا؟"
"جی جاتے تو نہیں۔ ہاں بیٹھے دیکھا تھا ..... اور لیجیے میں ہی ہوں وہ لومڑی...." یہ کہہ کر اس نے اپنا لباس اتار پھینکا اور بولی

کیا کرتا شرط ہار گیا تھا.... مجبوراً لومڑی کو پیٹھ پر بٹھا کر کسان کی جھونپڑی تک لے گیا۔ بی لومڑی نے موقع پا کر ایک مرغی دبائی اور جنگل میں لا کر مزے سے چٹ کر گئیں۔

ہم دوسرے سے کوئی بات کہنا چاہتے ہیں یا اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو یا تو اشاروں سے کام لیتے ہیں، یا لفظوں سے۔ اشاروں کے ذریعے سے بہت کم باتیں پوچھی اور کہی جا سکتی ہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے ہم کسی شخص سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو اور وہ بتا سکتا ہے کہ میں اس طرف جا رہا ہوں۔ لیکن اگر یہ پوچھنا ہو کہ تم جمعے کو کہاں کہاں گئے تھے کون کون سی چیزیں دیکھی تھیں، کن کن لوگوں سے ملے تھے، کیا کیا باتیں ہوئی تھیں، تو ہم یہ سب نہ دوسرے کو اشاروں میں سمجھا سکتے ہیں اور نہ وہ اشاروں میں جواب دے سکتا ہے۔ اس لیے لفظوں کی ضرورت ہے جہاں کہیں لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ سب چیزوں کے اور خیالوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ جنھیں لفظ کہتے ہیں اور یہ سب لفظ مل کر زبان کہلاتے ہیں۔ سب ملکوں کی زبانیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زبان کئی ملکوں میں بولی جاتی ہے یا ایک ہی ملک کے لوگ کئی زبانیں بولتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں۔ مگر ایک زبان تھوڑے تھوڑے فرق سے ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہندوستانی کہلاتی ہے یہ زبان شمالی ہندوستان کی پرانی زبانوں سے نکلی ہے۔ اور اس میں تھوڑا سا میل فارسی، عربی، سنسکرت اور دوسری دیسی اور بدیسی زبانوں کا بھی ہے۔ اب سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے دکن میں اور پھر شمالی ہندوستان میں پڑھے لکھے ہندو مسلمان اس زبان میں کتابیں لکھنے لگے۔ انھوں نے اس کو بہت ترقی دی، اور آگے چل کر اس کا نام اُردو رکھا۔

ہماری زبان یہی اردو ہے۔ قریب قریب سارے ہندوستان میں مسلمان اور دکن اور شمالی ہند میں بہت سے ہندو اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔ اردو اور ہندوستانی میں یہ فرق ہے کہ اردو میں عربی فارسی کے لفظ زیادہ ہیں اور ہندوستانی میں کم۔ اردو صرف فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے اور ہندوستانی فارسی اور ناگری دونوں میں۔ اردو زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے، ہندوستانی کو ملک کے بہت بڑے حصے میں پڑھے، بے پڑھے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی اور سنسکرت کے میل سے ایک اور زبان بنی ہے۔ جو ہندی کہلاتی ہے اور ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔

ہماری اردو زبان کی عمر کوئی ساڑھے پانچ سو سال کی ہے۔ اتنے دنوں میں ہمارے ہندو مسلمان بزرگوں کی کوششوں سے یہ زبان ایشیا کی بڑی زبانوں میں گنی جانے لگی ہے۔ اس میں بڑے بڑے ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اور شعر اور ادب کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ علم اور فن کی تصنیفیں اور ترجمے اردو میں جاپانی کے سوا ایشیا کی کسی زبان سے کم نہیں۔ ہاں یورپ کی بڑی زبانوں کا مقابلہ ہماری زبان اب تک نہیں کر سکتی۔ اگر ہمیں اپنی

زبان پیاری ہے تو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ برابر ترقی کرتی رہے یہاں تک کہ دنیا کی کسی زبان سے پیچھے نہ رہے۔

شاید کوئی یہ پوچھے کہ ہم اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کیوں کریں اور کیسے کریں؟

کیوں کریں؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ زبان ہماری جان ہے، ہمارے جسم کی نہیں بلکہ ہمارے ذہن کی۔ اسی کے بل پر ہمارا ذہن جیتا ہے، اس کے پینے سے پنپتا ہے، اس کے کھلانے سے کھاتا ہے۔ ذہن کسے کہتے ہیں؟ وہ قوت جس سے ہم دنیا کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیا کو جاننا اور سمجھنا ایک آدمی کا کام نہیں۔ بہت سے آدمی مل کر دنیا کو دیکھتے ہیں۔ دیکھے ہوئے کو سوچتے ہیں اور اپنے خیالات ایک دوسرے کو بول کر یا لکھ کر بتاتے ہیں۔ اسی کے لیے لفظوں کی یعنی زبان کی ضرورت ہے۔ اگر کسی زبان میں کافی اور اچھے لفظ موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے اس کے بولنے والے اپنے خیالات ایک دوسرے پر ظاہر کریں تو ہر شخص کے خیالات اسی تک رہتے ہیں۔ نہ وہ اپنی کہہ سکتا ہے نہ دوسرے کی سُن سکتا ہے۔ اس کا علم بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی اولاد کو بھی نہیں پہنچتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تک زبان ترقی نہ کرے علم کیوں کر ترقی کر سکتا ہے!

جن لوگوں کی زبان سب زبانوں سے پیچھے ہوتی ہے۔ وہ علم وفن میں بھی سب سے پیچھے ہوتے ہیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر ہماری زبان علم سے خالی ہے تو ہم کوئی دوسری زبان سیکھ کر اس کے ذریعے سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ کچھ تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مثال ہندوستان میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان والے جن

کی زبانیں بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی کے ذریعے سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دوسری زبان کا سیکھنا اتنا مشکل ہوتا ہے کہ بہت تھوڑے لوگ سیکھ سکتے ہیں۔ جو سیکھتے بھی ہیں ان کا پڑھنے کا زمانہ اسی زبان کے سیکھنے میں گزر جاتا ہے۔ علم حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں رہتا اور پھر سارے جتن کرنے کے بعد بھی دوسری زبان اتنی نہیں آتی کہ آدمی اپنے دل کی ہر بات، اپنے ذہن کا ہر خیال اس میں اچھی طرح ادا کر سکے۔ دیکھو نا ہمارے دیس میں کئی لاکھ آدمیوں نے دس دس بیس بیس برس انگریزی سیکھی۔ کئی ہزار آدمی انگلستان میں رہ کر آئے مگر ان میں کتنے ہیں جو انگریزی میں شعر کہہ سکیں یا نثر میں اچھی اچھی کتابیں لکھ سکیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے بہت علم حاصل کیا ہے مگر ان کا علم گونگے کا خواب ہے کہ آپ ہی آپ اس کا مزہ لیتے

ہیں۔ اپنے بھائیوں کو کچھ نہیں بتا سکتے۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ انگریزی کی دھن میں انھوں نے اپنی زبان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ معمولی بات چیت کر لیتے ہیں۔ مگر جب کسی علمی مسئلے کی یا ملکی معاملے کی بحث ہو تو نہ زبان کھول سکتے ہیں نہ قلم اٹھا سکتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں یا لکھتے ہیں تو انگریزی میں جسے بس تھوڑے ہی سے آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں اچھے اچھے خیالات آتے ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ اپنے دیس کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو یہ باتیں سنائیں۔ مگر گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اگر کبھی گونگوں کی طرح کچھ آوازیں نکالتے بھی ہیں تو کوئی نہیں سمجھتا۔

ایک بات تو معلوم ہو گئی کہ اپنی زبان کو ترقی دینا بہت ضروری ہے۔ اب دوسری بات رہی کہ اسے ترقی کس طرح دی جائے؟ تو بھئی ہم سب

لوگوں کو جو مدرسے میں پڑھتے ہیں سب سے پہلے یہ کرنا چاہیے کہ اپنی زبان اچھی طرح سیکھیں۔ اردو کے گھنٹے میں اونگھنا یا کاپی پر اپنی یا اپنے دوستوں کی تصویریں بنانا چھوڑ دیں۔ بلکہ چوکس ہوکر سنیں کہ استاد کیا کہہ رہا ہے اور پڑھیں کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ گھر پر کرنے کو جو کام دیا جائے اسے پابندی سے اور محنت سے یہ سمجھ کر کریں کہ یہ زبان کا کام ہے جو ہماری جان ہے۔ اسی سے ہمارے اور ہماری قوم کے علم کی ترقی ہوگی اور علم کی ترقی میں قوم کی بھلائی ہے۔ اسی سے ہماری قوم دوسری قوموں کی برابری کرے گی۔ آزادی، دولت اور عزت حاصل کرے گی۔ مدرسے کی کتاب کے علاوہ ہمیں استاد سے اور اپنے بڑوں سے پوچھ کر اردو کی اچھی اچھی کتابیں پڑھنی چاہییں۔ بہت سی کتابیں تو ہمیں اپنے گھر میں یا مدرسے ہی کے کتب خانے میں مل جائیں گی، پھر رسالوں میں اخباروں میں...... کتب فروشوں کی فہرستوں میں بچوں کی کتابوں کے اشتہار نکلتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر ماں باپ سے ضد کرنی چاہیے کہ ہمیں فلاں کتاب منگا کر دو۔ ایسے بچے تو بہت ہیں جو اس کے لیے مچلتے ہیں کہ ہمیں مٹھائی منگادو، کپڑے بنا دو، تماشا دکھا دو۔ مگر ایسے بہت کم ہیں جو کتاب کے لیے مچلتے ہوں۔ یقین ہے کہ بہت سے ماں باپ ہمیں بڑی خوشی سے کتاب منگا کر دیں گے۔ وہ انکار کریں تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ان کے پاس پیسہ نہیں یا انھیں کتابوں کا شوق نہیں۔ اگر پیسہ نہیں تو صبر کرنا چاہیے اور کتب خانے سے یا دوستوں سے مانگ کر کتابیں پڑھنی چاہییں۔ اگر شوق نہیں تو ان کے پیچھے پڑ جانا چاہیے۔ کبھی نہ کبھی انھیں شوق پیدا

..... جائے گا۔

جب ہم اپنی زبان اچھی طرح سیکھ لیں گے تو پھر اور کام کرنے کا وقت آئے گا۔ پھر ہم اچھی اچھی کتابوں کا دوسری زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کریں گے۔ خود اچھے اچھے مضمون اور بڑی بڑی کتابیں لکھیں گے، دنیا کے ہر علم وفن کو اردو میں لے آئیں گے اور ایک دن بڑے فخر سے یہ کہیں گے کہ ہماری زبان دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہیں۔ وہ دن ہمارے لیے اور ہماری قوم کے لیے کیسی خوشی کا دن ہوگا!

گذارش

ہمیں افسوس ہے کہ بعض قانونی پابندیوں کے باعث ہم یہ شمارہ اپنی خواہش کے باوجود جولائی کے پہلے ہفتے میں پیش نہیں کر سکے۔ چونکہ جولائی کا مہینہ ختم ہو رہا ہے اس لیے ہم اس کی اشاعت اگست ۱۹۶۴ء کے شمارے سے شروع کر رہے ہیں۔

جن اصحاب نے جولائی سے خریداری شروع کی ہے ان کی مدّت خریداری اب اگست ۱۹۶۴ء سے شروع ہو کر جولائی ۱۹۶۵ء میں ختم ہوگی۔

(مینیجر)

جناب اخگر مشتاق
رحیم آبادی

برسات
(گیت)

اُٹھی ہیں گھٹائیں
چلتی ہیں ہوائیں
ہر بوند کی گت پر
گاتی ہیں فضائیں

کیسے ہیں انوکھے
کتنے ہیں نرالے
بادل کے اندھیرے
بجلی کے اُجالے

یہ دشت و بیاباں
انوار بداماں
سَو پھول کھلے ہیں
ہنستا ہے گلستاں

یہ شورِ بہاراں
یہ شوقِ فراواں
یہ بیل یہ بوٹے
یہ بزمِ چراغاں

یہ مینھ کی پھواریں
جھولوں کی بہاریں
باغوں کے کنارے
موروں کی قطاریں

زردار بھی خوش ہے
نادار بھی خوش ہے
مجبور بھی خوش ہے
مختار بھی خوش ہے

کہتی ہے ندی پھر
موجوں کی زبانی
میداں کا فسانہ
جنگل کی کہانی

یہ حُسن یہ حکمت
تصویرِ حقیقت
ہر چیز سے ظاہر
اللہ کی قدرت
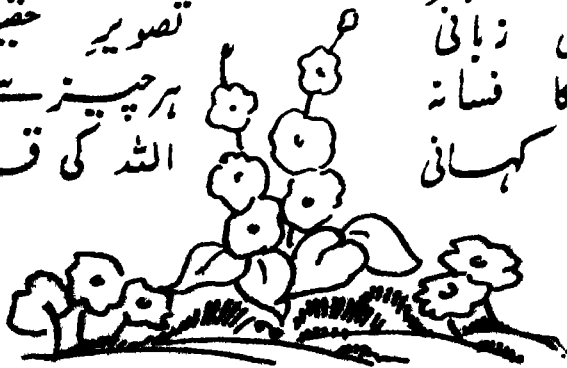
محمد حفیظ الدین صاحب ندوی جامعی
نائب معتمد انجمن ترقی اردو ہند

امتحان

بڑے آدمی کی ایک پہچان ہے۔ کسی بڑی سے بڑی اور اچانک بپتا کسی ناگہانی حادثے کے وقت وہ اپنے ہوش وحواس قائم رکھتا ہے۔ دل پہ چاہے جو کچھ بیت جائے، چہرے پہ اس کا اثر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ قدرت کی طرف سے یہ بڑی آزمایش ہے۔ بہت کڑا امتحان ہے پر اللہ کے اچھے اور سچے بندے اس آزمایش میں پورے اترتے ہیں۔

آیئے آج آپ کو ایک اچھے انسان ایک اچھے استاد کا آنکھوں دیکھا واقعہ سنائیں۔ یہ بات ان دنوں کی ہے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ (دلّی) میں تھی۔ دنیا کی دوسری بڑی جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، ہاں ہندوستان میں آزادی کی لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں چند سرپھرے جامعہ بنانے کے ٹھوس کام میں لگے ہوئے تھے، یہ لوگ ملک کی لڑائی سے بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے مگر جامعہ کے کام کو اسی قدر اہم قومی خدمت سمجھتے تھے۔ اس وقت ان کے کاموں کی قدر کرنے والے کم تھے شاباشی کم ملتی تھی حوصلہ افزائی کی جگہ ملامت زیادہ ہوتی تھی، یہ کام مرمر کے جیے جانے اور جیے جانے کا تھا۔ جامعہ پر بڑا کڑا وقت تھا۔ چار چار پانچ پانچ مہینے کی تنخواہیں ادا نہ ہوتی تھیں مگر جامعہ کے خادموں کی پیشانی پر بل نہ پڑتے تھے، کٹھن سے کٹھن موقعوں

[illegible] خوشی اپنے کاموں میں لگی رہتے ہر ایک کو یہ دُھن رہتی کہ اس کا کام بہتر سے بہتر ہو۔ اپنے کاموں کی لگن، دوسرے کے کاموں پر نکتہ چینی سے پرہیز، یہ جامعہ والوں کا عام شیوہ تھا۔

اس زمانے میں بھی جامعہ میں ابتدائی سے لے کر کالج تک تعلیم کا انتظام تھا مگر زور زیادہ ابتدائی تعلیم پر تھا بچہ سب کی توجہ کا مرکز تھا اسے ماں باپ اور استادوں کے ہاتھ میں خدا کی مقدس امانت سمجھا جاتا تھا۔ بچوں کو جسمانی سزا دینا جامعہ میں سخت جرم تھا۔ ان کی دلجوئی کرنا، ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنا، ان میں ولولہ اور امنگ اور کام کرنے کی لگن پیدا کرنا، ان کی تربیت وصحت کا خیال رکھنا یہ سب جامعہ والوں کے پیش نظر رہتا یہ وہ دور تھا جبکہ ملک کی عام درس گاہوں میں استاد کے ڈنڈے کو تعلیم وتربیت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے جامعہ کی تعلیم وتربیت کا یہ انداز ایک انوکھا انداز تھا۔

ابتدائی درجوں میں امتحان ہوتے تھے۔ ترقیاں دی جاتی تھیں۔ نتیجے بھی سنائے جاتے تھے مگر ان کا ڈھنگ سب سے الگ تھا۔ یہ خیال رہتا کہ بچوں کے نازک دلوں کو پاس اور فیل کے احساس سے ٹھیس نہ لگے، جامعہ کی ابتدائی تعلیم کے باوا آدم عبدالغفار مدھولی صاحب نے اس کے لیے ایک نرالا طریقہ نکالا تھا۔ نتیجہ سنانے کے لیے سالانہ جلسہ ہوتا۔ استاد اور طالب علم جمع ہوتے، شیخ الجامعہ خود صدارت فرماتے، ایک چھوٹی اور میٹھی تقریر بہت آسان اور سادہ زبان میں کرتے جسے ہر بچہ سمجھتا، بچے ان کی باتیں غور سے سنتے اپنی اور اپنے مدرسے کی تعریف شیخ الجامعہ کی زبانی سن کر کبھی کبھی تالی بھی بجانے لگتے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے استاد ٹوکتے کہ کہیں اپنی تعریف پر تالی بجاکر داد دینا اپنے

منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔ بعض سیانے بچے جھینپ کر چُپ ہو جاتے، بعضوں کی معصوم بے خبری اس نکتے کو سمجھ ہی نہ پاتی اور تالی بجانے کا شغل جاری رہتا۔

نتیجہ سنانے میں ایک نیا پن، ایک جدت اور برتی جاتی۔ جو بچہ جتنے مضمونوں میں پاس ہوتا اتنے ہی رنگ برنگی، چائے کی طشتری کے برابر بتاشے دیے جاتے۔ جسے یہ بتاشے مقررہ تعداد سے کم ملتے وہ گویا پاس نہ ہوتا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ یہ روایت کئی برسوں تک جاری رہی۔

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اس سال جلسہ ہمیشہ کی طرح پوری شان و شوکت کے ساتھ تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے ہال میں ہو رہا تھا، بتاشے بٹ رہے تھے۔ ننھے ننھے بچوں کا باری باری اٹھنا، صاف ستھرے کپڑوں میں تمیز کے ساتھ اپنا اپنا حصہ لے کر لوٹنا، بیچ بیچ میں تالیوں کا گونجنا، ایک عجیب سماں تھا۔ سب لوگ اس بھولے بھالے اور دلچسپ نظارے میں کھوئے ہوئے تھے۔

اتنے میں کسی نے آکر چپکے سے شیخ الجامعہ (صدرِ جلسہ) کے کان میں کوئی بات کہی۔ شیخ الجامعہ نے مڑ کر آپا جان (جرمن خاتون مس فلپسبورن) کی طرف دیکھا وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور خبر لانے والے کے ساتھ کچھ بیتابی کے انداز میں چلی گئیں۔ شیخ الجامعہ کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مگر ادا شناسوں نے تاڑ لیا کہ خبر کچھ اچھی نہیں، جلسہ جاری رہا، کچھ ہی دیر بعد آپا جان کا آدمی پھر آیا۔ اب کے کوئی اور دلخراش پیام لے کر آیا تھا، بس ایک ذرا کے ذرا شیخ الجامعہ کے چہرے پر اداسی چھائی پر جلد وہ سنبھل گئے، یہ کمال انہیں ہمیشہ سے حاصل رہا ہے۔ اچھے اچھے ان کی دل کی چوٹ کو محسوس نہیں کر سکتے۔

جلسہ جاری رہا۔ بھولے بچے اپنی کامیابی کا انعام بتاشوں کی شکل میں

لیتے رہے جب سب بچے اپنا انعام پاچکے تو اب شیخ الجامعہ کی تقریر کی باری تھی۔ اس مرتبہ انھوں نے چند لفظ کہہ کر جلسہ ختم کر دیا، بچے اس خلاف معمول اختصار کو سمجھ بھی نہ سکے۔ ہاں بڑے، تردد و حیرانی کے عالم میں تھے، شیخ الجامعہ ہال سے اٹھ کر سیدھے گھر کی طرف چلے۔ گھر قریب ہی تھا، منٹوں میں پہنچ گئے، وہاں ڈاکٹر انصاری اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ لوگ انتظامات میں مصروف تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ الجامعہ کی پانچ چھ سال کی بچی (ریحانہ) دوڑتے ہوئے کر صحن میں جا رہی تھی، ٹھوکر لگی، گر پڑی، بے ہوش ہوگئی۔ یہ پہلی اطلاع تھی جو جلسہ میں شیخ الجامعہ کے کانوں تک پہنچی۔ پھر آپا جان نے جاکر اطلاع بھیجی کہ یہ وقتی بے ہوشی نہیں ہے۔ بچی ہمیشہ کے لیے بے ہوش ہو چکی ہے اب باپ کی پیاری اور میٹھی آواز بھی اس نیند سے اسے جگا نہ سکے گی۔ یہ دوسری اطلاع تھی۔ ریحانہ بڑی خوب صورت، بڑی پیاری بچی تھی۔ بلبل ہزار داستان تھی۔ بات کرتی تھی تو منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

شیخ گھر سے وہ المناک منظر دیکھ کر نکلے جو خدا کسی باپ کو نہ دکھلائے، ان کے نورانی چہرے اور پلکوں پر چند موتی تو ڈھلکتے نظر آئے مگر اس تسلیم و رضا کے پیکر نے منھ سے اُف تک نہ کی یہ غم کسی بے حس باپ کا غم نہ تھا یہ اس باپ کا غم تھا جو راہ چلتے گندے اور خاک دھول میں اٹے بچے کو روتے نہ دیکھ سکتا تھا اور اپنے دودھ ایسے اجلے کپڑوں کی گود میں اٹھا لیتا اور اسے ہنسا کر ہی چھوڑتا۔

دوسروں کے آرام اور خوشی کے لیے اپنا سکھ تج دینا۔ اپنا دکھ آپ اٹھانا اور اس کی آنچ کی سینک بھی

دوسروں تک نہ پہنچنے دینا یہ ان کے کردار کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اس وقت وہ عمر کی چھ دہائیاں پوری کر چکے ہیں، ساتویں دہائی میں چل رہے ہیں۔ ان چھ دہائیوں کی زندگی میں نہ جانے ایسے کتنے واقعات سوئے پڑے ہیں۔ دنیا کو ان کی خبر تک نہیں۔

اکثر پڑھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ شیخ الجامعہ کون ہیں؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ پھر بہار کے گورنر اور اب جمہوریہ ہند کے نائب صدر ذاکر صاحب ہیں۔ انھیں قریب سے جاننے والوں کے نزدیک ان کی انسانیت کا مقام بہت بلند ہے، اتنا بلند ہے کہ دنیا کی کوئی کرسی ان کے لیے اونچی نہیں۔

عقل کے کولھو دو دو نوکر

دوڑو جلدی ٹوپ اڑا ہے

دیکھو پہلے لائے کون   ٹوپ ملا آدھی کم پون

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی بی اے جامعہ

بھارت درشن

ہمارا دیس ہندوستان دنیا کے بہت ہی پرانے دیسوں میں ہے۔ یہ ہمیشہ سے تہذیب تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں بہت سے دھرموں نے، بہت سے مذہبوں نے جنم لیا، اور بہت سی قوموں نے اپنے کارناموں سے اس کا سر دنیا میں اونچا کیا ہے۔ یہ قومیں تو اپنا اپنا کام انجام دے کر آگے بڑھ گئیں لیکن ان کی بنوائی ہوئی یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ یہ یادگاریں اتر میں کشمیر سے لے کر دکھن میں راس کماری تک اور پورب میں آسام و بہار سے لے کر پچھم میں گجرات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جتنا بڑا ہمارا دیس ہے اتنی ہی زیادہ یہ یادگاریں بھی ہیں۔ ان میں مندر بھی ہیں، مسجدیں بھی ہیں، گرجے بھی ہیں، گردوارے بھی ہیں، سمادھیاں بھی ہیں، محل بھی ہیں قلعے بھی ہیں، مینار بھی ہیں، دروازے بھی، باغ بھی ہیں، تالاب بھی ہیں، مدرسے بھی ہیں اور پاٹھ شالے بھی ہیں۔ غرض طرح طرح کی اور نرالی شان کی عمارتیں ہیں۔ جس طرح سے ایک باغ میں طرح طرح کے اور قسم قسم کے پھولوں سے اس کی خوب صورتی بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح ہماری ان یادگاروں سے ہمارے دیس کی شوبھا کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ یہ یادگاریں ہماری تہذیبی دولت ہیں۔ ہم ان پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ ان کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ یہ ہماری قومی میراث ہیں۔

ہمارا یہ تہذیبی سلسلہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے موہنجوداڑو اور ہڑپا کے شہروں سے شروع ہوتا ہے۔ (یہ دونوں مقام اب مغربی پاکستان میں ہیں) ان شہروں کو دراوڑوں نے آباد کیا تھا، ان میں چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں، مضبوط مسالے اور پکی اینٹوں کے بنے ہوئے بعض مکان دو دو منزلوں کے تھے۔ ان میں گندے پانی کی نکاسی کا انتظام بھی رکھا گیا تھا۔ ابھی کچھ سال ہوئے ان شہروں کو زمین سے کھود کر نکالا گیا ہے۔

دراوڑوں کے بعد آریوں نے ہمارے دیس کو اپنا گھر بنایا لیکن انھیں لڑنے بھڑنے اور پڑھنے لکھنے سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ شہر بسانے اور عمارتیں بنانے کی طرف دھیان دیتے یہ کام بدھ مت کے ماننے والوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اشوک کے دادا چندرگپت موریا نے مگدھ راج کی نیو رکھی تو پاٹلی پتر کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اسی زمانہ میں ہمارے ملک میں ایک یونانی سفیر میگاس تھینز پاٹلی پتر آیا۔ اس کا کہنا ہے کہ راجہ کا محل اور لوگوں کے گھر لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ خود شہر کے چاروں طرف جو فصیل تھی وہ بھی لکڑی کی تھی۔

ہمارے ملک میں پتھر کی عمارتیں بنانے کا رواج اشوک کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس نے بدھ مت کے پرچار کے لیے پورے دیس میں جگہ جگہ پتھر کی لاٹھیں گڑوا دیں ان میں سے بعض بعض لاٹھیں چالیس پچاس فٹ تک اونچی ہیں۔ ان لاٹھوں میں کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ ایک ڈال پتھر کی بنی ہوئی ہیں ان کے اوپر کہیں شیر کی مورت ہے تو کہیں بیل کی۔ آج کل ہمارے دیس کا جو قومی نشان ہے وہ اشوک کی لاٹ کا اوپری حصہ ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ہمارے ملک میں پہلے پہل غار تراشے اور ان کے اندر بدھ کی مورتیاں بنانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ لیکن لکڑی کے کام کا اس زمانہ میں ایسا رواج تھا کہ خود غار کی چھت کو بھی اس طرح تراشا گیا ہے کہ اس پر بانسوں کے

ٹھٹھر کا گمان ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں مہاتما بدھ کی ہڈیوں یا دانت کو دفنانے کے لیے استوپ بھی بنائے گئے۔ ان استوپوں کی شکل گول ہوتی ہے ان کے چاروں طرف پتھر کے کٹہرے اور دروازے بھی بنائے گئے۔ سانچی کا استوپ اور اس کے دروازے اپنی سنگ تراشی کے لیے مشہور ہیں۔

پہاڑوں میں غار تراشنے کا رواج شاید ہمارے ملک میں ایرانیوں کے اثر سے شروع ہوا لیکن بہت جلد ہی گیت راج میں ہمارے بزرگوں نے ان غاروں کو تراشنے اور ان کو اندر سے بنانے سنوارنے کے کام میں مہارت پیدا کرلی۔ ان غاروں میں اجنتا ایلورا، کارلی اور ایلی فنٹا کے غار بہت مشہور ہیں۔ ان غاروں کی سنگ تراشی اور نقاشی کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غاروں کو تراشنے اور مورتیاں بنانے کا پورا کام صرف چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے کیا گیا ہے تو یہ تعجب اور بڑھ جاتا ہے۔

غاروں کو تراشتے تراشتے جب خاصا تجربہ حاصل ہوگیا تو ہمارے بزرگوں نے کھلے میدان میں مندر بنانے شروع کیے۔ ان میں سے مدراس کے قریب مہابلی پورم کا مندر (یہ ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے) اور بھوبنیشور، کونارک، کھجراہو، آبو، ہالی، کانجی ورم، اور تنجور کے مندر بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض مندر دو سو فٹ اونچے ہیں اور ان پر جو مورتیاں بنائی گئی ہیں وہ بہت خوب صورت ہیں۔ شکل کے لحاظ سے بعض مندر لمبوترے ہیں بعض اہرامی ہیں اور بعض رتھ کی وضع پر بنائے گئے ہیں۔ آبو کا جینی مندر پورا کا پورا سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اور اس پر سنگ تراشی کے جو کمالات دکھائے گئے ہیں وہ فن کے بہترین نمونے ہیں۔

بچّوں کی کوشش

جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کی چند باتیں بہت اہم ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے ہندوستان ہی میں نہیں، ہندوستان سے باہر بھی اسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بچے میں جو ذہنی صلاحیتیں ہیں انھیں ابھارنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس کے لیے بڑے دلچسپ بہت انوکھے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خاص خاص موقعوں پر بچیوں اور بچوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ فلاں فلاں موضوع پر شعر لکھ کر لاؤ۔ اب جس بچے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے وہ شعر کہہ لاتا ہے۔ ہمارے سب سے پرانے ساتھی احمد علی صاحب آزاد کو اس معاملے میں خاص طور پر دلچسپی ہے۔ انہی کی نوازش سے بچوں کی کوششوں کے یہ دلچسپ نمونے ہمیں ملے ہیں۔ (ایڈیٹر)

برسات

مصرعہ طرح :- آسماں پر ابرِ رحمت چھا گیا

جولائی اور اگست گرمی اور برسات کے ملے جلے مہینے ہیں۔ کالے کالے بادل آتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے۔ دیکھیے آپ کے ساتھی اس سے کیا اثر لیتے ہیں۔

آسماں پر ابرِ رحمت چھا گیا — اس کی رحمت کا سماں دکھلا گیا — فردوس

دوستو! بارش کا موسم آ گیا — شوق پکنک کا دلوں پر چھا گیا — سلمیٰ

ہر طرف کالی گھٹائیں چھا گئیں — دل پہ اک مستی کا عالم چھا گیا — صہبا

کالے بادل آسماں پر چھائے تھے	کوندی بجلی دل مرا تھرا گیا	نکہت
پے بہ پے بارش سے حالت یہ ہوئی	ہر طرف دریا میں طوفاں آگیا	شبیر
ہر طرف سبزہ نظر آنے لگا	آنکھ کی راحت کا ساماں آگیا	عامر
کالے کالے بادلوں کو دیکھ کر	پھر لبوں پر "چل کبڈی" آگیا	شفیق
آج بادل خوب برسے ہر طرف	چھت کا پانی گھر کے اندر آگیا	"
بچّہ بچّہ خوش نظر آنے لگا	دل پہ پکنک کا تصور چھا گیا	رُمان

پکنک

برسات اور پکنک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ برسات کے آتے ہی لوگ پکنک کے لیے جاتے ہیں۔ اس مدرسہ کی ہر جماعت کا علیحدہ علیحدہ پروگرام بنتا ہے، بڑی تیاریاں ہوتی ہیں۔ بچوں کے اشعار میں اس کی پوری جھلک موجود ہے۔

مصرعہ طرح : پھر وہی پکنک کا موسم آگیا

آسماں پر ابرِ رحمت چھا گیا	پھر وہی پکنک کا موسم آگیا	رعنا امین
ابرِ رحمت آسماں پر چھا گیا	مہرِ عالم تاب بھی شرما گیا	ابرار احمد
دوستو لو ابرِ باراں آگیا	اور پکنک کا زمانہ آگیا	زیتون بیگم
لیجیے اک شور برپا ہوگیا	لطف پکنک کا لبوں پر آگیا	ابرار احمد
سب نے مل کر ماسٹر جی سے کہا	دل پہ پکنک کا تصوّر چھا گیا	"
مینو کھانے پینے کا بنتا رہا	لیجیے سامانِ پکنک آگیا	عفت زہرہ
کر لیا پھر ناشتے کا اہتمام	برفیاں کیلے سموسہ آگیا	ریاض احمد
ہم نے لاری بک کرائی شام تک	صبح دم لاری ڈرائیور آگیا	نسیم علیم

محمد امین صاحب ایم اے علیگ
استاد مدرسۂ ثانوی جامعہ

جاپان کا زلزلہ

کہتے ہیں جاپان زلزلوں کا گھر ہے۔ یہاں آئے دن زلزلے آتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اوسطاً ایک دن میں تین زلزلے آتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی زلزلے کے یہ جھٹکے اتنے شدید، اتنے ہیبت ناک ہوتے ہیں کہ شہر کے شہر تباہ ہو جاتے ہیں۔
ابھی پچھلے مہینے کے اخباروں میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ ۱۶ر جون ۱۹۶۴ء کو جاپان کے سب سے بڑے جزیرے ہانشو کے شمالی حصے میں بڑے زور کا زلزلہ آیا اور نگاتا شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ نگاتا ٹوکیو سے ۱۶۰ میل شمال مغرب میں جاپانی سمندر کے کنارے آباد ہے۔ اس کی آبادی تین لاکھ ہے۔ یک بیک زلزلہ آنے کی وجہ سے اس کی سینکڑوں عمارتیں زمین کے برابر ہوگئیں۔ پٹرول کے ذخیروں میں آگ لگ گئی۔ پٹرول صاف کرنے کے تین کارخانے اور چالیس سے زیادہ ٹینک (جن میں پٹرول کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا) آگ کی نذر ہوگئے سارے شہر پر دھواں چھایا ہوا تھا اور آمد و رفت کے تمام ذریعے منقطع ہوگئے تھے۔ اندازہ ہے کہ نگاتا شہر کا ایک تہائی حصہ بالکل برباد ہوگیا ہے۔ لوگ شہر کے باہر میدانوں میں اور ساحل پر پڑے ہوئے ہیں۔

جاپان میں سب سے خطرناک زلزلہ ۱۹۲۳ء میں آیا تھا۔ اس زلزلہ نے چالیس ہزار انسانوں کی جانیں لی تھیں۔ لیکن اس کے بعد جاپان میں نسبتاً سکون رہا۔ اب چالیس سال کے بعد یہ دوسرا خطرناک زلزلہ آیا ہے۔ یہ بھی بڑا طاقت ور اور بھیانک تھا۔ ۱۹۲۳ء کے زلزلہ سے اس کی طاقت صرف دو اعشاریہ کم تھی یعنی ۱۹۲۳ء کے زلزلہ کی طاقت ۹ر۷ تھی اور اس کی ۷ر۷ تھی۔

خوش قسمتی سے زلزلے کا مرکزی نقطہ (ایپی سنٹر) شہر کے اندر نہیں تھا بلکہ سمندر میں ۴۵ میل کے فاصلے پر تھا ورنہ تین لاکھ کی ساری آبادی جل کر راکھ ہوگئی ہوتی۔

ہیروشیما میں زلزلہ کا ریکارڈ کرنے کی جو مشین یا سسموگراف ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ زلزلہ انتہائی خطرناک تھا۔ ہیروشیما پر امریکا نے پچھلی جنگ عظیم کے زمانے میں جو ایٹم بم گرایا تھا اس کی طاقت کے مقابلہ میں موجودہ زلزلہ پانچ سو ایٹم بموں کی طاقت کے برابر تھا۔

زلزلے کے ساتھ ساتھ ایک دوسری مصیبت بھی آتی ہے۔ سمندر میں بڑی بڑی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ لہریں پوری طاقت کے ساتھ ساحل سے ٹکراتی ہیں اور سمندر کا پانی شہر میں گھس جاتا ہے۔ نگاتا میں بھی یہی ہوا ہے اور اس لیے وہاں دہشت اور ہراس پھیلا ہوا ہے۔

زلزلے کی خبر سنتے ہی دوسرے دن جاپان کی فوج کا حفاظتی دستہ ساز و سامان سمیت نگاتا پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جو بیس گھنٹے گذر چکے تھے، پر وہاں ابھی تک آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ پٹرول اور گسولین کے ٹینک جل رہے تھے۔ حفاظتی دستے نے فوراً آگ پر قابو پانے کی جد و جہد شروع کردی۔ ادھر امریکا کی ہوائی فوج کے ہوابازوں نے آگ پر قابو پانے کے لیے

کیمیائی جھاگ اور آگ بجھانے کے کچھ
خاص مسالے گرائے۔ باوجود اس کے
۲۳ جون کی خبر کے مطابق ابھی تک
وہاں کے ایک ٹینک میں آگ لگی
ہوئی تھی اور لوگ پریشان تھے۔

اس زلزلے کی بدولت ۲۵ آدمیوں
کی جانیں تلف ہوئیں اور ۳۷۷ آدمی
زخمی ہوئے ہیں۔ ۳۵۰ مکان جل کر
راکھ ہوگئے اور ۱۹,۷۶۹ مکانات
گر گئے ہیں۔ اس طرح ۹۴'۳۷۴
آدمی بے گھر ہوگئے ہیں۔ نگاتا کے
علاوہ دوسری جگہوں میں بھی پانچ ہزار
مکان گر گئے ہیں اور ۲۵ ہزار مرد،
عورتیں اور بچے بے گھر ہوگئے ہیں۔

ہمارے صدر محترم جناب ڈاکٹر
رادھا کرشنن نے جاپان کے شہنشاہ
ہیرو ہیٹو کے نام پیغام بھیجتے ہوئے فرمایا
ہے کہ نگاتا میں زور کا بھونچال آنے
کی وجہ سے وہاں جان و مال کا بھی
نقصان ہوا ہے اس سے ہمیں دلی ہمدردی
ہے دنیا کے اور ملکوں کے سربراہوں نے
بھی اسی طرح ہمدردی کے پیغامات
بھیجے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ جاپان ہی میں
ایسے خطرناک زلزلے کیوں آتے ہیں
اور یہ آئے دن کی مصیبت کیا ہے؟
اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ جاپان
کا ملک ایشیا کے مشرقی ساحل پر
واقع ہے اور اپنے محل وقوع کی وجہ
سے وہ دنیا کے اس خطے میں آتا ہے
جو دنیا کا کمزور یا زلزلہ آنے کا خطہ
کہلاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جاپان کے ساحل
کے قریب بحرالکاہل بہت گہرا ہے یعنی
۳۵ ہزار فٹ (۶½ میل)۔ اس طرح
جاپان کے ساحل پر زمین کی اندرونی
اور بیرونی پرتیں دونوں آپس میں
براہ راست ملی ہوئی ہیں۔ اس لیے
اندرونی پرت پر ہلکی سے ہلکی جنبش کا
اثر بھی جاپان پر پڑے بغیر نہیں رہ
سکتا اور جب ایسا ہوتا ہے تو زلزلہ
آجاتا ہے۔ جاپان کے بعض حصوں میں

...ضا شمال میں اور آس پاس کے
...قوں میں آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں
...بھی خاموش اور ٹھنڈے رہتے
...، اور کبھی پھٹ پڑتے ہیں۔ اس
...ح بھی زلزلہ آجاتا ہے۔

خیال یہ ہے کہ نگاتا کا زلزلہ آتشی
مادہ پھٹنے سے آیا تھا لیکن خوش قسمتی
سے یہ مادہ سمندر میں پھٹا تھا اس
لیے بے پناہ تباہی سے یہ شہر بال
بال بچ گیا۔

آپ کا کام

یہ ہے کہ پیام تعلیم کو شروع سے آخر تک پڑھیے۔ جو چیز آپ چاہتے ہیں اور اس میں نہ پائیں اس کے متعلق ہمیں لکھیے۔ ہم آپ کے ہر مشورے پر غور کریں گے۔ اور اس کی روشنی میں پیام تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید اور زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

پیام تعلیم کا تعارف اپنے احباب سے کرائیے۔ ایسے دوستوں کے پتے ہمیں لکھیے جنھیں آپ سمجھتے ہیں کہ پیام تعلیم سے دلچسپی ہوگی۔ ہم نمونہ کے طور پر پرچہ ان کو بھیجیں گے۔

پیام تعلیم کے خریدار بنا کر اس کی توسیع اشاعت میں اضافہ کیجیے، اور پرچے کو زیادہ معلوماتی اور زیادہ کار آمد بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

(منیجر)

سید محمد ٹونکی، ایم اے، بی ٹی

اب سے سیکڑوں برس پہلے نہ ریل گاڑیاں تھیں نہ ہوائی جہاز۔ لوگ سفر بہت کم کرتے تھے۔ کیونکہ چھوٹا سفر کئی دن میں اور بڑا ہفتوں مہینوں میں ختم ہوتا تھا۔ اس لیے جب پردیس سے وطن آتے تو بڑی خوشی ہوتی۔ پردیس کی اچھی اور مشہور چیزیں دوستوں رشتہ داروں کے لیے لاتے ادھر بستی کے باہر آنے والوں کا استقبال ہوتا۔ گلے ملتے خوشیاں مناتے کہ خیریت سے واپس آئے اور سوغاتیں لائے۔

سیکڑوں برس میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ خشکی پر جگہ جگہ ریلیں ہیں۔ سمندر میں تیز چلنے والے بڑے جہاز ہیں۔ جن میں تفریح کے لیے کھلی جگہ ہے۔ پڑھنے کے لیے بڑے کمرے ہیں۔ جن میں خوب صورت رسالے اور اخبار رکھے ہیں۔ چھوٹا سا اسپتال۔ غرض پوری بستی کی ضروریات کا سامان ہے۔ ہوا میں اڑنے والے جہاز تو برسوں کا سفر دنوں میں پورا کراتے ہیں۔ ہندوستان سے اڑے ہی تھے کہ پتہ لگا پاکستان سے گزر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ افغانستان آگیا۔ اس طرح سفر اب وہ سفر نہیں رہا لیکن سوغات اب بھی لائی جاتی ہے اور رہتی دنیا تک لائی جائے گی۔

یہ کتنی بڑی نعمت ہے جس نے
قوموں اور ملکوں کو ایک دوسرے سے
قریب کر دیا ہے۔ اتنا قریب کہ اب
دنیا کے ملک اور ان کے باشندے
ایک دوسرے سے ملنے سیکھنے اور
سکھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک
ملک کے عالم۔ ڈاکٹر۔ انجینیر۔ استاد۔
طالب علم۔ فن کار۔ تاجر دوسرے
ملکوں میں بلائے جاتے ہیں۔ جو اپنے
ملک کی اچھی باتوں چیزوں کو
دوسرے ملکوں تک پھیلاتے ہیں۔
اور ان ملکوں کی اچھی چیزوں باتوں
کو اپنے ملک تک۔

ایسے ہی تعلقات قائم کرنے
کے لیے ہندوستان کے استادوں
کی فیڈریشن کو روس کے استادوں
کی یونین نے دعوت دی۔ ۱۹۵۹ء
میں ہندوستانی فیڈریشن کے وفد
کے ساتھ میں بھی گیا۔ سب سے پہلے
ہم لوگ تاشقند اترے۔ شہر کی
سیر کی۔ علی شیر نوائے تھیٹر دیکھا۔
اجتماعی کھیتوں میں کام کرنے والوں سے
ملے، دن ختم ہوگیا۔

دوسرے دن بچوں کے پارک میں
گئے جہاں شام کے وقت سیکڑوں
بچے کھیلتے کودتے۔ ناچتے گاتے۔ دوڑتے
جھولا جھولتے نظر آتے ہیں۔ ہم لوگوں
کو شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ
پہنے دیکھ کر بچوں نے گھیر لیا۔ ہجوم
گیا۔ ہم میں سے کسی نے ان کو
ہندوستانی ٹکٹ دیئے۔ کسی نے
تصویروں کے کارڈ۔ کسی نے سکّے۔
بچے خوش ہو گئے۔ "آدریس (پتہ)
متیری (دوستی)" کی آواز ہر طرف
سے آئی۔ ہم نے پتہ لکھ کر دیا۔
جب کاغذ نہ رہا تو بچے کاغذ لائے
اور پتہ لکھوایا۔ چھوٹے بچوں میں
گھرنا۔ ان کے بھولے اشارے پیاری
باتیں۔ ہم سب گرمالے اور خوب گرمائے۔

ہم نے ہر شہر میں دو ایک اسکول
دیکھے۔ استادوں سے باتیں کیں۔

استادوں کی انجمن میں گئے ملے جلے۔ دیکھا بھالا پاپونیرز پیلیس بھی گئے، جہاں فرصت کے وقت بچے وہ کام کرتے ہیں جن میں ان کا دل لگتا ہے، مثلاً تصویریں یا ماڈل بنانا کتابیں پڑھنا۔ سائنس کا تجربہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھیں گیت سُنے جو ہندوستانی تھے۔ خوشی ہوئی کہ ہندوستانی گیت ان کو پسند آئے اور خیال آیا کہ ہمارے بچوں کو بھی دوسرے ملکوں کے گیت سیکھنے اور گانے چاہئیں تاکہ میل جول بڑھے۔

ہم استادوں کے مہمان تھے۔ زیادہ وقت ان سے ملنے جلنے بات چیت کرنے میں لگا۔ ہر شہر میں استادوں کی یونین میں تقریریں ہوئیں۔ دوستی پیدا کرنے کے جذبے کو سراہا۔ جام صحت پیے۔ تحفے دیئے اور لئے گئے۔ بچوں سے تو کہیں کہیں پارک یا پاپونیرز پیلیس میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ملنا ہوا جہاں سیکڑوں بچے ہوتے اس لئے کسی بچہ سے پانچ منٹ سے زیادہ کی ملاقات نہ ہو سکی۔

تین چار ہفتے گھوم پھر کر۔ مل ملاکر جب واپس ہونے لگے تو آپس میں باتیں کیں۔ ان استادوں کا ذکر کیا۔ جن کی بات چیت ملنے ملانے۔ ہنسی مذاق نے دل پر اثر کیا تھا۔ ہم لوگوں کو خیال تھا کہ اور سوغاتوں کے علاوہ استادوں کی دوستی بڑی سوغات ہے۔ بچوں کی محبت کو تو وقتی چیز سمجھا تھا۔ وہم گمان بھی نہ تھا کہ ان سے رشتہ ہو جائے گا۔

میں گھر پہنچا تو سب خوش تھے۔ خوشی کا اظہار کم ہوا تو مجھے دو خط دیئے گئے جو میرے آنے سے ایک ہفتہ پہلے آگئے تھے۔ مجھے خیال ہوا استادوں کے ہوں گے۔ سفر کی تھکن دور ہوئی تو روسی زبان جاننے والے کی جستجو کی۔ تلاش سے پتہ لگا۔ خط پڑھوائے۔ معلوم ہوا تاشقند سے آئے ہیں۔ اسکول میں پڑھنے والی بچیوں کے ہیں جو ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

مجھے خوشی ہوئی کہ سفر کامیاب رہا۔ خطوں کا جواب دیا۔ چونکہ میں ساٹھویں سال میں تھا اور لکھنے والی اسکول کی بچیاں اس لئے میں نے "پیاری بیٹی" سے خط شروع کئے۔ ڈالتے تو ڈال دئے مگر خیال ہوا کہ اجنبی لڑکیاں ہیں جن سے یونہی سی ملاقات ہوئی تھی۔ کہیں وہ یا ان کے والدین برا نہ مانیں کہ رشتہ داری کیسی؟ دوسرے مہینہ جواب ملے۔ ایک خط میں لکھا تھا: "مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان میں میرے والد ہیں۔"

ان پیاری بیٹیوں سے خط کتابت چلتی رہی۔ دل کی بیماری ہوئی۔ مہینوں انھیں خط نہ لکھ سکا۔ جب سنبھلا تو خط لکھا اور دیر کی وجہ بتائی جواب میں دونوں نے لکھا "بابا اگر میں ہندوستان میں ہوتی تو آپ کے پلنگ سے لگی بیٹھی رہتی"۔ پڑھنا تھا کہ آنکھ بند ہو گئی۔ محسوس ہوا کہ دونو کے ہاتھ میری پیشانی پر ہیں۔ ٹھنڈک پہنچی سکون سا سکون ملا۔ کیسے کھلے ہوئے، خوش رنگ۔ مست بو والے پھول جن کی رنگینی اور مہک نے ہزاروں میل دور ہوتے ہوئے بھی مجھے مدہوش کر دیا۔

لیجئے یہ دونوں خط آپ بھی پڑھ لیجئے:

تابندہ اُزبکستان سے سلام

باوا آپ کی بیٹی رانو یہ خط آپ کو لکھ رہی ہے۔ آپ کیسے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ آپ معاف کریں۔ میں نے آپ کو بہت دنوں میں خط لکھا۔ میں امتحان میں مصروف تھی۔ مجھے بہت سے مضمونوں میں بہت اچھے اور چار میں اچھے نمبر ملے۔ آپ کو خوشی ہوگی کہ میری اسکول کی تعلیم پوری ہوگئی۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ میرے بھائی ملازم ہوگئے اور میری بہن بھی آخری امتحان دے رہی ہیں۔ آپ ان کے نتیجے سے مجھے ضرور اطلاع دیں۔

کچھ دن ہوئے تاشقند میں ہندوستانی فلمیں دکھائی گئی تھیں مجھے وہ فلمیں اور گیت بہت پسند آئے۔ میں جب بھی آپ کا یا ہندوستان کا خیال کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں اور ہندوستان میں گھوم رہی ہوں۔ ایک نہ ایک دن تو ہم ضرور ملیں گے۔

گرمی کا موسم ہے۔ سبزیوں اور پھلوں کا زمانہ ہے۔ جی چاہتا ہے آپ بھی ہوتے اور ہم سب ساتھ بیٹھ کر رسیلے پھل کھاتے۔ آپ کی صحت کی متمنی آپ کو پیار کرنے والی آپ کی بیٹی رایا (عبدالرحمانا وٗ رایا)

روشن اُزبکستان سے سلام

پیارے پاپا، فاپا۔ نِرمی سلطان چک کی طرف سے دلی سلام۔

ہم سب اچھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ بالکل تندرست ہوں۔ آپ کا خط ملا۔ جواب لکھنے بیٹھی تو بہت خوش تھی جی چاہتا تھا کہ خوشی میں گاؤں سلطان چک (بچہ) کتنا خوش قسمت ہے کہ بچپن ہی سے نئی نئی چیزیں دیکھ رہا ہے۔ تعجب نہیں کہ بڑا ہوکر وہ ان چیزوں کو خوب سمجھے اور استعمال کرے۔

۷ نومبر کو قومی تہوار ہوتا ہے۔ ۶ نومبر کو اپنے شوہر (تومی) کے ساتھ کپاس توڑنے اجتماعی کھیت میں گئی۔ میرے شوہر نے بہت اچھا کام کیا۔ وہاں سے ہم والدہ کے پاس گئے۔ وہ اپنے نواسے سے کھیلتی رہیں۔ گھر آئے تو خوش خبری ملی۔ رایا نے کھلونے۔ البم اور مٹھائی دی۔ میرے دل پر اتنا اثر ہوا کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آپ کی پدرانہ شفقت اور البم نے دل کی جو کیفیت کی اس کو بیان نہیں کرسکتی۔ جس دن سلطان چک کو کھلونے ملے وہ ایک سال، تین مہینے کا تھا۔ اتنے نئے کھلونے دیکھ کر خوشی سے لوٹنے لگا۔ اس نے آپ کے دونوں رخساروں کو بوسے

دے۔ فقط

آپ کی بیٹی فایا (مقدونوواؤ)

جب بھی خط ملتا ہے یا خیال آتا ہے معلوم ہوتا ہے اپنے بچوں میں بیٹھا کھیل رہا ہوں۔ بیٹیاں ہی نہیں۔ نواسہ بھی ہے اور جب کوئی بچہ ملتا ہے تو سمجھتا ہوں کہ یہ انسان کا بچہ ہے۔ اس کے دل میں رایا۔ فایا جیسی بھولی اور پاک محبت امنڈ رہی ہے۔ یہ تو میرا ہی بچہ ہے۔

سوغات اور کیسی سوغات!

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جامعی
استاد جامعہ کالج

دو فقیر گورنر

آپ نے گورنروں اور حاکموں کے قصے تو بہت سُنے ہوں گے آیئے آج آپ کو دو ایک ایسے حاکموں کے قصے سنائیں جو امیر تھے پر فقیروں کی طرح رہتے تھے۔

حضرت عمرؓ کو تو آپ جانتے ہی ہیں کیسی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ کھانے میں مزا ڈھونڈھتے تھے نہ پہننے میں بھڑک چمک کی تلاش تھی۔ نہ رہنے سہنے میں ٹھاٹ باٹ کی فکر تھی۔ روکھا سوکھا جو کچھ ملا کھا لیا۔ پھٹا پرانا جو پایا پہن لیا۔ جہاں جگہ ملی سو رہے۔ بس ہر وقت اللہ ہی کا دھیان اور اسی کے کام کی لگن!!

حضرت عمرؓ کے مزاج کا اثر ان کے ماتحتوں پر بھی پڑا تھا۔ صوبوں کے گورنر ہوں یا فوجوں کے سردار سب اسی رنگ میں رنگ گئے تھے کسی کو اپنے آرام کا خیال نہ تھا بلکہ سب کے دل کو یہ لگی تھی کہ کسی طرح اسلام کا بول بالا ہو، اور اللہ کے دین کا ڈنکا گھر گھر بجنے لگے۔

جب روم والوں سے لڑائی ہو رہی تھی تو ایک دن مسلمانوں کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کے لئے رومی سردار نے ایک آدمی بھیجا کہ چھپ کر مسلمانوں کے لشکر میں جائے

اور وہاں کے حالات معلوم کر کے لوٹ آئے۔

یہ شخص بھیس بدل کر مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا اور گھوم پھر کر اچھی طرح ان کی حالت دیکھی وہ تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ یہاں بھی رومیوں کی طرح بڑے ٹھاٹ سے زندگی بسر ہوتی ہوگی اور فوج کے سردار دنیا کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ پر یہاں تو بڑے بڑے سردار نوکروں چاکروں سے بھی زیادہ معمولی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ سیدھا اپنی فوج میں واپس آیا اور سردار سے کہا کہ "ہم باللیل رہبان با لنہار فرسان"

وہ رات کو فقیر ہوتے ہیں اور دن کو شہسوار

ویسے تو یہ رنگ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سبھی کا تھا اور ان کے نام اتحت اسی طرح اللہ کے کام میں لگے رہتے تھے۔ کہ کسی کو اپنے تن من کا ہوش نہ رہتا تھا لیکن آج ان کے دو ایسے گورنروں کا حال سنایا جاتا ہے جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ تج دیا تھا۔

حضرت سلمان فارسی کا قصہ تو سُنا ہوگا یہ ایران کے گورنر تھے۔ مگر ان کے پاس کوئی اردلی تھا، نہ خدمت گار سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے حکومت کے کام سے چھٹی ملتی تو جنگل چلے جاتے لکڑیاں کاٹ کر ان کا گٹھا بناتے اسے اپنے سر پہ لاد کر گھر لاتے۔ راستہ سے گزرتے اور بھیڑ ہوتی تو پکارتے جاتے" طرقوا اللامیر طرقو للامیرؓ (امیر کو راستہ دو، امیر کو راستہ دو)

ساری عمر اس طرح زندگی بسر کی مرنے لگے تو وضو کا برتن، ایک لوٹا اور دوات یہی کل سامان تھا جو گھر میں نظر آتا تھا۔ لیکن پھر بھی آنکھ سے آنسو بہے جاتے تھے ایک صحابی دیکھنے آئے، یہ حال دیکھ کر انھوں نے تسلی دی، لیکن حضرت سلمانؓ کا غم دور نہ ہوا کہ اتنا سامان جمع ہو گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کے ایک اور گورنر

حضرت سعد ابن عامر بھی اسی طبیعت کے تھے وہ بھی امیر ہو کر فقیروں کی زندگی بسر کرتے تھے تنخواہ ملتی تو ساری کی ساری غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ دیتے اور خود روکھی سوکھی کھا کر مہینے گزار دیتے۔

ایک بار ان کے صوبے کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے اور حضرت عمرؓ سے مل کر شکایت کی کہ آپ کے گورنر ویسے تو بہت نیک اور اچھے ہیں لیکن ان میں تین سخت عیب ہیں۔ ایک تو رات کو کیسی ہی آواز دی جائے، جواب نہیں دیتے۔ دوسرے دن چڑھے باہر نکلتے ہیں۔ تیسرے مہینہ میں ایک آدھ بار دن بھر گھر کے اندر ہی رہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کو دل سے تو یقین نہ آیا لیکن شکایت کا پتہ چلانا ضروری تھا۔ اس لئے فوراً سعد ابن عامر کو بلا بھیجا جب وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو پوچھا کہ یہ شکایت کیسی ہے انھوں نے جواب دیا کہ امیرالمومنین بات یہ ہے کہ میرے پاس کوئی نوکر چاکر تو ہے نہیں اپنا سب کام مجھی کو کرنا پڑتا ہے۔ صبح کھانے پکانے میں لگتا ہوں جب اس سے چھٹی ملتی ہے باہر نکلتا ہوں۔ کپڑوں کا بس ایک ہی جوڑا ہے جب میلا ہو جاتا ہے اتار کر اپنے ہاتھ سے دھوتا ہوں جب سوکھ جاتا ہے پہن کر باہر نکلتا ہوں، اس میں سارا دن لگ جاتا ہے، رہا رات کو جواب نہ دینے کا سبب تو امیرالمومنین میں نہیں چاہتا کہ کسی سے بیان کروں، لیکن اب آپ پوچھ ہی رہے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ دن میں نے ان لوگوں کے لئے رکھا ہے اور رات اللہ کے لئے۔ حکومت کے دھندوں سے چھٹی ملتی ہے تو اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں اور ساری رات اسی کی یاد میں گزار دیتا ہوں۔ ایسے میں بھلا لوگوں کی آوازیں کہاں سن سکتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے یہ سارا واقعہ سن کر کہا: بتاؤ اب کیا کہتے ہو، لوگ بھلا کیا کہہ سکتے تھے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

حضرت سعدرضؓ ابن عامر یہ حالات بیان کرکے اپنے صوبے کو واپس چلے گئے۔ پیچھے سے حضرت عمرؓ نے چار پانچ ہزار کی رقم بھیجی کہ اسے خرچ میں لائیں۔
رقم بھیجی تو حضرت سعدرضؓ کی بیوی بہت خوش ہوئیں کہ اب مصیبت کٹی لیکن بھلا سعد ایسے کہاں تھے کہ غریبوں اور محتاجوں کو بھول کر اپنے آرام کی فکر کرتے فوراً اسی وقت ساری رقم تقسیم کردی اور خود اسی مصیبت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

رفیق محمد شاستری ایم اے ایڈیٹر تعلیم و ترقی

بمبم اور گھڑیال والا جادوگر
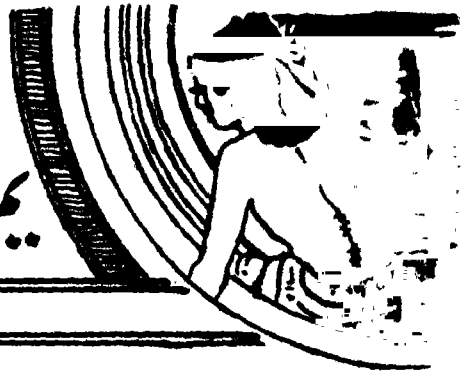
ہمارے دیس میں کسی شوقین فوٹوگرافر کو جانوروں کی تصویریں کھینچنا ہوں تو اسے کسی بڑے چڑیا گھر میں جانا پڑتا ہے مگر یہ پریشانی افریقہ میں نہیں اٹھانا پڑتی۔ وہاں کتنے ہی تو گھنے جنگل ہیں اور کتنے ہی پارک ہیں۔ ان جنگلوں اور پارکوں میں طرح طرح کے جانور ملتے ہیں۔ فوٹوگرافر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق اچھے اور خوب صورت فوٹو آسانی سے لے سکتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے میں آرٹ اور مصوری کے طالب علم کی حیثیت سے مصر، ٹیونس اور گھانا کے دورے پر گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جنگلی جانوروں کی قدرتی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور ان کی تصویریں بناؤں۔

اس سفر کے دوران ایک گھنے جنگل میں سے گذرنا پڑا۔ جنگل کی سڑک پر ہماری جیپ گاڑی فراٹے بھر رہی تھی، اچانک ایک ببر شیر پر نظر پڑی۔ یہ بڑے مزے میں سڑک ہی پر آرام کر رہا تھا۔ جیپ فوراً روکنا پڑی۔ شیر بڑی گہری نیند سو رہا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تاکہ زیادہ قریب سے اچھی تصویریں لے سکوں۔

میں ابھی اپنے کام میں مشغول تھا کہ چند ساتھیوں نے شور مچایا اور کنکریاں

بھی پھینکیں۔ شیر جاگ اٹھا۔ ایک لمبی سی انگڑائی لی اور شاہانہ وقار کے ساتھ ایک طرف کو چل دیا۔ ہماری طرف اس نے مڑکر بھی نہیں دیکھا۔ ہم لوگوں کی موجودگی اس کے نزدیک گویا کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

افریقہ میں صرف بڑے جانور ہی خطرناک نہیں ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی مکھیاں، چیونٹیاں اور سانپ وغیرہ ان بڑے جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

افریقہ کے علاقے میں انسانوں کو درندوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا گھڑیالوں سے، مگر آپ یہ نہ سمجھیے کہ سبھی گھڑیال خطرناک ہوتے ہیں۔ آپ نے ایسے بے ضرر اور معصوم گھڑیالوں کی کہانیاں بھی سنی ہوں گی۔ یہ اتنے پالتو ہوجاتے ہیں کہ اپنے لیے غذا کا انتظام بھی نہیں کرسکتے۔ نہ اتنا منہ پھاڑسکتے ہیں کہ لوگ ان کی انوکھی تصویریں لے سکیں۔

اچھا بھئی خطرناک گھڑیال کا اس علاقے میں عجیب اور انوکھا نام ہے۔ اسے "یم یم" کہتے ہیں۔ شمالی گھانا ندی میں اس طرح کا یم یم ہمیں بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ یم یم بدھے سادے گھڑیالوں کی طرح آدمی سے بالکل مانوس نہیں ہوتا۔

ہمارے ایک شکاری دوست "یم یم" دکھانے ندی کے کنارے لے گئے۔ ان کے ساتھ گھڑیال والا جادوگر بھی تھا۔ جی ہاں گھڑیال والا جادوگر! اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ہمارے ہاں بھی تو سپیرے ہوتے ہیں جو جادومنتر کے زور سے زہریلے سے زہریلے سانپوں کو قابو میں رکھتے ہیں۔

گھڑیال والے جادوگر گاؤں کے لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ اس لیے کہ جہاں کوئی گھڑیال دکھائی دیتا ہے یہ اسے پکڑ لیتے ہیں۔ لوگوں کو یقین ہے کہ پانی میں غوطہ لگاتے ہی اپنے

جادو کے زور سے یہ جادوگر خود بھی گھڑیال
بن جاتے ہیں۔
اچھا تو یہ گھڑیال کو پکڑتے کیسے
ہیں؟ یہ کہانی بھی بڑی دل چسپ ہے
آپ بھی سنیے:
جس جھیل یا دریا میں یہ خطرناک
گھڑیال ہوتا ہے، جادوگر صاحب پہلے
تو اس کا بہت غور سے معائنہ فرماتے
ہیں۔ پھر کئی روز تک شام کو بلاناغہ
اس پانی کے کناروں پر ٹہلتے رہتے
ہیں اور اپنے جادو کی تیاریاں کرتے
رہتے ہیں۔ آخر ایک دن اعلان فرماتے
ہیں کہ اب وہ پانی میں غوطہ لگا کر
گھڑیال سے ملاقات کرنے جا رہے
ہیں۔

اس وقت بڑی دھوم دھام ہوتی
ہے۔ دن چھپتے ہی بستی کے تمام لوگ
جلوس کی شکل میں ان کے ساتھ چلتے
ہیں، یہ جلوس جھیل یا دریا کے کنارے
تک جاتا ہے۔ اور پھر؟ جادوگر صاحب
پانی میں غوطہ لگاتے ہیں، اور غائب
ہو جاتے ہیں۔ ان کے غوطہ لگاتے ہی سب
لوگ فوراً چل پڑتے ہیں۔ کوئی رک
جائے تو جادو کا اثر باقی نہیں رہتا۔
دوسرے دن سورج نکلتے ہی
لوگ وہاں واپس آتے ہیں۔ لے لیجیے
جادوگر صاحب نے بھی پانی میں سے
سر نکالا۔ کل شام ٹھیک اسی جگہ انھوں
نے غوطہ لگایا تھا۔ انھوں نے پانی
کے اندر سے رسی کے چار سرے کنارے
پر پھینکے۔ گاؤں کے چار مضبوط آدمیوں
نے ان سروں کو پکڑ لیا اور پوری
طاقت سے اس رسی کو کھینچنا شروع
کیا کھینچتے رہے کھینچتے رہے۔ اور
آپ جانتے ہیں تھوڑی دیر میں کیا
نکلا؟ ایک پورا کا پورا گھڑیال!
لوگوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً
اس رسی سے جکڑے ہوئے قیدی پر
حملہ کر دیا اور دیکھتے دیکھتے بےچارے
کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کا پیٹ
چاک کرنے کے بعد کبھی کبھی بازوبند
یا کوئی اور چھوٹا موٹا زیور بھی نکل

آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھڑیال صاحب نے انسانوں پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے اور کسی بے چاری عورت کو ہڑپ کر گئے ہیں۔

گاؤں والوں کو یقین ہے کہ جادوگر جادو کے زور سے گھڑیال پکڑتا ہے، خود جادوگر صاحب بھی اسی وہم میں مبتلا ہیں۔ خیر صاحب ہمیں اس سے کیا، اپنا اپنا عقیدہ ہے ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔

پر اس جادو کی اصلیت اور جادوگر صاحب کی کارستانی کا بھید آپ پر کھل جائے تو آپ اور بھی حیرت میں پڑ جائیں۔ آئیے یہ کہانی بھی آپ کو سناتے چلیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جادوگر پانی میں اندر ہی اندر تیرتا ہوا دور نکل جاتا ہے۔ پھر پانی میں سے نکل کر کسی چٹان کے پیچھے یا پہاڑی میں چھپ جاتا ہے۔ جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بالکل اکیلا ہے اور اسے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے تو وہ پھر اس خاص جگہ پہنچتا ہے جہاں وہ کئی راتوں سے گھڑیال کے لیے چارہ ڈال رہا تھا۔ اب وہ لالٹین جلاتا ہے۔ لالٹین کے پاس گوشت کا ٹکڑا ڈال دیتا ہے یا کوئی چھوٹا بندر باندھ دیتا ہے۔ اور لالٹین کے پیچھے بیٹھ کر گھڑیال کا انتظار کرتا ہے۔

تھوڑی دیر میں یہ ہیبت ناک اور ڈراؤنا جانور پانی میں سے نکل کر دھیرے دھیرے رینگتا ہوا شکار کی طرف بڑھتا ہے۔ پر جونہی گوشت کو یا بندر کو نوالہ بنانے کے لیے منہ کھولتا ہے، جادوگر بجلی کی سی تیزی سے اس کے منہ میں ایک مضبوط سا ڈنڈا ٹھونس دیتا ہے۔

اب گھڑیال اس ڈنڈے یا لاٹھی کو اپنے جبڑوں سے نکالنے کے لیے جتنا ہاتھ پیر مارتا ہے اتنا ہی جادوگر پوری طاقت سے ڈنڈے کو اندر دھکیلتا جاتا ہے۔ ہوتے ہوتے گھڑیال بالکل بے دم ہو جاتا ہے۔ اتنا بے دم

ہو جاتا ہے کہ جادوگر لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑ کر خوب زور سے جھٹکا دیتا ہے اور گھڑیال صاحب چاروں خانے چت ہو جاتے ہیں۔ ان کی پیٹھ زمین سے لگ جاتی ہے۔

جادوگر اب بہت ہوشیاری سے گھڑیال کو رسی کے پھندوں میں جکڑ دیتا ہے۔ اس کا پورا جسم پھندوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ منہ پر پھندے ڈالنا ذرا ہوشیاری کا کام ہے۔ جادوگر دھیرے دھیرے بڑی ہوشیاری سے جبڑوں میں پھنسی ہوئی لاٹھی کو نکالتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بڑی پھرتی سے منہ کے پھندوں کو کستا جاتا ہے۔ آخر لاٹھی باہر نکل آتی ہے اور گھڑیال کا منھ بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اس کھینچ تان کے وقت گھڑیال کے جسم پر جگہ جگہ نشان پڑ جاتے ہیں۔ جادوگر یہ سارے نشان ایک ایک کرکے مٹا دیتا ہے۔ اب وہ اسے پانی میں ڈھکیل دیتا ہے اور خود اسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاتا ہے جہاں سے شام کے وقت پانی میں غوطہ لگایا تھا۔

اس خوفناک گھڑیال یا بم بم کو دیکھنے کا ہمیں بھی اشتیاق تھا۔ اتفاق سے اس کا جلد ہی موقع مل گیا۔ ہم اپنے ایک شکاری دوست اور گھڑیال والے جادوگر کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر اس تالاب کے کنارے پہنچے جہاں یہ بم بم صاحب تشریف رکھتے تھے۔

گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیاں اپنے بڑے بڑے جگ پانی میں ڈبو کر بھرتیں اور سر پر اٹھا کر لے جاتیں۔ کنارے پر بہت سے لڑکے بھی تھے۔ یہ عجیب عجیب حرکتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے ڈور میں ایک بڑا سا مینڈک باندھ رکھا تھا اور اسے ایک چھڑی میں لٹکائے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ اس طرح وہ گویا گھڑیال کو للچا رہے تھے کہ ان آوازوں کو سُن کر وہ باہر نکل

ئے۔

ہمارے شکاری دوست نے کسی
ہتی ہوئی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ ایسا
لگتا تھا جیسے درخت کا کوئی تنہ بہہ
رہا ہو۔ دیکھتے دیکھتے وہ تنہ بہتا
ہوا کنارے آ لگا۔ ارے! یہ تو تنہ
نہ کچھ بھی نہیں گھڑیال تھا، یہ پانی
سے باہر نکلا اور مینڈک پر جھپٹ
پڑا۔

گاؤں کا ایک چھوٹا سا کتا
ڈرا سہما میرے قریب ہی کھڑا ہوا
ما۔ اب گھڑیال کی ہمت اور بڑھی اور
وہ میرے کافی قریب آگیا۔ میں اس
کی غضب ناک اور قہر آلود آنکھوں
کو قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ
تو میرے بالکل ہی پاس آ پہنچا۔ میرے
رونگٹے کھڑے ہوگئے پر اس نے
میری طرف توجہ نہیں کی۔ ہاں وہ
بے چارہ چھوٹا سا کتا اس کے
خوفناک جبڑوں میں پہنچ چکا تھا۔
میں نے موقع غنیمت جانا اور بھاگ
کر کار میں جا بیٹھا۔ جادوگر
اور شکاری دوست خطرے کو
بھانپ چکے تھے اور
مجھے پہلے سے آوازیں
دے رہے
تھے۔

(یونیسکو فیچرس سے اپنایا)

(پرنٹر و پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، کے لیے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا)

پروفیسر محمد مجیب

AUGUST 1964

Regd. No

Payam -I- Taleem

NEW DELHI - 25

بچوں کے لئے دلچسپ معلوماتی کتابیں

● **پردادا کی کہانی** اس کتاب میں چار دلچسپ معلوماتی کہانیاں ہیں جن میں ہندوستان کی ہزاروں برس پرانی کہانی ... کے ایک بوڑھے درخت سے کہلوائی گئی ہے
قیمت ۵۰ نئے پیسے

● **سونے کی چڑیا** اس معلوماتی کتاب میں مغلیہ عہد کے ہندوستانی تمدن کی ایک رنگین جھلک نظر آئے گی جس کو بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں کا ہاتھ رہا ہے۔
قیمت: ایک روپیہ

● **سمندر کے کنارے** اس کتاب میں سمندر کے کنارے رہنے والی مخلوق اور طرح طرح کے عجیب جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ خوبصورت ٹائیٹل۔ رنگ برنگی تصاویر۔
قیمت: ایک روپیہ ۲۰ نئے پیسے

● **آدمی کی کہانی** اب سے ہزاروں برس پہلے آج جیسی نہ آدمی کی صورت تھی اور نہ آج جیسا رہن سہن۔ یہ سب درجہ بدرجہ کس طرح ہوا اسی کی کہانی اس کتاب میں پڑھئے
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

● **انوکھا عجائب خانہ** اس کتاب میں چھوٹی موٹی روزمرہ کی چیزوں کے بارے میں سوال قائم کرکے ان کے جواب دئے گئے ہیں۔ سوال و جواب کا انداز بے حد مزیدار اور دلچسپ ہے۔
قیمت: حصہ اول ۵۰ نئے پیسے۔ حصہ دوم ۴۰ نئے پیسے

پیامِ تعلیم

شمارہ ۲

ایڈیٹر : محمد حسین حسّان ندوی

سالانہ چندہ : پانچ روپے

فی پرچہ : پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فہرست مضامین

بچّوں سے باتیں

بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کا پیام تعلیم عام طور پر سب کو اچھا لگا۔ بڑوں کو بھی، بچیوں کو بھی بچوں کو بھی۔ دلی میں، دلی کے باہر، جس جس کے پاس رسالہ پہنچا اس نے پیام تعلیم کے دوبارہ نکلنے پر خوشی بھی ظاہر کی، اس کے مضمونوں کی تعریف کی، ہمیں مبارک باد دی۔ اس کو اور بہتر بنانے کے لیے مفید مشورے دیے۔ ان سب بزرگوں کا اور اپنے پیامیوں کا دلی شکریہ۔

خود جامعہ کے حلقے میں پیام تعلیم کے نکلنے سے یوں سمجھیے کہ خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہم نے جامعہ کے بڑوں اور بچوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے ایک خاص جلسہ بھی کیا۔ اس میں کالج کے استادوں کو بلایا، ٹریننگ کالج اور آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے استادوں کو بلایا، ثانوی اور ابتدائی کے استادوں کو بلایا، ثانوی اور ابتدائی کی بچیوں اور بچوں کو بلایا۔ ان سب نے ہمیں بڑے اچھے اچھے مشورے دیے۔ بہت مفید تجویزیں پیش کیں، رسالے میں جہاں جہاں کوئی کمی یا خامی نظر آئی وہ ہمیں بتائیں۔ اس جلسے میں ہمیں بڑا فائدہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ ایسا جلسہ ہر نیا رسالہ نکلنے کے بعد کیا جائے۔

اس جلسے میں ایک تجویز پر متفقہ طور پر سبھی نے صاد کیا: پیام تعلیم میں انعامی مقابلے شروع کیے جائیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ سب سے پہلے مضمون نگاری کا مقابلہ شروع کیا جائے۔

اور مضمون پنڈت جواہر لال نہرو پر لکھوائے جائیں اور اس مقابلے میں اول دوم سوم آنے والے مضمون پیام تعلیم میں شائع کیے جائیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ۱۴ر نومبر کو پنڈت جی کا جنم دن ہے ہر سال بچوں کی طرف سے خاص طور پر پنڈت جی کا جنم دن بہت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اسی لیے طے ہوا کہ یہ مضمون نومبر کے پرچے میں شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں اور زیادہ تفصیل کسی دوسری جگہ دیکھیے۔

نومبر کا پیام تعلیم ایک طرح سے نہرو نمبر ہوگا۔ اس میں بچیوں اور بچوں کے انعامی مضمونوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے مضمون اور نظمیں بھی چھپیں گی۔ جن میں پنڈت جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا۔

ایک خوشی کی بات اور سنیے۔ جب سے آپ کا پیام تعلیم نکلا ہے، مضمونوں کی جیسے بارش سی ہونے لگی ہے۔ کہانیوں کی بھی، نظموں کی بھی۔ اس سے ایک تو پیام تعلیم سے ان ساتھیوں کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے اپنی اردو زبان سے محبت اور لگاؤ کا۔ ان لکھنے والوں میں بڑے بھی ہیں اور ماشاء اللہ ننھے پیامی بھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد لکھنے والوں کی توجہ بچوں کے ادب کی طرف بہت کم ہوگئی ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ نئے لکھنے والے میدان میں آئیں اور ان کی ہر طرح ہمت بڑھائی جائے۔ انھیں ہر طرح کی سہولتیں پہنچائی جائیں۔

پر اس سلسلے میں ہمیں کچھ کہنا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے بھی، اپنے پیامیوں سے بھی۔ ایک پرانی مثل ہے "پہلے تولو پھر بولو" یعنی کوئی بات کہنے سے پہلے آپ خود سوچ سمجھ لیجیے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور سننے والے پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ بالکل یہی بات لکھنے پر بھی [illegible]۔ لکھنے سے پہلے آپ سوچ لیجیے کہ ہم کس کے لیے لکھ رہے ہیں۔ جن کے لیے ہم لکھ رہے ہیں، ان کی سمجھ کتنی ہے۔ ان کی ضرورتیں کیا ہیں۔ یہ چند باتیں بہت

بنیادی ہیں۔

آج کل ہمارے ساتھیوں میں مزاحیہ انداز میں لکھنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ پر یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے بات اور بگڑ جاتی ہے۔
کچھ ساتھی اپنی یا دوسروں کی شرارتوں کا حال مزاحیہ انداز میں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جگہ جگہ پڑھنے لکھنے سے بیزاری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اگر لکھنے سے پہلے یا بعد ساتھی یہ سوچ لیں کہ اس کا اثر پڑھنے والے بچے پر کیا پڑ سکتا ہے تو غالباً ایسے مضمون لکھنے سے خود ہی پرہیز کریں اور ہم بھی بڑی پریشانی سے بچ جائیں۔
کچھ ایسی نظمیں بھی ہمارے پاس آئی ہیں جن میں استاد بے چارے پر بہت لے دے کی گئی ہے، بہت پھوہڑپن سے کی گئی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ساتھیوں نے ایسی نظمیں پیامِ تعلیم کو بھیجنے کی جرأت کی۔

ننھے مضمون نگاروں سے بھی ہمیں کچھ باتیں کہنا ہیں۔ بھئی آپ کے مضمون سر آنکھوں پر۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ پیامِ تعلیم میں آپ ہی کی کوششوں کا حصہ زیادہ ہو۔ پر ایک شرط ہے۔ جو کچھ ہو آپ کی خالص محنت کا نتیجہ ہو۔ مانگے تانگے کی چیز نہ ہو۔ بعض پیامی دوسروں کے مضمون نقل کر کے بھیج دیتے ہیں۔ بعض اناپ شناپ چیزیں لکھ کر بھیج دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اسے ضرور چھاپا جائے۔ پیامی ایسی چیزیں ہمیں بھیجنے سے پہلے اپنے سرپرستوں یا استادوں کو دکھا لیا کریں تو بڑا اچھا ہو۔

اس پرچے میں آپ کچھ نئی نئی چیزیں پائیں گے۔ خدا کرے یہ آپ کو پسند آئیں۔ دھیرے دھیرے انشاءاللہ آپ کی ضرورت اور دلچسپی کی چیزیں بڑھتی ہی جائیں گی۔

بزمی بھارتی
"راجا بیٹے جاگ"
صبح ہوئی بُلبُل چہکی
پیڑوں پر چڑیاں بولیں
اوس میں دُھل کر گُل مسکائے
کلیوں نے آنکھیں کھولیں
میرے راجا بیٹا جاگ
تو ہے جگ کا راگ

نیل گگن پر سورج چاند
تیرے مکھ کے آگے ماند
تارے تیرے پاؤں کی خاک
تو ہے دھرتی ماں کا چاند
میرے راجا بیٹے جاگ
تو ہے جگ کا سریلا راگ

باپ کی پونجی ماں کے پیار
دل کی ٹھنڈک آنکھ کے نور
سن کر تیرے میٹھے بول
سب دکھ ہو جاتے ہیں دور
میرے راجا بیٹے جاگ
تو ہے جگ کا سریلا راگ

دھرتی ماتا کا آنچل
اپنی خوشبو سے مہکا
ہر جانب تیری ہو چاہ
پیار سے اپنے دیپ جلا
میرے راجا بیٹے جاگ
تو ہے جگ کا سریلا راگ

شاکرہ ندیم

جیسے کو تیسا

(افریقہ کی ایک لوک کہانی)

ایک بار جنگل کے سب جانور ایک جگہ جمع ہوئے، اور سب نے مل کر طے کیا کہ ایک دعوت ہونی چاہیے، بہت شان دار دعوت! دعوت کا انتظام مکڑے میاں کے سپرد کیا گیا۔ جنگل کے سبھی باسی جانتے تھے کہ جانوروں میں یہ حضرت سب سے زیادہ پیٹو ہیں،

یہ انتظام انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تو کھانے پینے کی

چیزوں کی خوب ریل پیل ہوگی۔

دعوت کے دن جانوروں نے پہلے تو جی بھر کے کھجور کی شراب پی اور مست ہوکے خوب ناچے کودے، بھوک لگنے لگی تو کھانا کھانے بیٹھے۔

پر میاں مگرمچھ کو ایک انوکھی شرارت سوجھی۔ کہنے لگے کھانے سے پہلے ہر ایک جانور اپنے ہاتھ ضرور دھو لے۔ یہ سنتے ہی سب جانور ندی پر گئے اور ہاتھ دھو آئے۔ بس ایک بندر میاں رہ گئے۔ یہ بے چارے اپنے ہاتھ صاف نہ دھو سکے تھے۔ بندر میاں نے ہاتھوں کو ریت سے رگڑا، پتیوں سے رگڑا۔ تیل بھی لگاکر دیکھا پر سب بیکار وہ گندے کے گندے ہی رہے۔ مجبوراً بے چارہ بھوکا پیاسا گھر لوٹ آیا۔ مگرمچھ میاں کی یہ شرارت بندر کو پریشان کرنے کے لیے تو تھی ہی!

بندر بہت اُداس تھا۔ اس دن سچ مچ اس کی بہت بھد ہوئی تھی۔ وہ مگرمچھ سے بدلہ لینے کی سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے آخر ایک بات اسے سوجھ گئی۔

دوسرے دن اس نے اعلان کیا کہ فلاں دن ہماری طرف سے جنگل کے سب بھائیوں کی دعوت ہے۔ یہ دعوت پانی کے اندر ہوگی۔

مقررہ دن سب جانور تالاب پر جمع ہوئے اور ایک ایک کرکے پانی میں کودتے اور تہہ میں پہنچتے گئے۔ وہاں دعوت کا بڑا سامان جمع تھا۔ طرح طرح کی جڑی بوٹیاں تھیں۔ میٹھے میٹھے پھل تھے۔ قسم قسم کی مچھلیاں تھیں۔ درختوں کی جڑیں تھیں۔

دعوت میں مگرمچھ میاں بھی تھے۔ انھوں نے بھی غوطہ لگاکر نیچے پہنچنے کی کوشش کی پر وہ تو اوپر کے اوپر ہی رہے۔ بہت کوشش کی، بہت کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر انھوں نے ترکیب سوچی پر کہیں سے فرغل مانگ لائے۔ اس فرغل پر نیلی سفید دھاریاں پڑی تھیں۔ مگرمچھ میاں کے اس فرغل

کی جیبوں میں خوب بہت سے پتھر بھر لیے اور اب وہ بھی پانی کی تہہ میں جا پہنچے۔ اپنی کامیابی پر بڑے خوش تھے۔

دعوت شروع ہونے والی تھی کہ بندر میاں نے اٹھ کر ایک اعلان کیا: "بھائیو! یہ دعوت پانی کے اندر ہو رہی ہے، یہاں کسی بھائی کو دھاری دار کوٹ پہن کر نہیں آنا چاہیے۔"

سب جانوروں نے چاروں طرف اچنبھے سے دیکھا۔ صرف ایک کرڈے میاں فرغل پہن کر آئے تھے، مجبوراً بے چاروں کو فرغل اتارنا پڑا۔ فرغل کا اتارنا تھا کہ کرڈے میاں بات کہتے میں اوپر آ گئے۔ سارے جانور اوپر دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ بندر میاں دل ہی دل میں بہت خوش تھے پر منہ پر ہنسی نہیں آنے دی۔ اس لیے کہ آخر تھے تو وہ ان کے مہمان۔ بلکہ بہت سنجیدہ صورت بنا کر بولے: "کرڈے میاں خیریت تو ہے، اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو۔ دعوت تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔"

کرڈے میاں اس کا کیا جواب دیتے، کھسیا کر رہ گئے۔ بے چارے بے بسی میں ہاتھ پیر مارتے اور بھوک بہت ستاتی تو پانی میں سر ڈال کر دوسرے مہمانوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ لیتے کہ دعوت کا مزا اڑا رہے ہیں۔ کیا عجب جو دل میں پچھتا بھی رہے ہیں کہ نہ دوسروں کے ساتھ ایسی شرارت کرتے نہ یہ دن دیکھنا پڑتا۔

آج بھی تو آپ کسی تالاب پر جا کر دیکھیے۔ کرڈے میاں پانی کے اوپر ہی اوپر ادھر سے ادھر پھیلتے اور بے چینی سے پانی کی تہوں میں جھانکتے نظر آئیں گے۔

(یونسکو فیچرس)

خط و کتابت

کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے ورنہ جواب میں تاخیر کا امکان ہے۔

(مینجر)

عبدالحلیم ندوی

مصر کے تہوار

آج کل اخباروں میں مصر کا ذکر اکثر آتا ہے۔ ہمارے دوست ملکوں میں اس ملک کی بڑی اہمیت ہے۔ جب سے جمال عبدالناصر نے اس ملک کی باگ ڈور سنبھالی ہے اس کی کایا پلٹ گئی ہے۔ اور وہ اسی طرح اس کی ترقی کی کوششوں میں لگے رہے تو یہ چھوٹا سا ملک تھوڑے دنوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔

دوسرے ملکوں کے لوگوں کے حال چال ان کے رہن سہن سے اپنے پیامیوں کو باخبر کرنا پیامِ تعلیم کا خاص مقصد رہا ہے۔ اسی خیال سے ہم نے جناب عبدالحلیم ندوی سے یہ مضمون خاص طور پر لکھوایا ہے۔ حلیم صاحب نے ساری باتیں آنکھوں دیکھی لکھی ہیں۔ امید ہے کہ آپ انھیں دلچسپی سے پڑھیں گے۔ (ایڈیٹر)

مصری بہت ہنس مکھ، بہت زندہ دل، بہت ملنسار، بہت مہمان نواز لوگ ہیں۔ ان کے یہاں ہندوستان کے مقابلے میں تہوار کم ہوتے ہیں، لیکن جو ہوتے ہیں، انھیں یہ لوگ، بڑی دھوم دھام، بہت جوش و خروش سے مناتے ہیں۔

ہمارے دیس میں ہفتہ واری چھٹی اتوار کو ہوتی ہے، یہ مسلمانوں کا ملک ہے اس لیے یہاں یہ چھٹی جمعہ کو ہوتی ہے۔ اس دن عام طور سے اسکولوں کے بچے، گھر کے اکثر لوگ، مختصر سا ناشتہ لے کر صبح ہی گھر سے نکل پڑتے ہیں، اور کسی

پارک، کسی تفریح گاہ کسی باغ میں سارا دن ہنس کھیل کر گذارتے ہیں اور شام کو خوش خوش گھر لوٹتے ہیں۔

یہاں کے قومی تہواروں میں عید، بقرعید کے علاوہ دو تہواروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور انھیں پوری قوم بڑے اہتمام سے مناتی ہے۔ ایک عید شم النسیم، یعنی جشن بہاراں، اور دوسرا عید وفاء النیل، یعنی دریائے نیل میں سیلاب آنے کا تہوار۔

شم النسیم یا جشن بہاراں، یہاں کا سب سے اہم، دلچسپ اور خاص تہوار ہے۔ اس کے لیے بہت پہلے سے تیاریاں کی جاتی ہیں۔ بچے تو اس کے لیے دن گنا کرتے ہیں۔ یہ تہوار عام طور سے اخیر اپریل میں منایا جاتا ہے۔ اور ہمارے بسنت سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، ہمارے یہاں تو سرسوں پھولتی ہے، گیہوں میں سنہری بالیں نکلتی ہیں، ان کے یہاں گلاب پھولتے ہیں، بیلے پھولتے ہیں۔ اور روئی کے ننھے ننھے پودوں پر سفید سفید روئی کے گالے لٹکتے ہیں۔ درخت اپنے سوکھے، مرجھائے پتے جھاڑ کر نیا نویلا جوڑا پہن کر دلہن کی طرح سج جاتے ہیں۔ اتنے دنوں کی سردی کے بعد، جسم میں ایک نئی جان اور نئی توانائی آنے لگتی ہے، ایسے موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے مصری قوم، ایک صبح کو، گھر سے باہر نکل جاتی ہے، خوب جی بھر کے خوشی مناتی ہے، اور تین چار مہینے گھر میں بند رہنے کی پوری کسر نکال لیتی ہے۔

عام طور سے یہ تہوار قاہرہ سے باہر تقریباً آٹھ دس میل دور، نیل کے کنارے القناطر الخیریہ (براج) پر منائی جاتی ہے۔ قناطر خیریہ، نیل کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس جگہ سے نیل کی دو شاخیں ہوجاتی ہیں۔ ایک شاخ، شاخ رشید کے نام سے، اور دوسری شاخ دمیاط کے نام سے، جہاں سے یہ شاخیں نکلتی ہیں، وہاں سے محمد علی پاشا (معزول

بادشاہ فاروق کے پردادا) نے بہت سی نہریں سینچائی کے لیے نکالی ہیں۔ اور کنارے پر ایک بہت لمبا چوڑا باغ بنایا ہے، جس میں پھولوں کے تختے، کنج، جھاڑیاں، بڑے بڑے چھتنار درخت، سرسبز لمبے چوڑے میدان ہیں۔ ایک چھوٹی سی نہر، اور اس پر پہاڑی قسم کا پل بھی بنایا گیا ہے ایسی شاعرانہ جگہ، اور پرفضا مقام پر شم النسیم کا یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

یہاں تک پہنچنے کا انتظام بھی بہت اچھا ہے، ریل اور بس کے علاوہ، خاص قسم کے بجرے نیل میں چلتے ہیں۔ عام طور سے لوگ اس تہوار کو منانے کے لیے ان بجروں ہی کے ذریعے قناطر جاتے ہیں۔ صبح سویرے آٹھ بجے کے قریب روض الفرج، (RAUD-EL-FARAJ) کے گھاٹ پر پھولوں اور ہاروں سے سجے سجائے بجرے لگ جاتے ہیں۔ یہ بجرے عام طور سے دو منزلہ ہوتے ہیں، اور موٹر سے چلتے ہیں، نو بجتے بجتے لوگ جمع ہونا شروع ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے خوب کھلکھلاتے اور خوب صورت کپڑے پہنے اپنے بھائی بہنوں اور ماں باپ کے ساتھ، بڑے اپنے دوست، احباب کی ٹولیوں میں، آکر بجرے میں بیٹھ جاتے ہیں، نچلی منزل میں عام طور سے بوڑھے لوگ بیٹھتے ہیں، اور اپنے بیتے دنوں کی یاد میں کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں، البتہ اوپر کی منزل پر بڑی چہل پہل ہوتی ہے، بڑی رونق ہوتی ہے۔ یہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں، ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بچے ہنگامہ اور شور کرتے رہتے ہیں، پر جب بجرہ چل پڑتا ہے تو پھر نوجوانوں کی ان ٹولیوں پر رنگ آنے لگتا ہے، ایک آدمی دف (مصری ڈھولک) سنبھالتا ہے، ایک بربط کے تار چھیڑتا ہے، اور دس بارہ تالی پر جم جاتے ہیں، اور پھر کوئی دھن چھیڑ دیتے ہیں، تھوڑی

دیر تک موسیقی بھی رہتی ہے، اتنے میں کوئی منچلا نوجوان اٹھ کر، اپنے کسی دوست کا مفلر یا اپنے کسی ساتھی کی شال چھین لیتا ہے، اور اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر، بیچ حلقہ میں پہنچ جاتا ہے اور موسیقی کی دھن پر بلا تکلف ناچنا شروع کر دیتا ہے، اور ساری ٹولی دھن کو تالیوں پر اٹھا لیتی ہے، جب وہ تھک جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، اسی طرح ناچتے گاتے، گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد، بجرہ قناطر خیریہ میں کنارے سے جا لگتا ہے۔ سب لوگ اتر کر، اچھی جگہ ڈھونڈھنے میں لگ جاتے ہیں۔ جگہ مل جاتی ہے تو دری وغیرہ بچھا دیتے ہیں، اور پھر طرح طرح کی تفریحوں میں کھو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ مداریوں کا تماشہ دیکھنے لگتے ہیں۔ بعض کشتی کی سیر کرتے ہیں، اور بعض بیٹھ کر گنا چوستے ہیں اور چھلکوں سے ایک دوسرے کی

تواضع کرتے ہیں۔ نیل کے کنارے کنارے خوانچہ والوں کا راج ہوتا ہے یہ خوانچہ والے بالکل ہمارے یہاں کے خوانچہ والوں جیسے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کھلی چیزیں بیچتے ہیں، اور اسی طرح لوگ ان سے خرید کر اور کھڑے ہو کر کھاتے ہیں۔ ان کے پاس عام طور سے طعمیہ (TAMIAH) ایک قسم کی پھلکی ہوتی ہے، اُبلے ہوئے بھٹے ہوتے ہیں۔ تلی ہوئی مچھلی اور اُبلے ہوئے انڈے بھی خوب ملتے ہیں۔ پاس ہی زمین پر مصر کے مشہور اور نرم گنوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

اس دن مصری کھانے کا بہت اہتمام کرتے ہیں، اچھے سے اچھا کھانا پکوا کر ساتھ لاتے ہیں اور خوب جی بھر کے کھاتے ہیں۔ اس تہوار کی خاص چیز فسیخ (FISSEKH) ہوتی ہے مصری اسے بہت شوق اور رغبت سے کھاتے ہیں، یہ ایک مچھلی ہے جو

بڑھن یا ملی سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔
مصری ایک ہانڈی میں سرکہ بھر کے
کچی مچھلی اس میں ڈال دیتے ہیں،
یہ ہانڈی زمین میں دفن کردی جاتی
ہے چار یا پانچ مہینے کے بعد خاص
اس تہوار کے موقع پر نکالی جاتی
ہے۔ مصری اسے قناطر پر لے جاکر
بڑے شوق اور رغبت سے کھاتے
ہیں، لیکن ہم آپ اگر اس کے
پاس سے بھی گزر جائیں تو متلی آجائے
اس قدر بدبو ہوتی ہے کہ ناک نہیں
دی جاتی، پر مصری تو اسے اس
طرح کھاتا ہے، جیسے ہم آپ
حلوہ سوہن۔ اس تہوار کی ایک
خاص چیز رنگے انڈے بھی ہیں۔
انڈے رنگنے کا اہتمام لڑکیاں
بہت کرتی ہیں، ہفتوں پہلے سے
بڑے بڑے انڈے لاکر ان پر
خوشنما رنگوں سے خوشنما گل بوٹے
بناتی ہیں، اور تحفۃً پیش کرتی ہیں۔
رنگے ہوئے غباروں کا بھی بڑا رواج
ہے، جس دکان پر جایئے رنگے انڈے
اور غبارے ضرور لٹکے ملیں گے۔

یہ تہوار فصل بہار کا تہوار ہے۔
اس لیے قناطر پر خوب صورت پھولوں کا
انعامی مقابلہ بھی ہوتا ہے، اس میں عام
طور سے بڑے لوگوں کی بیویاں شریک
ہوتی ہیں، اور جس کا پھول سب سے
زیادہ خوب صورت، اور بڑا ہوتا ہے
اسے کوئی دلچسپ اور ہنسانے والا
انعام دیا جاتا ہے، اس تقریب کے
بعد یہ تہوار ختم ہوتا ہے، اور لوگ
ریل یا بسوں کے ذریعے گھروں کو
واپس آتے ہیں، اور رات کو دوست
احباب کے یہاں جاتے ہیں، ایک
دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں،
پھولوں کے گلدستے اور ہار پیش
کرتے ہیں۔

سید حرمت الاکرام

اُٹھو بچو!

سید حرمت الاکرام صاحب نے یہ اچھی سی نظم مرحمت فرمائی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری طرح تمہیں بھی یہ بہت پسند آئے گی۔ اس نظم میں کچھ لفظ مثلاً بادِ سحر، آشیانہ، خلد، نیلگوں، در، خم، بام، ظلمتِ شب، مہرجبیں، رختِ سفر وغیرہ ذرا مشکل ہیں۔ ان کے معنی آپ استاد سے پوچھیے۔ اچھا تو یہ ہے کہ آپ خود لغت دیکھیے اور اس لغت میں مشکل لفظوں کے معنی تلاش کیجیے۔ (ایڈیٹر)

جاگ اٹھے خشک و تر، اُٹھو بچو!
سو چکے رات بھر، اُٹھو بچو!

ساتھ لے کر پیامِ بیداری
آئی بادِ سحر، اُٹھو بچو!

آشیانوں کو خیر باد کہا
کھولے چڑیوں نے پر، اُٹھو بچو!

ہر طرف خُلد کا ہے نظارہ
دیکھ لو اک نظر، اُٹھو بچو!

وہ اذاں کی صدا بلند ہوئی
جاگ اٹھا گھر کا گھر، اُٹھو بچو!

مندروں میں بھجن کی گونج سے
بج رہے ہیں گجر، اُٹھو بچو!

نیلگوں عرش کی فضاؤں نے کھولے رحمت کے در، اُٹھو بچو!

مالکِ دو جہاں کے سجدے میں
خم کرو اپنے سر، اُٹھو بچو!

روشنی پاکے مُسکرا اُٹھے شہر کے بام و در، اُٹھو بچو!
ظلمتِ شب کے بعد مہر مبیں پھر ہوا جلوہ گر، اُٹھو بچو!
قافلے نور کے روانہ ہوئے جاگی ہر رہگذر، اُٹھو بچو!
جھلملاتی ہوئی شعاعوں نے باندھا رختِ سفر، اُٹھو بچو!

کیوں گنواؤ یہ قیمتی گھڑیاں؟
کیوں رہو بے خبر؟ اُٹھو بچو!

مجیب احمد خاں

دھنورا کے آدم خور شیر

مدھیہ پردیش کے ضلع بستر میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے دھنورا۔ یہ گاؤں نارائن پور کے پہاڑی علاقے میں ہے۔ لگاتار تین برسوں سے شیروں کے ایک پورے خاندان نے دھنورا اور آس پاس کے دیہاتوں میں اودھم مچا رکھا تھا۔ لوگوں پر ایک زبردست خوف و ہراس طاری تھا۔

ان شیروں نے اس تین سال کی مدت میں لگ بھگ پونے تین سو آدمیوں کو اپنی خوراک بنایا تھا۔ اور ان بدنصیب انسانوں میں ۷۵ فیصدی عورتیں تھیں۔ اس کے علاوہ بے حساب پالتو جانور بھی ان شیروں نے مار ڈالے تھے۔ غرض دھنورا اور آس پاس کے لوگوں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ رات تو رات بے چاروں کی دن میں بھی گاؤں سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ سب کاروبار ٹھپ ہوگیا تھا۔ ڈر کے مارے لوگوں نے کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ان آدم خور شیروں کو مارنے کے لیے سرکار کی طرف سے کئی بار انعام بھی مقرر کیے گئے۔ کئی شکاریوں نے ان کو مارنے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہے۔ آخرکار یہ کام مدھیہ پردیش کی ایس۔ اے۔ ایف (اسپیشل آرمڈ فورسیز) کے سپرد کیا گیا۔

ایس۔ اے۔ ایف نے ان شیروں کو ختم کرنے کا ایک باقاعدہ منصوبہ تیار کیا۔ مختلف یونٹوں کے کہنہ مشق شکاریوں کو اس نیک کام میں حصّہ لینے کے لیے بلایا گیا۔ مدھیہ پردیش ایس۔ اے۔ ایف کی چوتھی بٹالین کے اسسٹنٹ کمانڈر عبدالعزیز خاں صاحب اس مہم میں شرکت کے لیے ناگا لینڈ سے بھوپال پہنچے۔ عبدالعزیز خاں صاحب ایک کہنہ مشق شکاری ہیں۔ انھوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرکے اس مہم کا ایک خاکہ تیار کیا اور سات آدمیوں کی ایک شکار پارٹی بنائی۔ اس پارٹی میں اسسٹنٹ کمانڈر شیو سنگھ، انسپکٹر پدم سنگھ، ہیڈ کانسٹبل محمد یوسف، ہیڈ کانسٹبل للو سنگھ، ہیڈ کانسٹبل اندر سنگھ اور کانسٹبل سجن سنگھ شامل تھے۔ ان سب نے مل کر ان شیروں کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

پر اب پارٹی کے سامنے دو بڑی مشکلیں تھیں، ان کے پاس شیر کو مارنے والی اچھی رائفلیں نہیں تھیں پولیس والوں کی رائفلیں شیر کے شکار کے لیے بالکل ناموزوں ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ لوگ شیروں والے علاقے سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ اس علاقے کے دیہاتی بہت خوف زدہ تھے اور کسی قیمت پر بھی شکار پارٹی کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ یہ لوگ اَن پڑھ ہیں اور توہم پرست ہیں۔ وہ عجیب عجیب باتیں کرتے تھے، مثلاً ان کے خاندان ہی کے مرے ہوئے لوگوں نے شیروں کی شکل میں دوسرا جنم لیا ہے۔ ان کی زندگی میں ان کے ساتھ زیادتیاں کی گئی تھیں۔ اب وہ انہی زیادتیوں کا بدلہ لے رہے ہیں۔

لیکن ان سب مشکلوں کے باوجود عبدالعزیز خاں اور ان کے ساتھیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ شیروں کے علاقے میں پہنچنے کے تیسرے ہی دن انھیں خبر ملی کہ شیر نے ایک گائے کو مار دیا ہے۔ عبدالعزیز خاں فوراً اس جگہ

پہنچے جہاں شیر گائے کو چھوڑ گیا تھا وہ ایک پیڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئے، اور تمام رات شیر کا انتظار کیا۔ مگر شیر نہیں آیا۔

دوسرے دن جنگل کا ہانکا کرایا گیا مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی اور شیر کی جھلک تک نہ دکھائی دی۔ اس کے بعد عبدالعزیز خاں نے شیر کے نشانوں کی مدد سے اس کا پیچھا کیا۔ شیر کے پیروں کے نشان انھیں ایک نالے تک برابر دکھائی دیتے رہے، اس کے بعد وہ یکایک غائب ہو گئے اور یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ شیر کدھر چلا گیا۔ یہ بات طے تھی کہ شیر نالے ہی میں اتر گیا ہے۔ یہ نالا کچھ اس طرح کا تھا کہ اس میں اترنا مشکل بھی تھا، اور خطرناک بھی۔

عبدالعزیز خاں کو تھوڑے فاصلہ پر ایک پیڑ دکھائی دیا۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی ہیڈ کانسٹبل سے کہا کہ وہ پیڑ پر چڑھ کر شیر کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک وہ پیڑ پر نہ چڑھ جائیں اپنی بندوق سے ان کی حفاظت کرے۔ اس پیڑ کے اوپر سے نالے کا اندرونی حصہ صاف نظر آنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد نالے میں لمبی گھاس کی پتیاں ہلتی معلوم ہوئیں۔ انھوں نے اس جگہ نظریں جمادیں اور چند ہی لمحے بعد ان کی نظر شیر پر پڑی۔ شیر نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ وہ بہت ہوشیاری سے ادھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ عبدالعزیز خاں نے تیزی سے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے پچھلے پٹھے پر پڑی۔ شیر نے غراتے ہوئے ایک تیز چھلانگ لگائی اس وقت عبدالعزیز خاں نے دوسرا فائر کیا، لیکن شیر لمبی گھاس میں غائب ہو چکا تھا۔ عبدالعزیز خاں کا خیال تھا کہ دوسری گولی اس کے

نہیں لگی۔ دوسرے دن اس کی تلاش شروع ہوئی کیا دیکھتے ہیں کہ تھوڑی ہی دور پر شیر مرا پڑا ہے۔
اس کامیابی سے عبدالعزیز خاں اور ان کے ساتھیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے، اب گاؤں والے بھی ان کی ہر طرح مدد کرنے پر خوشی خوشی آمادہ ہوگئے۔

عبدالعزیز خاں نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ پچھلے دن شیر اپنے شکار کو اٹھا کر کچھ دور جنگل میں لے گیا تھا۔ گائے کی لاش اب بھی اسی جگہ پڑی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرا شیر اس کو کھانے کے لیے رات کو ضرور آئے گا۔ انھوں نے دن ہی میں گائے سے تھوڑے فاصلے پر ایک مضبوط پیڑ پر ایک مچان بندھوایا، دن چھپنے سے پہلے اس پر جاکر بیٹھ گئے اور پتوں وغیرہ سے خود کو خوب اچھی طرح چھپا لیا۔ کچھ رات گئے شیر اپنے مارے ہوئے شکار پر آیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ عبدالعزیز خاں نے جب یہ اندازہ لگا لیا کہ شیر گائے کے بالکل قریب آگیا ہے تو انھوں نے اس پر ٹارچ ڈالا، اور ہوشیار شکاری کی طرح یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں ٹھیک نشانے پر پڑیں اور شیر وہیں پر ٹھنڈا ہوگیا۔ اس طرح عبدالعزیز خاں نے آدم خور شیروں کے اس خاندان کے دو شیر مار دیے۔

لیکن ابھی دھنورے کا اصل آدم خور باقی تھا یہ ایک بوڑھی اور تجربہ کار شیرنی تھی۔ یہ اب بھی آزاد پھر رہی تھی۔ وہ اپنے نر اور ایک بچے کے مارے جانے کی وجہ سے زیادہ خطرناک اور چوکنا ہوگئی تھی۔ کئی دن تک عبدالعزیز خاں اور ان کی پارٹی اس کی تلاش میں میلوں لمبے چوڑے جنگل میں گھوما کیے مگر شیرنی کا کوئی اتا پتا نہیں ملا۔
ایک دن دوپہر کو وہ کسی دوست کے گھر کھانا کھانے جارہے تھے۔ راستے

ہی میں کسی نے خبر دی کہ شیرنی نے دھنورے کے قریب ہی ایک رات میں تین گائیں مار ڈالی ہیں۔ عبدالعزیز اپنی پارٹی کے ساتھ فوراً موقع پر پہنچے، جنگل کا ہانکا کرایا گیا مگر شیرنی کہیں نظر نہ پڑی۔ اتنے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی اور شیرنی کا تعاقب وقتی طور پر ملتوی کر دیا گیا۔ بارش بند ہوئی تو پھر تلاش شروع کر دی گئی۔ اتنی دیر میں شیرنی اپنے شکار کو اٹھا کر ایک پہاڑی پر لے جا چکی تھی۔ بارش سے ایک بہت بڑا فائدہ ہوا گیلی زمین پر شیرنی کے پیروں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ عبدالعزیز خاں نے ان نشانوں کی مدد سے شیرنی کا پیچھا شروع کیا اور آہستہ آہستہ وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں شیرنی اپنے شکار کو لے گئی تھی۔ یکایک عبدالعزیز خاں کو ایک طرف سے شیرنی کی ہلکی سی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ شیرنی نے انھیں دیکھ لیا

تھا۔ عبدالعزیز خاں چوکنا ہو گئے۔ وہ دو تین قدم اور آگے بڑھے ہی تھے کہ ان کی نظر شیرنی پر پڑی۔ شیرنی زمین میں دبک گئی تھی اور اس کی دُم سانپ کی دُم کی طرح آہستہ آہستہ بل کھا رہی تھی۔ جب شیر حملہ کرتا ہے تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ عبدالعزیز خاں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی رائفل اٹھائی اور فائر کر دیا۔ گولی شیرنی کے سر کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ جب شیرنی کی کھال اتاری گئی تو اس کے داہنے کندھے پر گولی کا ایک پرانا نشان تھا۔ یہ شیرنی ایک آنکھ سے کانی تھی۔ اس کی یہ آنکھ سیہی کا کانٹا لگ جانے سے جاتی رہی تھی۔ شاید ان دو زخموں کی وجہ سے یہ آدم خور بن گئی تھی۔

اس شیرنی کے مارے جانے کی خبر پورے علاقے میں ایسی پھیلی جیسے

بن میں آگ پھیل جائے۔ سیکڑوں کی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے اسے دیکھنے کے لیے امنڈ آئے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اپنے اس دشمن کو قریب آکر دیکھے۔ سب ہی لوگ خوشی کے مارے دیوانے ہو رہے تھے۔ خوش ہونے کی بات بھی تھی۔ پورے تین سال کی مدت زندگی اور موت کی کش مکش میں انھوں نے گزاری تھی۔

ایس۔ اے۔ الیف کی اس پارٹی کے لوگوں نے ۱۸ر مئی ۱۹۳۶ء کو چوتھا آدم خور شیر بھی مار ڈالا اور اس طرح پورے تین سال کے بعد دھنورا اور آس پاس کے دیہات کے لوگوں کو ان آدم خور شیروں کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی

پیامِ تعلیم خوش آمدید

سیدہ فرحت

اپنا بچپن یہ ہمیں یاد دلاتا آیا
ذہن میں پھر وہی نقشہ یہ جماتا آیا

بعد مدّت کے نظر آیا پیامِ تعلیم
اپنا محبوب رسالہ تھا پیامِ تعلیم

انتظار اس کا رہا کرتا تھا کس شدّت سے
اس کو ہم پڑھتے تھے کس شوق سے اور رغبت سے

ذوقِ علم اور ادب کا ہے ابھارا اس نے
ذہن روشن کیا بچپن میں ہمارا اس نے

جذبۂ حبِ وطن دل میں کیا ہے پیدا
ہم کو بچپن میں سبق قوم پرستی کا دیا

اس نے مذہب کے بھی مفہوم بتائے ہم کو
اس نے اخلاق کے آئین سکھائے ہم کو۔

ہو مبارک! ہوئی پھر اس کی اشاعت بچّو!
یہ بتائے گا تمھیں علم کی قیمت بچو!

لکھنے پڑھنے کا سلیقہ یہ سکھائے گا تمھیں
کام کرنے کا طریقہ یہ سکھائے گا تمھیں

یہ بتائے گا کہ کیا شے ہے زبانِ اُردو
اس میں آئے گی نظر شوکت و شانِ اُردو

یہ سکھائے گا تمھیں قوم کی خدمت کرنا
جس میں تم رہتے ہو اس دیس سے الفت کرنا

صاف ستھرا یہ تمھیں ذوقِ ادب بخشے گا
تم کو دلچسپی کے سامان یہ سب بخشے گا

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

بھارت درشن

(۲)
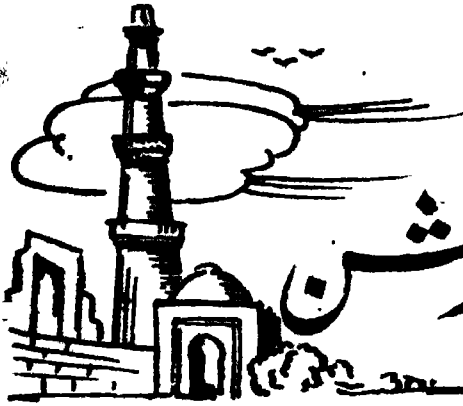
بارھویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں مسلمان آنا شروع ہوئے۔ مسلمانوں کو فن عمارت سے خاص لگاؤ تھا۔ اور مینار، گنبد اور محراب بنانے میں یہ لوگ پہلے ہی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ چینی کے کام اور پچی کاری سے بھی انھیں پوری واقفیت تھی۔ دہلی ترکوں کی راجدھانی تھی اس لیے انھوں نے عمارتیں بنوانے کا کام دہلی ہی سے شروع کیا۔

دہلی میں مسلمانوں کی پہلی عمارتیں مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار ہیں۔ اس مسجد کا لمبا چوڑا صحن، اس کے خوب صورت ستون اور اونچی اونچی محرابیں ہمارے دیس کے لیے نئی چیزیں تھیں۔ چونکہ مسلمان اپنے ساتھ معمار نہیں لائے تھے اس لیے انھیں یہیں کے مقامی ہندو معماروں نے بنایا۔ اس ہندو مسلم ملاپ کا فن عمارت پر بہت خوشگوار اثر پڑا اور بہت جلد ہی ہندوستانی فن تعمیر پیدا ہو گیا۔ قطب مینار کی بناوٹ، اس کا آرائشی کام، اس پر کتبوں کی موجودگی اس ہندو مسلم تعاون کی اچھی مثالیں ہیں۔ مسجد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے مقبروں کے بنانے میں بھی بہت دلچسپی لی۔ شروع شروع میں مقبرہ عام طور پر چوکور ہوتا تھا اور اس

پر ایک گنبد بھی ہوتا تھا۔ گنبد اُلٹے پیالے کی شکل کا ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کی شکل بدلتی گئی اور یہ زیادہ گول اور سڈول بنایا جانے لگا۔ مقبرے بھی آٹھ کونوں والے بننے لگے۔ اسی طرح سے ڈاٹ لگاکر بیچی محراب بنانے کا رواج بھی شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ مغلوں کے زمانے میں فنِ عمارت میں اتنی ترقی ہوگئی کہ انھوں نے تاج محل جیسے خوب صورت روضہ کو تعمیر کردیا۔

مغل بادشاہوں نے اپنی عمارتوں میں آرایش اور خوب صورتی کے لیے باغوں اور نہروں کا اضافہ کیا۔ عمارتیں کرسی دے کر بنائی جانے لگیں، بھورے اور لال پتھر کی جگہ سنگ مرمر کا استعمال بڑھ گیا۔ پچیکاری کا فن مغلوں کے زمانے میں اور زیادہ نکھر گیا۔ گنبد، محراب اور مینار کی شکلوں میں بھی ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ وہ تناسب اور سندرتا کا نمونہ بن گئیں۔ یہ سب باتیں ہمایوں کے مقبرہ میں موجود ہیں۔ اکبر نے فتح پور سیکری کے محلات اور بلند دروازہ بنواکر فن تعمیر کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں سنگ مرمر کے استعمال کے ساتھ ساتھ پچیکاری کی صنعت کو بھی فروغ ہوا۔ شاہ جہاں نے آگرے کے قلعہ میں سنگِ مرمر کی اچھی اچھی عمارتیں بنواکر، دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد تعمیر کرکے اور آگرہ میں تاج محل کو جنم دے کر یہ ثابت کردیا کہ وہ صحیح معنوں میں ہمارے دیس کا "معمار بادشاہ" ہے۔

شاہ جہاں کے بعد مغلیہ طرز تعمیر کی ترقی رُک گئی۔ اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ اس طرف دھیان نہ کر سکے، اس لیے کچھ تو ان مغل بادشاہوں کی بے توجہی کی وجہ سے اور کچھ انگریزوں کے آجانے کی وجہ سے ہمارے دیس کے بدلتے ہوئے حالات کے کارن ہندوستانی فنِ تعمیر کا زوال شروع ہوگیا اور

کچھ ہی دنوں میں لوگ بالکل بھول گئے کہ اجنتا اور ایلورا کے غاروں کو پتھر سے تراشنے والے، مہابلی پورم کے پانچ رتھوں کو جنم دینے والے، ابو پہاڑ پر دلوارا کے مندر میں سنگ تراشی کے کمالات دکھانے والے، قطب مینار اور بلند دروازے کو قائم کرنے والے، دربار صاحب امرتسر اور سینٹ زیویر کا گرجا بنانے والے، تاج محل اور جامع مسجد کو تخلیق کرنے والے، ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے خون پسینہ ایک کرکے فنِ تعمیر کے ان شاہکاروں کو آنے والی نسلوں کے لیے تیار کیا۔ بھارت دیش کے سپوت ہونے کے ناطے سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس تہذیبی دولت کی اپنے بس بھر حفاظت کریں۔ اور محکمہ آثار قدیمہ کی حفاظتی کوششوں میں ہاتھ بٹا کر ان قومی یادگاروں کو اس قابل رکھ سکیں کہ ہمارے بعد آنے والے لوگ ہمارے بزرگوں کے ان شاہکاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں

تنے ہوئے ہیں دونوں
شکاری
خبردار جو ہاتھ لگایا
خبردار جو پنجہ جمایا
لو ہوگئی چھینا جھپٹی
واہ بھئی واہ - کل پرزوں کا چوہا تھا!
دونوں کو مزا آگیا۔
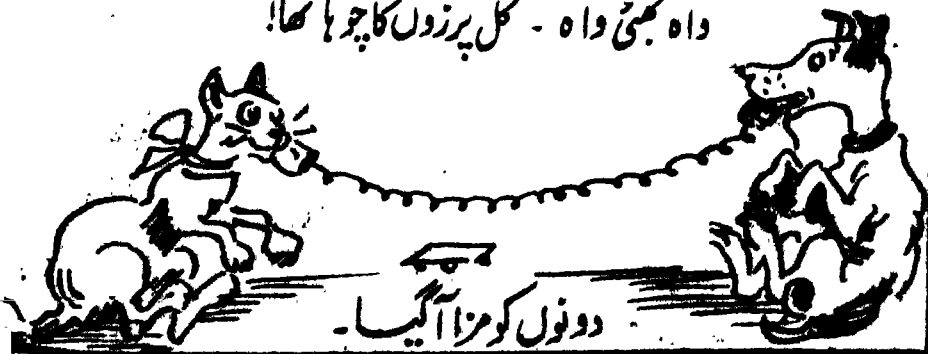
رفیق شاستری

پانی کا بدلہ خون؟

رفیق شاستری صاحب نے یہ کہانی یونسکو کی شائع کی ہوئی ایک کتاب "کمبوڈیا کی کہانیاں" سے اپنائی ہے۔ آج کل اس علاقے کے آس پاس بڑی گڑبڑ ہے۔ آپس میں بڑی تنا تنی ہے۔ بڑی نفرت ہے ایک دوسرے کے خلاف بہت غم و غصہ ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا خون بہانے پر جیسے تلے ہوئے ہیں۔ ہر وقت بڑی لڑائی چھڑنے کا ڈر رہتا ہے۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر خاص انھی علاقوں کی کہانی پیامی دلچسپی سے پڑھیں گے۔ (ایڈیٹر)

یہ مہاتما گوتم بدھ کے زمانے کی کہانی ہے۔ اب سے لگ بھگ دو ہزار برس پہلے کی۔ دو پڑوسی ملکوں میں ایک ندی کے پانی پر جھگڑا تھا۔ دونوں اس ندی پر اپنا حق جتاتے تھے۔ دونوں اسے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ اپنے کھیتوں کی سینچائی کر سکیں۔ آزادی سے اپنے مویشیوں کو پانی پلا سکیں بس اسی وجہ سے دونوں میں آئے دن تو تو میں میں رہتی تھی۔

اس تو تو میں میں اس بحث و تکرار نے دھیرے دھیرے نفرت اور دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ ہوتے ہوتے آپس میں لڑائی کی ٹھن گئی۔ دونوں ملکوں

کو اپنی اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔ دونوں میدان میں اتر کر دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے۔

اسے لیجیے دونوں ملکوں میں لڑائی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں طرف کی فوجیں ہتھیار لگا کر لڑائی کے میدان کی طرف بڑھنے لگیں۔ بڑی تیزی سے آمنے سامنے آ گئیں۔ لڑائی کا بگل بجنے ہی والا تھا اتنے میں اچانک مہاتما گوتم بدھ اُدھر آ پہنچے۔

اتنی بہت سی فوجیں دیکھ کر مہاتما گوتم بدھ کو بہت اچنبھا ہوا۔ وہ حیران تھے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ لڑائی کس بات پر لڑی جا رہی ہے۔ اتنے بہت سے انسانوں کا خون بہانے کا انتظام کیوں کیا جا رہا ہے۔

مہاتما گوتم بدھ نے فوراً دونوں راجاؤں کو بلوایا۔ دونوں اپنے امیروں وزیروں سمیت مہاتما گوتم بدھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

مہاتما گوتم بدھ نے پوچھا کیوں صاحب یہ بہت سے لوگ تیر کمان، نیزے بھالے اور تلوار لیے کیوں کھڑے ہیں؟

ایک کونے سے آواز آئی: "ہم لڑنے آئے ہیں"

مہاتما گوتم بدھ: آخر کیوں؟

ایک راجا صاحب: یہ سامنے کی ندی ہمارے ملک میں ہے۔ یہ ندی ہماری ہے۔ اس کا پانی ہمارا ہے۔ اس پانی سے ہمارے کھیتوں کی سنچائی ہوتی ہے۔ (سامنے کی طرف اشارہ کرکے) ہمارا پڑوسی ملک زبردستی اس ندی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔

دوسرا راجہ: نہیں نہیں یہ ندی ہماری ہے، ہم ہمیشہ سے اس کا پانی پیتے آئے ہیں۔ ہمارے کھیتوں کو اسی سے پانی ملتا ہے۔ اس کے بنا ہماری کھیتیاں سوکھ جائیں گی۔ یہ ندی ہمارے ملک کی جان ہے۔ اس سے پانی لینے

سے ہمیں کوئی روک نہیں سکتا۔
گوتم بدھ نے دونوں راجاؤں سے پوچھا: "تو اس ندی کے پانی کی خاطر اتنے بہت سے انسانوں کا خون بہانا آپ ٹھیک سمجھتے ہیں؟ اچھا ایک بات بتائیے۔ آپ کو انسان کا خون انسان کی جان زیادہ عزیز ہے یا ندی کا پانی؟"
یہ سن کر سب نے چپ سادھ لی۔ کسی کی زبان نہ کھل سکی۔
آخر ایک بوڑھا وزیر دبی زبان سے بولا: "انسان کی جان اور اس کا خون ہمیں ندی کے پانی سے زیادہ عزیز ہے۔"
مہاتما گوتم بدھ نے فرمایا: "تو پھر آپ لوگ اس خون خرابے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ یہ لڑائی ندی کے پانی کے لیے ہے نا؟ مگر انسان کی جان کے آگے اس پانی کی کیا حقیقت ہے! کیا پانی کا بدلہ خون ہو سکتا ہے؟"
ایک دوسرا وزیر بولا: "مگر اس پانی کے بغیر ہم زندہ کیسے رہ سکتے ہیں؟"
مہاتما گوتم بدھ نے فرمایا: "ٹھیک ہے آپ زندہ رہنے کے لیے اس ندی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اپنی زندگی کے لیے آپ کتنی زندگیوں کا سودا کر رہے ہیں؟ آپ کو زندگی عزیز ہے۔ مگر اس کے بدلے موت کو کیوں دعوت دے رہے ہیں؟"
ایک راجا بولا: "روز کے جھگڑوں سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"
فوراً دوسرے راجا نے منہ کھولا: "ہم بھی روز روز کی اس تو تو میں میں سے عاجز آ چکے ہیں۔ ندی کے پانی کے لیے روز جھگڑا فساد ہوتا ہے۔ اب ہم بھی کمر کس کے آئے ہیں۔ ہم اپنے کھیتوں کو اس ندی کے پانی سے محروم نہ ہونے دیں گے۔"
مہاتما گوتم بدھ نے فرمایا: "پر اس لڑائی سے حاصل کیا ہوگا! ظاہر ہے طاقت ور جیتے گا، کم زور ہارے گا۔

ہارنے والے کے دل میں نفرت پیدا ہوگی بدلہ اور انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہ اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش کرے گا بدلہ لینے کی سوچے گا۔ نفرت کا علاج نفرت سے کیا جائے تو مرض بڑھتا ہے۔ یہ نفرت کبھی ختم نہ ہوگی برابر بڑھتی جائے گی، کوئی چین سے نہ بیٹھ سکے گا دشمن کا خوف ہر وقت دل میں بیٹھا رہے گا۔"

یہ سن کر دونوں راجا خاموش ہوگئے۔ بات سمجھ میں آگئی کہ پانی کا بدلہ خون نہیں ہوسکتا۔ دونوں راجاؤں نے اپنی اپنی فوجیں ہٹالیں۔ دونوں میں سمجھوتا ہوگیا۔ نفرت ختم ہوئی محبت اور دوستی کی فضا پیدا ہوئی۔ دونوں ملک آپس میں میل محبت سے رہنے لگے۔

محمد حسین حسان
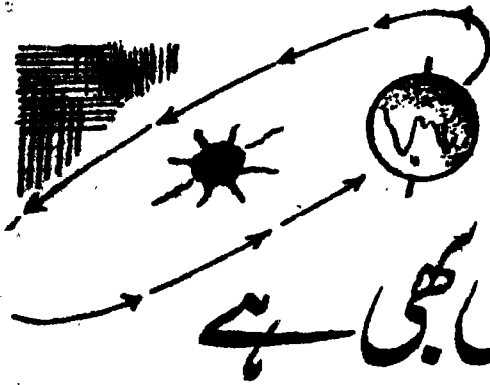
اور زمین گھومتی بھی ہے

آیئے آج آپ کو ایک بات بتائیں ! ہماری زمین ! یہ دھرتی گول ہے ۔ ارے!
آپ تو مسکرانے لگے پر بھئی چاہے آپ مسکرائیں چاہے دل ہی دل میں ہمارا مذاق
اڑائیں ۔ بات تو ہے سچی ۔ یقین نہ آئے تو روس کے گگارن سے ٹی ٹوف سے
میرینا یا پوچ سے اور امریکہ کے گل صاحب سے پوچھ لیجئے ۔ یہ اپنے اپنے
راکٹوں میں آسمان پر بہت اونچائی تک گئے ہیں ۔ انھوں نے اس گولے کو
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔

مگر یہ گولا گیند کی طرح بالکل گول بھی نہیں ہے اتر اور دکھن میں اک
ذرا ذرا پچکا ہوا ہے ۔ بس جیسے خربوزہ ، سیب یا سنترہ ۔

ایک بات اور سنیے آپ کی یہ زمین گھومتی بھی ہے ۔ بالکل لٹو کی طرح گھومتی
ہے ۔ لٹو کو آپ گھماتے ہیں تو کیسا چکر کھاتا ہے ۔ ایک منٹ میں سینکڑوں
بار تو گھوم جاتا ہوگا ۔ مگر ہماری زمین تو بہت بھاری بھرکم ہے ۔ اس بے چاری
کو تو ایک بار گھومنے میں چوبیس گھنٹے لگ جاتے ہیں ۔ یہ دن رات زمین کے
اسی گھومنے کی وجہ سے تو ہوتے ہیں ۔

بھلا وہ کیسے ؟

ایک بات تو آپ جانتے ہیں - دن ہو یا رات سورج تو ہر وقت چمکتا رہتا ہے - اب زمین کے گھومتے وقت اس کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے وہاں روشنی پھیل جاتی ہے دن نکل آتا ہے اور جب گھومتے گھومتے سورج کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے - رات ہو جاتی ہے - دن میں آپ پڑھتے لکھتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں - رات میں آپ آرام کرتے ہیں، میٹھی میٹھی سکھ کی نیند کے مزے لیتے ہیں - تو یہ جو صبح ہوتی ہے، دوپہر ہوتی ہے اور پھر شام ہوتی ہے تو یہ سب زمین کے اسی گھومنے کے کرشمے تو ہیں -

کیا خدا کی قدرت ہے! بے چاری ہمیشہ سے اسی طرح گھومے جا رہی ہے، ایک گھڑی کو بھی آرام نہیں کرتی - اتنا پر بس نہیں - اسی حالت میں سورج کے چاروں طرف چکر بھی لگا رہی ہے - یوں سمجھیے کہ خود اپنی چکی پر گھوم رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سورج کا طواف بھی کر رہی ہے -

پر اس کا یہ چکر ۲۴ گھنٹوں کا نہیں ہوتا پورے ۳۶۵ دنوں کا ہوتا ہے - اتنی دیر میں یہ اپنا چکر پورا کر پاتی ہے - پورے ایک سال یا بارہ مہینوں میں!

مگر بات یہیں تو ختم نہیں ہوتی کیا وجہ ہے جو ہماری زمین پر ہر جگہ موسم ایک سا نہیں - خود ہمارے دیس میں بہت ایر پھیر ہے - ہمالیہ پہاڑ پر خوب ٹھنڈ ہوتی ہے - پہاڑ کی چوٹیوں پر برف جمی رہتی ہے - راجستھان میں کہیں کہیں تو اتنی گرمی پڑتی ہے کہ لوگ بدحواس ہو جاتے ہیں - یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے -

اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے - آپ کی زمین تو گول ہے نا گول! تو بس اس کی وجہ سے سورج کی کرنیں ہر جگہ ایک سی نہیں پڑتیں - کہیں سیدھی پڑتی ہیں کہیں ترچھی پڑتی ہیں -

اچھا ایک بات کیجیے : ایک گلوب لے لیجیے - گلوب کہیے یا زمین کا گولا کہیے ایک ہی بات بات ہے۔ اس گلوب میں اوپر کا حصّہ قطب شمالی کہلاتا ہے - نیچے کا حصہ قطب جنوبی کہلاتا ہے - اور دیکھیے گولے کے بیچوں بیچ ایک خاص لکیر کھنچی ہوئی ہے - اس لکیر کو خطِ استوا کہتے ہیں - پھر اس بیچوں بیچ یا خطِ استوا والی لکیر کے اوپر کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک لکیر اور ہے ، اسے خطِ سرطان کہتے ہیں - اسی طرح کی ایک لکیر خطِ استوا کے نیچے بھی ہے اسے خط جدی کہتے ہیں -

اور ہاں خطِ سرطان کے اوپر بالکل قطب شمالی کے پاس اور خطِ جدی کے نیچے ایک ایک لکیر اور ہے اوپر والی لکیر کو دائرہ قطب شمالی اور نیچے کی لکیر کو دائرۂ قطب جنوبی کہتے ہیں -

اچھا اب ایک اور بات سنیئے : بیچوں بیچ والی لکیر یا خط استوا میں جو علاقے پڑیں گے چاہے وہ کسی ملک کے ہوں وہاں گرمی زیادہ ہوگی - کیوں ؟ ان پر سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں - ظاہر ہے کہ سیدھی کرنیں جہاں بھی پڑیں گی وہاں گرمی زیادہ ہوگی -

اب اس خطِ استوا سے جتنا بھی اوپر جایئے گا یہ کرنیں ترچھی ہوتی جائیں گی - جتنی یہ ترچھی ہوتی جائیں گی اتنی ہی پھیلیں گی اور اتنی ہی گرمی بھی کم ہوتی جائے گی -

لیجیے اپنے گلوب کو اب پھر ذرا گھما کر دیکھیے - یہ دیکھیے کہ خطِ استوا پر کن کون سے ملک پڑتے ہیں - خط سرطان اور خطِ جدی پر کون کون سے ملک پڑتے ہیں -

ہاں ایک بات آپ کو اور بتا دیں یہ لکیریں یا خط فرضی ہیں گلوب پر آپ کو سمجھانے کے لیے کھینچی گئی ہیں - گلوب کے بیچوں بیچ ایک سلاخ

بھی تو ہے۔ آپ کا گلوب اسی پر تو گھومتا ہے اسے دُھرا کہہ لیجیے اور فرض کر لیجیے کہ زمین کے بیچوں بیچ بھی ایسا ہی دُھرا ہے۔

اچھا بتائیے آپ کی زمین جوں کی توں گھڑی کی گھڑی رہتی نہ ہلتی نہ جلتی تو پھر کیا ہوتا؟ ہوتا یہ کہ زمین کا جو حصّہ سورج کے سامنے ہوتا اس پر ہمیشہ روشنی اور گرمی رہتی، اتنی گرمی رہتی کہ کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی طرح دوسری طرف ہمیشہ اندھیرا اور اتنی ٹھنڈ پڑتی اتنی ٹھنڈ پڑتی کہ کوئی چیز پیدا ہی نہ ہوتی۔

اور جو زمین بالکل سیدھی سیدھی سورج کے سامنے ہوتی تب؟

تب نہ موسم میں کوئی ردوبدل ہوتا نہ کہیں دن گھٹتے بڑھتے۔ مگر ایسا ہے تو نہیں! ہماری زمین پر انسان بھی ہیں حیوان بھی ہیں کیڑے مکوڑے بھی ہیں پیڑ پودے بھی ہیں

غرض سبھی کچھ ہے۔ موسم بھی بدلتا رہتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ زمین اپنی کیلی پر ہر وقت گھومتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سورج کے گرد چکر بھی لگاتی ہے۔ دوسرے زمین یا اس کا دُھرا ایک طرف کو کچھ کچھ جھکا ہوا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ساڑھے تیس زاوے جھکا ہوا ہے۔ ان تینوں باتوں کی وجہ سے سورج کا رخ بھی بدلتا رہتا ہے۔ موسم بھی بدلتا رہتا ہے۔ سردی گرمی بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

اب جیسے ہمارے دیس میں گرمی کے موسم میں ایسا لگتا ہے جیسے سورج اتر کی طرف سے نکل رہا ہے۔ سورج کی کرنیں سیدھی سیدھی پڑتی ہیں۔ جاڑوں میں ایسا لگتا ہے جیسے سورج کچھ دکھن کی طرف چلا گیا ہے۔ کرنیں ترچھی ترچھی پڑتی ہیں اور موسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔

۲۱ جون کو زمین کچھ اس ڈھب سے ہوتی ہے کہ اتری قطب شمالی کا جھکاؤ سورج کی طرف ہوتا ہے۔ اور دائرہ قطب شمالی کا علاقہ ۲۴ گھنٹے روشنی میں رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دکنی قطب یا دائرۂ قطب جنوبی کے علاقے میں ۲۴ گھنٹے تاریکی یا اندھیرا رہتا ہے۔

۲۱ جون کو سورج خط استوا (بیچوں بیچ والی لکیر) کے اوپر یعنی خط سرطان کے سامنے ہوتا ہے سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں اس لیے دنیا کے اس حصے میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ دن بڑے راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔

اب خطِ استوا کے نیچے خط جدی کی طرف آئیے۔ یہاں اس زمانے میں راتیں بڑی دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنیں بھی ترچھی پڑتی ہیں۔ اس لیے سردی ہوتی ہے۔

مگر ۲۱ دسمبر کو قطب شمالی کا جھکاؤ سورج کی طرف ہوتا ہے۔ گویا بات الٹی ہو جاتی ہے۔ اور اب قطب جنوبی میں چوبیس گھنٹے اجالا رہتا ہے اور قطب شمالی میں ۲۴ گھنٹے اندھیرا رہتا ہے۔

اس زمانے میں خطِ جدی میں دنیا کا جو علاقہ پڑتا ہے وہاں گرمی کا موسم ہوتا ہے اور خطِ استوا سے اوپر خط سرطان والے علاقے میں سردی ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں دنیا کے اتری حصے میں سردی اور دکھنی حصے میں گرمی ہوتی ہے۔

۲۲ مارچ اور ۲۲ ستمبر کو بیچوں بیچ یا خطِ استوا والے علاقے پر کرنیں سیدھی پڑتی ہیں۔ ہمارے دیس کا موسم خوش گوار ہو جاتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں بھی نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ زیادہ سردی اور ساری دنیا میں دن رات برابر ہو جاتے ہیں۔

۲۱ مارچ سے خطِ استوا سے اوپر

ہیں۔ ہماری زمین کے اتری علاقے
میں راتیں گھٹنے لگتی ہیں۔ دن بڑھنے
لگتا ہے۔ گرمی کا موسم شروع ہوجاتا
ہے۔ قطب شمالی میں بھی ۲۲ مارچ
سے اُجالا ہونے لگتا ہے۔ اور یوں
سمجھیے کہ چھ مہینے یہاں دن رہتا ہے
رات نہیں رہتی۔ ۲۵ ستمبر کو یہاں
رات شروع ہوجاتی ہے۔ ادھر قطب
جنوبی میں دن نکل آتا ہے۔ اس طرح
ان دونوں قطبوں پر چھ مہینے کا
دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی
ہے۔

تو سمجھے آپ! ہماری زمین پر
زندگی کی جو یہ چہل پہل ہے یہ جو
موسم بدلتے ہیں۔ اور یہ جو رات
دن چھوٹے بڑے ہوتے ہیں تو
اس لیے کہ ہماری زمین اپنی کیلی
پر گھومتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سورج
کے گرد چکر لگاتی ہے اور اپنے
دھرے پر ایک طرف کو جھکی
ہوئی ہے۔
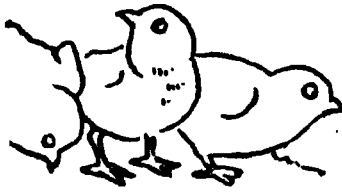
سردی کا موسم فروری کا مہینہ، سویرا ہوا تو بچوں نے دیکھا۔ نیبو کے پیڑ کے نیچے کچھ پڑا ہے۔ پاس گئے تو فاختہ کے دو بچے تھے۔ ایک نے کہا: "میں دیکھوں" دوسری آواز آئی "میں تو دیکھوں"۔ تیسرے نے کہا "کچھ جان معلوم ہوتی ہے" چوتھے بولے "کیا بچیں گے۔ مرجائیں گے"۔

بچوں کی نانی صاحبہ جن کو سب اماں کہتے ہیں۔ پلنگ سے اٹھیں۔ فاختہ کے بچوں کو ہاتھ میں لیا۔ بڑی محبت سے دوسرا ہاتھ ان پر پھیرا۔ پیار کیا اور کہا: "یہ تو زندہ ہیں۔ بچ جائیں گے"۔ بچوں نے کہا: "نہ بچیں گے۔ یہ تو دانہ بھی نہیں چگ سکتے"۔ اماں نے کہا: "تم دیکھ لینا یہ جی جائیں گے"۔ یہ کہہ کر دونوں کو نرمی اور احتیاط سے رزائی کے کونوں میں لپیٹا۔ انگیٹھی جلائی اور جب دہک گئی تو سینکائی کی۔ پیار کی گرمی۔ رزائی کی حرارت انگاروں کی لپک لگی تو آنکھیں کھول دیں۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے بعد اور سب تو ناشتہ کرنے میں لگ گئے لیکن نانی اماں نے ناشتہ تو چھوڑ دیا منہ میں نوالہ لے کر خوب چبایا۔ بچہ کی چونچ کھولی اور ایک ایک دانہ ڈال کر کھلایا۔ کئی گھنٹے بعد پھر رزائی سے نکال کر پیار کیا

اور چونچیں کھول کھول کر دانہ کھلایا۔ شام تک کئی بار ایسا ہی کیا۔ ایک کی حالت تو ٹھیک رہی مگر دوسرے کی بگڑ گئی بچوں کا یقین کہ دونوں مر جائیں گے اور اماں کا اتنا ہی یقین کہ جی جائیں گے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی ہر ایک نے اماں سے فاختہ کے بچوں کی خیریت پوچھی۔ انھوں نے دیکھا تو ایک مر گیا تھا مگر دوسرا بالکل ٹھیک تھا۔ مردہ کو گاڑ دیا گیا زندہ کا نام رکھ دیا گیا منّن۔ جس کی دیکھ بھال اور زیادہ ہوگئی اور دو ایک دن میں منّن چاق چوبند ہوگیا۔ پُھد کنے لگا۔ مگر چارپائی کے آس پاس ہی پُھد کتا اور پھر اماں کے پاس یا ہاتھ پر آکر بیٹھ جاتا۔ بچے صبح شام خیریت پوچھتے اور اماں کو خوش کرنے کے لیے منّن کی تعریف بھی کرتے۔

ہوتے ہوتے ایک دن منّن نے اڑان کی اور نیبو کی ٹہنی پر بیٹھ کر اپنی صحت و آزادی کا اعلان کیا۔ منّن کی اماں بہت خوش ہوکر بولیں: "میرا منّن اڑنے لگا۔" تھوڑی دیر تکتی رہیں اور پھر آواز دی "منّن" سنتے ہی منّن اڑا اور سر پر آ بیٹھا۔ انھوں نے "میرا مٹھوا منّن آ گیا" کہہ کر ہاتھ میں لیا۔ پیار کیا۔

اب تو اڑنا اور بلانے پر آنا منّن کی عادت سی ہوگئی، جیسے جیسے دن گزرتے گئے منّن کی اڑان لمبی اور اونچی ہوتی گئی۔ نیبو سے چھت۔ چھت سے پڑوس کے اونچے درختوں کی ٹہنیوں، ٹہنیوں تمام محلے کا گشت کرتا، لیکن بھوک کے وقت اور رات کے بسیرے کے لیے ضرور آتا۔ اگر دوپہر کو آتا اور وہ سوتی ہوتیں تو پیڑ پر بیٹھ جاتا جاگتی ہوتیں تو خوش ہوکر ہاتھ پھیلاتیں اور منّن جھٹ بیٹھ جاتا۔ بھوکا ہوتا تو سر پر بیٹھ کر چونچ مارتا۔ سوتی ہوتیں فوراً اٹھتیں اور منّن کو اپنے جھولے میں سے نکال کر دانہ کھلاتیں۔

ایک دفعہ منن پردیس کی سیر کو چلا گیا۔ ایسا گیا کہ کئی دن تک نہ آیا۔ بچوں نے پوچھا: "اماں منن کہاں ہے۔ وہ تو اُڑ گیا۔ اب نہیں آئے گا" سب نے کہا "اب کیا آئے گا": اماں نے باہر نکل کر آسمان پر نظر کی بہت سی چڑیاں اُڑ رہی تھیں۔ آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا: "منن تو چلا گیا۔ اتنا خفا مت ہو۔ آجا۔ آجا۔" اور ایک منٹ نہیں ہوا تھا کہ فاختہ کا بچہ مکان کی چھت پر تھا اور چند سکنڈ میں ان کے ہاتھ پر۔ پہلے ان کے پیار کے مزے لیتا رہا۔ اور پھر دعوت کے۔

دال چاول اور تھرپلی تھی۔ گھر میں شادیانے بجنے لگے "منن آگیا۔ منن آگیا۔"

فاختہ پر موقوف نہیں من کی بولی تو ہر ایک سمجھتا ہے۔ کچھ دن بعد بلی کا بچہ پالا گیا۔ جب پوری بلی ہوگیا تو یہ بلی پالنے والی سعیدہ کے ساتھ ساتھ پھرتی۔ کھانا مانگتی تو سعیدہ سے اور شکایت کرتی تو سعیدہ سے۔ ہوتے ہوتے بچے دیے ایک دو نہیں۔ چار! بلی سفید تھی بچے سب چتکبرے۔ سفید کھال پر سیاہ چتیاں۔ ابھی بچوں نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ بلی گھر سے نکلی۔ پڑوسیوں کے مرغے مرغیوں پر حملہ کیا ہوگا۔ کسی نے مارڈالا کیونکہ بلی پھر گھر نہ آئی۔ پہلے ماں کو پالا تھا اب اس کے بچوں کو۔ روئی دودھ میں بھگو کر ان کو دودھ پلایا جاتا۔ ہوتے ہوتے آنکھ کھولنے اور ادھر ادھر پھرنے لگے تو گھر میں خاصی رونق ہوگئی ذرا اور بڑے ہوئے تو نام رکھے گئے کسی کو پہلوان کہا گیا۔ کسی کو پروفیسر کہہ کر پکارا گیا اور کسی کو گوچی۔ اور سب تو محلے کے لوگوں کو دے دیے گئے گوچی گھر ہی میں رہا۔

گھر میں مرغا مرغی بھی تھے۔ مرغیوں کے بچے نکلے تھے۔ جب گوچی بڑا ہوا تو ان پر غراتا اور لپکنا شروع کیا

اور آواز آئی "اب آئے گا مزہ" اور ایک وار ہوا" اجی گوجی کے مزے ہیں مزے۔ کیا کمی ہے۔ چوزے۔ مرغ پلاؤ، جو چاہے حاضر ہے۔"

سعیدہ نے تیور بدل کر گوجی کی طرف دیکھا اور جب گوجی وہاں سے ہلا نہیں تو زور سے کہا "ہائیں گوجی" اور لپک کر گود میں اٹھا لیا۔ دو تین دن یہی رہا کہ ادھر دربے سے مرغا مرغی نکلے اور گوجی کی رال ٹپکی۔ مونچھیں تنیں۔ غوں کرکے جست لگانے کے لیے بدن تولا اور "ہائیں گوجی" کی ڈانٹ دے کر سعیدہ نے گود میں لے لیا۔ پھر گوجی نے نہ غوں کی نہ جھپٹا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ کئی برس ہوگئے مرغا مرغی یہ نہیں جانتے کہ گھر میں بلا ہے اور گوجی کو یہ خبر نہیں کہ گھر میں مرغا مرغی ہیں۔ ہاں یہ پتہ ہے کہ کون اس سے محبت کرتا ہے۔ کس کی گود میں وہ بیٹھ سکتا ہے۔ من کی بولی سمجھتا ہے۔

ہمارے دیس میں پینتالیس کروڑ آدمی بستے ہیں جو اردو۔ ہندی، ٹامل ٹیلگو۔ ملیالم۔ مراٹھی۔ گجراتی، کنڑی بنگالی۔ راجستھانی۔ پنجابی۔ آسامی، سندھی زبانیں بولتے ہیں۔ ٹیلگو بولنے والے ہندی۔ ہندی بولنے والے بنگلہ۔ ٹامل بولنے والے اردو نہیں سمجھتے۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہے۔ ہندوستان سے باہر پوری دنیا میں تین ارب لوگ بستے ہیں، مگر ہسپانوی بولنے والے انگریزی نہیں سمجھتے۔ امریکی عربی۔ ایرانی چینی نہیں سمجھتے۔ غرض دنیا بھر کا یہی حال ہے کہ عام طور سے ایک دوسرے کی بولی نہیں سمجھتے۔

جو کچھ لکھا ہے وہ آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہے۔ پر من کی بولی ہر ایک سمجھتا ہے۔ جب دل سے بات کہی جاتی ہے اس میں محبت کی گرمی

ہوتی ہے - جو دوسروں کے دل کو جاتی ہے
وہ چرند ہو یا پرند یا آدمی - محبت
سے گرماتی ہے - گویا بجلی کی لہر
ہے جو ایک کے دل سے نکل کر
دوسرے کے من میں جاتی اور دونوں

کنکشن ملاکر روشنی، محبت کی روشنی -
دوستی کی روشنی یا انسانیت کی روشنی
پیدا کرتی ہے - تمھارا دل چمک اٹھتا
ہے دوسرے کا دل جگمگا اٹھتا ہے
من کی بولی سے -

جواہر انعامی مقابلہ

آپ اس انعامی مقابلے کا حال " بچوں سے باتیں " میں پڑھ آئے ہیں۔
ہم نے سہولت کے خیال سے مقابلے میں حصہ لینے والوں کے دو گروپ
یا دو جماعتیں کر دی ہیں -

پہلا گروپ : ۶ سے بارہ تک کی عمر کے پیامیوں کا
دوسرا گروپ : ۱۲ سے ۱۷ تک کی عمر کے پیامیوں کا

مضمون خوش خط لکھیے، کاغذ کے ایک ہی صفحے پر لکھیے - رول دار کاغذ پر ایک
سطر چھوڑ کر لکھیے -

بڑوں کا مضمون زیادہ سے زیادہ چار سو الفاظ ، اور چھوٹوں کا مضمون زیادہ سے زیادہ
ڈھائی سو لفظوں سے زیادہ نہ ہونا چاہیے -

پنڈت جی کی پوری زندگی پر لکھیے، ان کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھیے، ان کی زندگی کے کسی
خاص موقع پر لکھیے - اس کی آپ کو پوری آزادی ہے -

۵ / اکتوبر ۱۹۶۴ء تک یہ مضمون دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں -

م ۔ ا ۔ خ

فرماں بردار غوطہ خور

کسی بڑے سے مرغ کے بازو کا ایک بڑا سا پر تلاش کر لیجیے۔ اس کی جڑ کی طرف صاف حصہ بلیڈ یا چاقو سے کاٹ لیجیے اور سوئی کی مدد سے اس کے اندر کا بُرادہ نکال دیجیے۔ اس کے اندر فاؤنٹن پن کے ذریعہ روشنائی بھر دیجیے۔ اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیجیے۔ اندر کی روشنائی سوکھ جائے تو کھلے ہوئے منہ پر آر پار دو آل پن چھید دیجیے۔ اب اس کو پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں ڈالیے۔ ڈوب جائے تو ایک پن نکال کر پھر گلاس میں ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پانی میں کھڑا تیر رہا ہے۔ پن والا حصہ نیچے ہوگا اور بند حصہ اوپر۔ لیجیے آپ کا فرماں بردار غوطہ خور تیار ہو گیا۔

اب ایک ایسی بوتل لیجیے جس کے منہ کو آپ کی پہلی انگلی کا پورا اچھی طرح چھپا لے۔ اس شیشی میں صاف پانی بھر دیجیے اور اس میں غوطے خور کو ڈال دیجیے۔

غوطہ خور تیرنے لگے گا۔ بوتل کے منہ پر انگلی رکھ کر دبایئے اور ساتھ ہی کہیے،
"چلو نیچے" غوطہ خور نیچے چلا جائے گا۔ انگلی کا دباؤ کم کیجیے اور کہیے
"چلو اوپر" غوطہ خور اوپر آجائے گا۔ کئی بار ایسا کرنے کی خوب مشق کر لیجیے۔
پھر اپنے دوستوں اور بھائی بہنوں کو جمع کر کے جادو کا یہ تماشا دکھایئے۔
سب تعجب کریں گے اور خوش ہوں گے۔
ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ آپ اپنے سائنس کے استاد سے معلوم کیجیے۔

---

۶ ۴ ۲ ۱ ۵ ۳
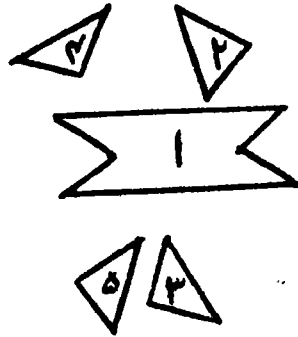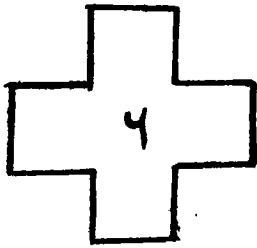
داہنی طرف دی ہوئی شکلوں کے برابر موٹے کاغذ کے پانچ ٹکڑے کاٹ لیجیے۔ پھر ان کو کسی دوسرے کاغذ پر اس طرح رکھیے کہ بائیں طرف دی ہوئی شکل کی طرح بن جائے۔

محمد حسین حسّان

انوکھا چناؤ

(ایک امریکی کہانی)

امریکہ کے ریڈ انڈینس یا لال ہندیوں کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ امریکہ کے اصلی رہنے والے یہی لوگ ہیں۔ پر اب یورپ کے لوگ اس پورے علاقے میں چھائے ہوئے ہیں، یہ بے چارے تھوڑے سے رہ گئے ہیں۔

یہ لال ہندی یا ریڈ انڈین قبیلوں اور جرگوں میں بٹے ہوئے تھے قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا۔ اس کی بات قبیلے کے ہر چھوٹے بڑے، ہر عورت مرد کو ماننا پڑتی تھی۔ اس سردار کا باقاعدہ چناؤ ہوتا تھا۔

آیئے آج آپ کو اس چناؤ کی ایک مزے دار کہانی سُنائیں۔

یہ کہانی لال ہندیوں کے ٹگ دپ قبیلے کی کہانی ہے۔ اس قبیلے کا بوڑھا سردار دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا سردار چننا تھا۔ پر اب یہ چُنا کیسے جائے!

یہ سچ مچ بڑا اہم کام تھا۔ اس کے لیے قبیلے کے تمام سمجھدار اور بوڑھے لوگ اکٹھا کیے گئے۔ یوں کہیے کہ پنچایت جڑی۔

سب لوگ آگئے تو ایک بوڑھے لال ہندی نے یوں بات شروع کی:

"بہادرو! ہم ایک بڑے بوڑھے کو سردار چننا چاہتے ہیں۔"

یہ لال ہندی خود بھی بوڑھا تھا اس کے دانت خوب سفید سفید اور چمکدار تھے۔ لوگوں نے اس کا نام ہی "چٹ دتا" رکھ دیا تھا۔ بے چارہ چٹ دتا نہ جانے کب سے سردار بننے کی آرزو دل میں لیے بیٹھا تھا۔

اب ایک آواز اور آئی

"ہر قبیلے کو ضرورت تو نوجوان آدمی کی ہے۔"

یہ بڑسنگے کی آواز تھی۔ اس کا شمار قبیلے کے جیوٹ اور بہادر جوانوں میں تھا۔ وہ بھی بہت دنوں سے سرداری کا خواب دیکھ رہا تھا۔

چٹ دتے نے فوراً جواب دیا:-

"ہمارا سردار تو کوئی بوڑھا ہی ہونا چاہیے۔ بوڑھا آدمی برسوں کے تجربے کے بعد عقل اور سوجھ بوجھ حاصل کرتا ہے۔ نوجوان کی عقل کچی ہوتی ہے اسے بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔"

بڑسنگا بولا:- "بوڑھے آدمی کی یاد کم زور پڑ جاتی ہے۔ اس کی عقل بھی خراب ہو جاتی ہے۔ وہ سٹھیا جاتا ہے۔ بوڑھا آدمی اچھا شکاری بھی نہیں رہتا۔ وہ لڑائی کے میدان میں بھی اگوا نہیں بن سکتا۔ جوان آدمی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس میں جوش ہوتا ہے۔ ولولہ ہوتا ہے امنگ ہوتی ہے۔ سوجھ بوجھ اور عقل تو کچھ جوانوں ہی کے حصے میں آئی ہے۔"

یہ باتیں سن کر پنچایت کے بڑے بوڑھوں کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے کہا: "یہ لڑکا تو بہت بڑھ

...ھ کر باتیں کر رہا ہے۔ اپنی حد سے آگے
بڑھا جا رہا ہے۔"

ایک بوڑھے نے پوچھا:۔
"تو کیا تمھارے خیال میں عقل
اور سوجھ بوجھ چیٹ دتے کی سب
سے زیادہ نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں بڑسنگے سے زیادہ
نہیں۔"

وہی بوڑھا:۔
"کیا کسی نے چیٹ دتے کو لڑائی
میں ہارتے اور میدان میں پیٹھ دکھاتے
دیکھا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا:۔
"اور بڑسنگے کو کسی نے ڈرا سہما
اور ڈر سے کانپتا ہوا دیکھا ہے؟"

اب خود چیٹ دتا آگے بڑھ کر
بولا:۔ "چیٹ دتے کے خیمے میں
پچاس کھوپڑیاں لٹک رہی ہیں۔ کیا
یہ نوجوان بڑسنگے کے ہاں بھی اتنی
کھوپڑیاں دکھا سکتا ہے؟"

نوجوان نے کڑک کر جواب دیا۔
"چیٹ دتا لڑائی کے پچاس سال
دیکھ چکا ہے۔ بڑسنگے کو پچیس ہی سال
ہوئے ہیں۔ اس کے ہاں ہر سال کی ایک
کھوپڑی ہے۔"

دوسرے بہادروں نے ایک
دوسرے کی طرف دیکھا، بہت سے
لوگ سمجھ گئے کہ بوڑھا چیٹ دتا اور
یہ نوجوان بڑسنگا دونوں سردار بننا
چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر سناٹا رہا،
آخر ایک آواز اٹھی:۔
"تو ہرن قدم کو ہمارا سردار کیوں
نہ بنایا جائے۔ ہمارا پرانا سردار
کہا کرتا تھا: "لڑائی کے میدان میں
ہرن قدم سب سے بہادر سپاہی ہے۔"

ایک دوسری آواز آئی:۔
"ہمارا پچھلا سردار کہا کرتا تھا۔
ہرن قدم قبیلے میں شکار کا سب سے
بڑا ماہر ہے۔ کھوج لگانے میں تو سب
سے آگے ہے۔ اسے سردار بنا لیا گیا تو
خوب شکار ہوگا اور کھانے پینے کی
چیزوں کی ریل پیل ہو جائے گی۔"

"ہرن قدم زندہ باد"
ایک تیسری آواز :-
"ہمارا بوڑھا سردار سورگ کو سدھارا اس کی آتما خوش خوش شکار کے میدان میں گھوم رہی ہے وہ کہہ چکا ہے کہ پنچایت میں سب سے زیادہ عقل اور سوجھ بوجھ کی بات ہرن قدم ہی کہتا ہے"
ایک اور آواز :-
"نہیں نہیں ہم تو بڑسنگے کو اپنا سردار بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے دگوام (خیمے) میں ۲۵ کھوپڑیاں ہیں اور ابھی تو اس کی عمر ہی کیا ہے۔ بڑسنگا ہی قبیلے کا سب سے بہادر سپاہی ہے"
"بڑسنگا زندہ باد"
اور بہت سی آوازوں نے ہاں میں ہاں ملائی :-
"بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک۔ ہم اسی کو اپنا سردار بنانا چاہتے ہیں، وہ بہت اچھا شکاری ہے۔ اور تیوہاروں کے موقعوں پر تو وہ خوب ناچتا ہے"
مگر بہت سے بہادروں نے ایک آواز ہوکر کہا :-
"ہرن قدم کو ہمارا سردار بنایئے ہمارے بوڑھے سردار کی روح شکار کے میدان میں اس کی نگہبانی کرے گی۔ ہرن قدم شکار کے وقت یا لڑائی کے میدان میں قبیلے کی رہنمائی کرے گا تو ہمارے سردار کی روح اس کی رہنمائی کرے گی"
"ہرن قدم زندہ باد"
بڑسنگا بھانپ گیا کہ لوگ ہرن قدم ہی کے حق میں زیادہ ہیں، اس وقت کہیں چناؤ ہوگیا تو ہرن قدم سردار بن جائے گا۔ اور وہ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ اس نے سوچا اس وقت چناؤ کی بات کسی طرح ٹالنی چاہیے۔
فوراً ہی ایک بات اُسے سوجھ گئی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور

پاس آگیا۔ اور بولا:-
"میں نے پنچایت کے سب
دروں کی باتیں غور سے سنیں ۔
ن سب سے سوجھ بوجھ ٹپکتی ہے۔
بیب قریب سبھی کہتے ہیں کہ
میں سے بہت سے لوگ بہادر ہیں،
ہت لڑنے والے سپاہی ہیں ۔ بڑی
سوجھ بوجھ رکھتے ہیں ۔ پر بھلا ہم
ں سے کون بہادر اپنے کو بزدل
احمق بتائے گا۔
"اور جب ہم سبھی بہادر اور سمجھدار
ہیں تو پھر کیوں نہ ایسے آدمی کو سردار
بنایا جائے، جو سب سے مضبوط ہو،
جو لمبی کود میں سب سے آگے بڑھ
جائے جو اونچی کود میں سب سے
اونچا کود نے ۔ جو سب سے تیز
دوڑ سکتا ہو، جو کشتی میں سب کو
پچھاڑ سکتا ہو۔ جس کی کمان کا تیر
سب سے سیدھا جاتا ہو۔ بس ایسے
آدمی کا کھوج لگائیے اور اسی کو
اپنا سردار بنائیے "

سب لوگ ایک دوسرے
کا منہ تکنے لگے ۔ سوچ میں پڑ گئے
کہ بڑ سنگا اپنے کو سردار چنوانے
کے لیے کہیں چال تو نہیں چل رہا
ہے ۔
ایک بوڑھے نے یوں زبان کھولی:-
"کیا قبیلے میں کوئی بہادر ہے جو ہرن
قدم سے اونچا کود سکتا ہو، جو کشتی میں اسے
پچھاڑ سکتا ہو، جو اس سے تیز دوڑ
سکتا ہو۔ جس کا ہاتھ تیر چلانے میں اس
سے زیادہ سدھا ہوا ہو "
یہ بوڑھا بہادر ہرن قدم کا دوست
تھا ۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی:-
" یہ پنچایت اسی لیے تو بلائی گئی
تھی تاکہ سب بہادر مل جل کر، ایک
دوسرے سے مشورہ کرکے ایک نیا سردار
چنیں ۔ ہم میں ایک بہادر، ایک لڑاکو
ایک سپاہی ہے ۔ یہ لڑائی کے میدان
میں ہمارا اگوا بن سکتا ہے ۔ اس کا
نام ہرن قدم ہے ۔ اس الاو کے چاروں
طرف بیٹھنے والے سب بہادر اسے

جانتے ہیں۔ ہم اس وقت اسی کام کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ آیئے ہم سب اسی کو اپنا سردار بنا لیں"۔
(بہت سی آوازیں مل کر: ہرن قدم زندہ باد)
بہت سے لال ہندیوں نے اس بات سے اتفاق کیا۔
مگر بڑستنگا پھر اپنی جگہ سے جیسے اُچھل پڑا اور بولا :۔
"جی ہاں، مگر ہم میں تیز دوڑنے والے بہت سے ہیں۔ بہت سے مضبوط پہلوان ہیں ممکن ہے قبیلے میں ہرن قدم سے اونچا کودنے والے بھی موجود ہوں ایسے بھی ہوں جن کا تیر ہرن قدم کے تیر سے زیادہ سیدھا جاتا ہو۔ ان سب کی ہمیں جانچ کرنی چاہیے۔ ان سب کا ہمیں امتحان لینا چاہیے۔
لیجیے، پنچایت ختم ہوگئی۔ سارے قبیلے میں خبر کر دی گئی ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا :۔
"کل صبح قبیلے کے بہادروں کا مقابلہ ہوگا جو بہادر اس مقابلے میں جیتے گا وہی قبیلے کا سردار چنا جائے گا"۔
(اس مقابلے کی دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں)

اپنے اپاہج ساتھیوں کی مدد

شاکرہ ندیم

سوئٹزرلینڈ یا سوئستان کی جونیئر ریڈ کراس سوسائٹی کے دفتر میں ایک خط آیا۔ لکھا تھا:۔

"میرا نام قیصر بوڈلن ہے میں نے پیغامات ادھر سے ادھر پہنچانے کا کام کرکے پچاس سینٹ جمع کرلیے ہیں۔ پیسہ کمانے کے میں اور بھی کئی ڈھنگ جانتا ہوں....."

یہ خط اس بچے نے ریڈکراس کو کیوں بھیجا اور یہ ۵۰ سینٹ اس نے کس غرض سے جمع کیے ہیں؟ مٹھائی کھانے کے لیے؟ یا سیر و تفریح کے لیے؟

جی نہیں ان میں سے کوئی سی بات بھی نہیں۔

بات یہ ہے کہ سوئستان میں لگ بھگ ۱۰ ہزار بچے اپاہج ہیں۔ یہ چل پھر نہیں سکتے، پر ہماری آپ کی طرح دل تو یہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کا جی بھی سیر و تفریح کو چاہتا ہے۔ جونیئر ریڈکراس نے اسی مقصد کے لیے اب سے ایک سال پہلے چندے کی درخواست کی تھی۔

اس چندے سے ریل کے دو کوچ یا دو ڈبے خریدنے تھے۔ عام ڈبے نہیں

ایسے ڈبے جن میں اپاہج بچے پوری سہولت اور آرام و اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ اور چھٹیوں کے زمانے میں ان میں بیٹھ کر اپنے دیس میں ادھر ادھر کی سیر کر سکیں۔

ایسے ایک ڈبے کی لاگت ۵۰ ہزار ڈالر (تقریباً دو لاکھ پچھتر ہزار روپے) آتی ہے۔

سولستان کے بچوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے اپاہج بھائیوں کے لیے یہ رقم اکٹھا کریں گے جیسے بھی بن پڑے گا ہم روپیہ جمع کر کے ریل گاڑی کے ڈبے اپنے اپاہج بھائیوں کے لیے خریدیں گے۔ انھوں نے یہ بھی طے کیا کہ اس رقم کے لیے اپنے ماں باپ پر بوجھ نہ ڈالیں گے۔ اور انھوں نے اپنے استادوں کی رہنمائی میں سچ مچ نت نئے ڈھنگ اختیار کیے۔ مثلاً موٹریں دھوئیں۔ درختوں کے سوکھے پتے اکٹھا کیے۔ جوتوں پر پالش کی۔ گھریلو کاموں میں عورتوں کا ہاتھ بٹایا۔

دیہات کے بچوں نے باغبانوں کی ماتحتی میں کام کیا۔ چھچھوندر اور چوہے پکڑنے کے رستے بنائے اور فی چھچھوندر دس سینٹ اور فی چوہا پانچ سینٹ کے حساب سے دام وصول کیے۔ امر بیل جمع کی اور گھر گھر اسے بیچنے گئے۔ ایک اسکول کے بچوں کو کسانوں نے آلو اور سیب تحفے اور عطیے کے طور پر دیے۔ بچوں نے انھیں بیچنے کے لیے بڑے پیمانے پر ایک دکان لگائی۔ بچوں کی ایک ٹولی نے تو ایک دن میں بیس ڈالر جمع کر لیے۔

پھر ناچ گانے کی محفلیں کیں۔ نمائشیں لگائیں۔ امدادی فروخت کی دکانیں لگیں غرض اپنی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لیے تمام جتن کر ڈالے۔ اور آپ کو یہ سن کر اچنبھا ہوگا کہ نتیجہ امید سے کہیں بڑھ کر نکلا۔ تین مہینے کی تھوڑی سی مدت میں ستانوے ہزار سات سو ڈالر (تقریباً چار لاکھ اسی ہزار روپیہ) جمع ہو گیا۔ اور کام اسی جوش سے جاری رہا تو چند ہی دنوں میں پوری رقم اکٹھا ہو جائے گی۔ (یونسکو فیچرس)

منّی نے پانی گرم کیا

پانی تو بالکل ٹھنڈا ہے

ابھی تو گرم نہیں ہوا

أ..... و...... و........ ئ

(شنکر)

کھیلوں کی خبریں

ہماری ہاکی ٹیم ۱۷ رجولائی کو اولمپک کھیلوں کے مقابلے میں شریک ہونے کے لیے ہوائی جہاز سے روانہ ہوگئی۔ یہ نیوزی لینڈ ہوتی ہوئی ٹوکیو پہنچے گی۔ اس سال اولمپک کھیل کے مقابلے ٹوکیو (جاپان) میں ہو رہے ہیں۔ یہ مقابلے آخر اکتوبر میں ہوں گے۔ اتنے یہ ٹیم نیوزی لینڈ میں اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کرے گی۔ ٹوکیو پہنچنے سے پہلے غالباً چند میچ ملایا میں بھی کھیل سکے گی۔

ٹیم کے مینیجر اور کوچ (سکھانے والے) کے علاوہ کل اٹھارہ کھلاڑی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

گول کیپر : شنکر لچھمن (فوج) بی اے کرسٹی (بنگال)

بیک : گوربخش سنگھ (بنگال) دھرم سنگھ (پنجاب) پرتھی پال سنگھ (ریلوے)

ہاف بیک : مہندر لال (ریلوے) جگ جیت سنگھ (پنجاب) چرن جیت سنگھ (کپتان۔ پنجاب) راجندر سنگھ (ریلوے)

فارورڈ : جوگندر سنگھ (بنگال) ہری پال کوشک (نائب کپتان. فوج) ادھم سنگھ (پنجاب) درشن سنگھ (پنجاب) علی سعید (بنگال)

اس ٹیم کے کپتان چرن جیت سنگھ صاحب چنے گئے ہیں، یہ پنجاب یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم کے کپتان رہ چکے ہیں۔ بہت ہی تجربے کار کھلاڑی ہیں۔ روم کے اولمپک کھیلوں میں حصّہ لے چکے ہیں۔ فرانس کے شہر لیون میں جو بین الاقوامی مقابلے ہوئے تھے، ہماری ٹیم انھی کی سرداری یا کپتانی میں فائنل جیتی تھی۔

ہاکی کے کھیل میں ہماری ٹیم ہمیشہ نیک نام رہی ہے۔ لگ بھگ تیس سال تک اولمپک کھیلوں میں ہماری ہاکی ٹیم چیمپین شپ حاصل کرتی رہی ہے۔ البتہ پچھلے یعنی ۱۹۶۰ء کے اولمپک کے مقابلے میں میدان پاکستان کے ہاتھ رہا۔ اولمپک کے یہ مقابلے روم میں ہوئے تھے۔

مگر اس مرتبہ ہاکی فیڈریشن کے چیرمین کے کہنے کے مطابق ہماری ٹیم چیمپین شپ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی حقیقت یہ ہے کہ یہ ٹیم بہت ہی سوچ سمجھ کر چنی گئی ہے، اس لیے ہمیں اس سے بہت سی امیدیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ امیدیں پوری ہوں گی۔

پیامیوں کی خواہش ہوئی تو ہاکی پر ایک مفصل مضمون اگلے پرچے میں شائع کیا جائے گا۔

بچوں کی کوششیں

سورج کنڈ کی چڑھائی

پچھلے سال مدرسۂ ابتدائی کے درجۂ ششم کے طالب علموں نے "ہمالہ کی مہم" پروجکٹ چلایا تھا۔ اس پروجکٹ کے سلسلے میں وہ سورج کنڈ کی پہاڑیوں پر چڑھائی کا عملی تجربہ کرنے گئے واپس آکر یہ نظم لکھی مصرع طرح تھا ؎

لو ششم کے کوہ پیما کنڈ کو جانے لگے

لو ششم کے کوہ پیما کنڈ کو جانے لگے ۔۔۔ چوٹیوں پر چڑھ گئے اور دل کو بہلانے لگے ۔۔۔ ناظم الدین ۱۲ سال

لی مدد ڈنڈوں سے سب نے چوٹیاں سر ہو گئیں ۔۔۔ کنڈ کے ٹیلوں پہ چڑھ کر دل کو بہلانے لگے ۔۔۔ افتخار ۱۲ سال

چوٹیوں پر پہنچ کر پھر وادیوں کا رُخ کیا کنڈ کے منظر سے اپنے دل کو بہلانے لگے	محمد شمیم، ۱۳ سال
ہم نے منصوبہ بنایا کوہ پیمائی کریں آٹھ ستائیس ملے کیا دل ہی بہلانے لگے	" " "
راستہ پُر خار تھا اور ندیاں نالے بھی تھے شوق تھا چڑھنے کا سب کے دل بھی گرمانے لگے	ابرار احمد، ۱۳ "
دیکھ کر اس پر فضا ویران سناٹے کو ہم حادثاتِ ننگا پربت ہم کو یاد آنے لگے	نسیم حلیم، ۱۲ "
پاؤں میرا ایک نالے میں وہاں پر پھنس گیا جیسے کرنل ہنٹ دلدل میں نظر آنے لگے	" " "
لی مدد ڈنڈوں سے سب نے اور روانہ ہو گئے گرتے پڑتے اور سنبھلتے کوہ پر جانے لگے	اقبال، ۱۲ "
کوئی پھسلا کوئی اچھلا کوئی اک دم چڑھ گیا آ گیا نالہ اگر تو کود کر جانے لگے	ریاض احمد، ۱۳ "
وادیوں میں کنڈ کی گھومے پھرے جی بھر کے ہم کوہ پیمائی کے جوہر خوب دکھلانے لگے	عنایت اللہ، ۱۲ "
کنڈ جا کر چوٹیوں پر چوٹیاں چڑھنے لگے اور وہاں کے پتھروں سے ٹھوکریں کھانے لگے	خورشید، ۱۲ "
چوٹیاں چٹانیں دیکھیں دل بھی گھبرانے لگے ایک کھڈ میں گر گئے تھے خوب چلانے لگے	رعنا امین ۱۲ "
پھر اٹھے اور اٹھ کے ہم چوٹی کو سر کرنے لگے فتح جب چوٹی ہوئی تو جھنڈا لہرانے لگے	" " "
راستہ میں پڑ گئی تھی جھیل تو ڈرنے لگے شاخ پر چڑھ کر اسے پار کر جانے لگے	" " "
چلتے چلتے تھک گئے تھے پیر بوجھل ہو گئے ایک جگہ پتھر پہ بیٹھے دل کو بہلانے لگے	" " "

دوسری بحر میں بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

چڑھائی ہونے والی ہے بس اب تیار ہو جاؤ
اگر دشواریاں آجائیں تو ہوشیار ہو جاؤ — شعیب، ۱۰ سال

نکالو نیند آنکھوں سے بس اب بیدار ہو جاؤ ہمیں جانا ہے سورج کنڈ ذرا ہوشیار ہو جاؤ ماہ طلعت، ۱۳ سال

اٹھو کشور، چلو، رفعت کھڑی ہو جاؤ اے انجم بہت اونچی چڑھائی ہے ذرا ہوشیار ہو جاؤ " "

روانہ ہو گئے ساتھی پہاڑوں کی چڑھائی کو ارے تم سو رہے ہو کیوں بس اب بیدار ہو جاؤ صفیہ، ۱۲ سال

نہ محنت ہو زیادہ بس ذرا تفریح ہو جائے تھکن اتنی نہ ہو جو پڑھنے سے بیکار ہو جاؤ ماہ طلعت

اگر دشوار راہیں ہیں ڈھلانیں ہیں چٹانیں ہیں ذرا لو کام ہمت سے بس ان کے پار ہو جاؤ شہناز انجم، ۱۰ سال

چڑھائی ہے بہت مشکل بہت سیدھی چڑھائی ہے نہ لاؤ کوئی خطرہ دل میں ان کے پار ہو جاؤ حسن حیدر، ۱۲ "

چڑھائی ہے بہت مشکل مگر آگے بڑھے جاؤ پہاڑوں سے تمھیں ٹکرانا ہے ہوشیار ہو جاؤ علیہ، ۱۴ "

تمھاری ہمتیں اور حوصلے ہوں اس قدر زیادہ اگر ٹھوکر لگے تم کو تو بس ہوشیار ہو جاؤ طاہرا نور، ۱۱ "

چڑھائی کا پروجکٹ ہے ہمالہ کی چڑھائی کا یہاں پر مشق کرنی ہے بس اب تیار ہو جاؤ زبیدہ، ۱۰ "

تمھاری ہمتوں کے امتحاں کا وقت آیا ہے اگر چوٹی پہ جا پہنچو تو اس کا ہار ہو جاؤ عادل منصور، ۱۲ "

تمھاری ہمتوں کے سامنے آسان مشکل ہے اگر برفانی دلدل ہو تو اس کے پار ہو جاؤ منہاج، ۱۳ "

اگر چوٹی کو سر کر لو تو جھنڈے بھی نصب کر دو ادھر فوٹوگرافر یہ کہے تیار ہو جاؤ حامد اللہ، ۱۱ "

چٹانوں پر پہنچ جاؤ وہاں جھنڈا بھی لہراؤ بہے گا خون ہاتھوں سے ذرا اک بار ہو جاؤ فیروز حسن، ۱۱ "

اگر ہو راہ میں جھاڑی کچل ڈالو دبا ڈالو بنا لو اپنا رستہ پھر اچھل کر پار ہو جاؤ شاہدہ، ۱۰ "

چٹانوں سے پھسلنا ہی سنبھلنا اور چڑھنا ہے نمونہ بن کے تینزنگ کا یہی کردار ہو جاؤ رفعت زہرہ، ۱۳ "

سعید:۔ میں اس بار الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہوں۔
حمید:۔ اچھا! تو الیکشن کب ہو رہا ہے؟
سعید:۔ ایک مہینے بعد۔
حمید:۔ ارے اتنے دنوں تک کھڑے کھڑے تھک نہ جاؤ گے؟

استاد:۔ یہ سوالات تم کس سے حل کرا کر لائے ہو؟
معراج:۔ جناب حل تو والد صاحب نے کیے ہیں مگر میں بھی ان کی مدد کرتا رہا تھا۔

جاوید بڑا ہی نٹ کھٹ لڑکا تھا۔ ایک دن اسکول سے گھر واپس آرہا تھا۔ راستے میں ایک امرود والا سڑک کے کنارے امرود کا خوانچہ لگائے بیٹھا تھا۔ دیکھ کر اُسے شرارت سوجھی، امرود والے سے امرود کے دام پوچھے۔ اس نے جواب دیا کہ چار پیسے کے پانچ!
جاوید:۔ دیکھو! پیسوں کی تعداد سے امرود کی تعداد ایک زیادہ ہے۔ اس لیے چار امرود ہوئے تین پیسے کے۔ تین امرود ہوئے دو پیسے کے۔ دو امرود ہوئے ایک پیسے کے۔

اور ایک امرود ہوا صفر پیسے کا یعنی مفت۔ یہ کہہ کر اس نے ایک امرود اٹھایا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ بیچارہ امرود والا حساب ہی لگاتا رہ گیا کہ ایک امرود صفر پیسے کا کیسے ہو گیا۔ (نجلین انجم اشرفی)

پہلا لڑکا:۔ اگر ہم تم سے کہیں کہ تم بہت بُرے لڑکے ہو تو کیا تم مان جاؤ گے؟

دوسرا لڑکا:۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔

پہلا لڑکا:۔ تب تو تم بہت اچھے لڑکے ہو۔

ایک بڑے مجمع میں ایک نیتا جی تقریر کر رہے تھے، تقریر میں سارا زور گیہوں زیادہ اگائیے پر تھا۔

مجمع سے ایک آواز آئی

"اور بھوسے کے بارے میں حضور کا کیا ارشاد ہے؟"

نیتا جی نے کڑک کر جواب دیا: "میں انسانوں کی غذا کے بارے میں بتا رہا تھا، ذرا ٹھہریے آپ کی باری بھی آتی ہے:"

موہن نے اجیت سے دو انڈے اُدھار لیے۔ تین چار دن بعد موہن، ایک انڈا اجیت کے گھر گیا اور بولا: "لو میاں یہ انڈا میں اتوار سوں تم سے قرض لے گیا تھا۔"

اجیت: مگر تم تو دو انڈے لے گیے تھے۔

موہن: ارے ہاں! ٹھیک ہے۔ بھئی معاف کرنا گننے میں غلطی ہوگئی۔

تھانے دار: میں نے پارک میں ردّی کاغذ کبھی اتنے پڑے ہوئے نہیں دیکھے جتنے آج صبح دیکھے، آخر کیا بات ہے؟

سپاہی: حضور چونگی کے چیئرمین صاحب نے کل اشتہار چھپوایا ہے۔ اس اشتہار میں لوگوں سے درخواست کی ہے کہ کاغذ اِدھر اُدھر نہ پھینکیں۔

صحافی

ہندوستانی بچے امریکہ اور سویڈن کے دیہاتی کیمپوں میں

ہندوستانی بچوں کے دو گروپ امریکہ اور سویڈن کے (بین الاقوامی) دیہاتی کیمپوں میں شرکت کے لیے ۱۵-۱۶ر جولائی کو دہلی سے روانہ ہو گئے۔ یہ بچے ان کیمپوں میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے بچوں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے اور دیہاتی زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔ جانے سے پہلے ان بچوں نے نئی دہلی میں ۱۴ر جولائی کو نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے بھی ملاقات کی۔

امریکہ نے ایک اور راکٹ چاند پر بھیجا

چاند کا سفر نہ جانے کب سے ہمارے لیے ایک خواب ہے۔ لوگوں نے اس پر بے شمار کہانیاں لکھ ڈالی ہیں۔ فرضی سفرنامے لکھے ہیں۔ پر اب ایسا لگتا ہے کہ یہ خواب، خواب نہیں رہے گا۔ اور ایک نہ ایک دن

ہم چاند کی سیر کا لطف اٹھائیں گے۔ ہمارے سائنس داں برابر اسی تاک و دو میں لگے ہوئے ہیں۔

روس اور امریکہ کے سائنس دانوں نے تو انھی کوششوں میں رات دن ایک کر دیا ہے۔ چاند کی سطح کا حال معلوم کرنے کے لیے راکٹ پہ راکٹ چھوڑ رہے ہیں۔

اکیلا امریکہ اب تک چھ راکٹ چھوڑ چکا ہے۔ ابھی حال میں ساتواں راکٹ اس نے چاند کی طرف بھیجا ہے۔ ۳۱ر جولائی کو یہ راکٹ چاند کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس راکٹ میں تصویریں لینے کے لیے خاص طرح کے کیمرے لگے تھے۔ ان کیمروں نے دو منٹ کے اندر اندر چاند کی ہزاروں تصویریں اتار لیں۔ یہ تصویریں ٹیلی ویژن کے ذریعے زمین پر بھی نظر آئیں۔ ان تصویروں سے سائنس دانوں کو چاند کے بارے میں بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔

۳۰۰ لڑکوں لڑکیوں نے آزادی کا دن

انوکھے انداز سے منایا

کلکتہ ۱۵ر اگست، کلکتہ کے تین سو لڑکیوں اور لڑکوں نے ۱۵ر اگست کو اپنا خون سنٹرل بلڈ بنیک (خون حاصل کرنے کے مرکزی ادارے) کو دان دیا۔ اور یوں انھوں نے اپنی آزادی کا دن اس انوکھے انداز سے منایا۔ اسٹوڈنس ہیلتھ ہوم نے ان سے اس بات کی درخواست کی تھی۔ ہر خون دینے والے کو دس روپے معاوضہ بھی ملتا ہے۔ یہ معاوضہ ان لڑکوں نے ہیلتھ ہوم کے گشتی اسپتالوں کے چندے میں دے دیا۔ آزاد دیس کے بچوں سے ایسی ہی قربانی کی امید کی جاتی ہے۔

سائبیریا کا موسم بدل دیا جائے گا

آج کل روس کے نوجوان سائبیریا کے علاقے کو ایک صنعتی ملک بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ سائبیریا کے اس پہاڑی

اور جنگلی علاقے کی غیر معمولی سرد ہوا کی وجہ سے لوگوں کی پہنچ یہاں تک نہیں ہو سکی ہے۔ سردیوں میں یہاں پارہ صفر سے پچاس بلکہ ساٹھ ڈگری نیچے پہنچ جاتا ہے۔

روسی سائنس داں کہتے ہیں کہ سائبیریا کا موسم بدل دیا جائے گا اور وہ اس طرح کہ ہمالیہ کے راستے سے سولہ میٹر کی گولائی کی ایک سرنگ سائبیریا تک لائی جائے گی۔ اس سرنگ کے ذریعے ہندوستانی سمندر سے گرم ہوائیں یہاں لائی جائیں گی۔ یہ ہوائیں سرنگ کے ذریعے ہمالیہ کے اس پار آئیں گی۔ اور وہاں سے سائبیریا پہنچیں گی۔ پر ابھی تو یہ ایک خواب ہے دیکھیے کب پورا ہوتا ہے۔

ایورسٹ پر چڑھائی

۱۹۶۵ء میں ایورسٹ پر چڑھائی کی ایک بار پھر کوشش کی جائے گی۔ اس مہم میں ہندوستان کے فوجی جوان حصہ لیں گے۔ لفٹنٹ کمانڈر کوہلی اس مہم کے لیڈر چنے گئے ہیں۔

سائنس کی تعلیم اور فلم

ہندوستان کی حکومت کی ایک تجویز ہے کہ اسکولوں میں دکھانے کے لیے سائنسی فلمیں تیار کرائی جائیں۔ یہ فلمیں آٹھ ملی میٹر کی ہوں گی۔ ساتھ ہی ساتھ ان فلموں کو دکھانے کی سستی مشینیں یا پروجکٹر حکومت بڑے پیمانے پر تیار کرائے گی۔

(پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع

بچوں کے لئے مذہبی کتابیں
ارکان اسلام
مصنفہ
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۴۵ نئے پیسے
عقائد اسلام
مصنفہ
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۵۰ نئے پیسے
آں حضرتؐ
مصنفہ
الیاس احمد مجیبی
۵۰ نئے پیسے
سرکارِ دو عالم
محمد حسین حسان
دو روپے
ہمارے رسول
مصنفہ
سید نواب علی رضوی
قیمت ۷۰ نئے پیسے
ہمارے نبی
مصنفہ
سید نواب علی رضوی
قیمت ۴۰ نئے پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
نبیوں کے قصے
مصنفہ
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت: ۷۰ نئے پیسے
مسلمان بیبیاں
مصنفہ
اعجاز الحق قدوسی
قیمت: ۷۵ نئے پیسے
رسول پاک
عبدالواحد سندھی ۱/۵۰
پاک کہانیاں
دو حصے
مرتبہ مقبول احمد سیوہاروی
قیمت
دو روپے ۱۰ نئے پیسے
خلفاء اربعہ
مصنفہ
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت
ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
چار یار
مصنفہ
الیاس احمد مجیبی
قیمت
ایک روپیہ ۳۰ نئے پیسے

SEPTEMBER 1964

Regd. No.

Payam -i- Taleem

NEW DELHI - 25

پیام تعلیم دہلی

جلد ۱ : اکتوبر ۱۹۶۴ء : شمارہ ۳

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

سالانہ چندہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

فہرست مضامین

بچّوں سے باتیں

کشمیر کے پیام تعلیم کے بارے میں ہمارے بہت سے پیامیوں نے اپنی اپنی رائیں بھیجی ہیں۔ اچھے اچھے مشورے دیے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے پیامی اپنے پرچے کو شروع سے آخر تک بڑے غور سے بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے۔ بہت نیک فال ہے۔

یوں تو رسالے کے سبھی مضمون پیامیوں کو پسند آئے ہیں لیکن "دھنورا کا آدم خور شیر" "مصر کے تہوار"، "جیسے کو تیسا"، "من کی بولی" زیادہ اچھے لگے ہیں۔ بڑے لڑکوں نے "بھارت درشن"، "زمین گھومتی ہے" اور "پانی کا بدلہ خون" کی تعریف کی ہے۔

بہت سے پیامیوں نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ "کھیل کی خبریں"، "اِدھر اُدھر سے" سائنس کے چٹکلے یا دلچسپ تجربے ہر رسالے میں مستقل طور پر آنے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ٹکٹوں کی خبروں کا ایک آدھ صفحہ ضرور ہونا چاہیے۔ وقتاً فوقتاً کسی ایک کھیل پر بھی مضمون ہونا چاہیے۔

اور کبھی ذرا بڑے لڑکوں نے زیادہ تر سائنس اور جغرافیے کے مضامین پر زور دیا ہے۔ کارٹونوں اور لطیفوں کی مانگ تو سب کی طرف سے ہے۔

پیامیوں کے یہ سب مشورے ہمیں دل سے قبول ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دھیرے

دھیرے ہم اور چیزیں بھی بڑھائیں گے اور رسالے کو مجموعی طور پر اتنا مفید اور دلچسپ بنادیں گے کہ مہینے بھر آپ بے قراری کے ساتھ انتظار کریں اور رسالہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے تو بے ساختہ کہہ اٹھیں کہ اہا بھئی ہمارا پیام تعلیم تو دن بدن اچھا ہوتا جا رہا ہے۔

ایک امید اور پیدا ہوگئی ہے۔ غالباً تھوڑے دنوں کے بعد آپ کے پرچے کی لکھائی چھپائی اور سجل ہوجائے۔ تصویریں بھی اچھی چھپنے لگیں۔ بات یہ ہے کہ مکتبہ نے اپنا پریس بھی کھول دیا ہے اور یہ پریس آفسٹ پریس ہوگا۔ مکتبے کے جنرل منیجر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ رسالے کے خریدار زیادہ ہوگئے تو ہم اسے آفسٹ پریس میں چھاپیں گے۔ تو صاحب اب آپ اس کے خریدار بڑھانے کی فکر کیجیے۔ یہ کام تو اب آپ کو کرنا پڑے گا۔

اس پرچے میں آپ کو "ہوم ورک" والا مضمون شاید زیادہ پسند آئے۔ بہت سے پیامیوں کو تو شاید اس میں "آپ بیتی" کا مزہ آئے گا۔ ہمیں امید ہے کہ یوسف ناظم صاحب ایسے مزے کے مضمون آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔

آپ کا اگلا پرچہ ایک طرح سے نہرو نمبر ہوگا۔ اس میں پنڈت جی پر پیامیوں کے انعامی مقابلے والے مضمون ہوں گے۔ کچھ اچھے اچھے مضمین بڑے مضمون نگاروں کے ہوں گے۔ اچھی اچھی نظمیں ہوں گی۔ ہمارے چند بزرگوں نے بھی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس پرچے کی ضخامت بھی زیادہ ہوگی۔

اور ہاں پچھلے پرچے میں ایک بات لکھنے سے رہ گئی تھی اس مقابلے میں اول آنے والے پیامی کو پانچ روپے کی اور دوم آنے والے پیامی کو تین روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔
ہمارے پاس اس مقابلے کے مضمون آنے شروع ہوگئے ہیں، آپ نے اپنا مضمون نہ بھیجا ہو تو فوراً بھیجیے۔ مضمون پانچ اکتوبر تک مکتبے میں پہنچ جائے۔

حضرت خضر برنی

بچّوں کا گیت

من مندر میں بھارت ماں کے بیٹوں کا سنسار
اس کے سپنے رنگ رنگیلے گنگا جمنا دھار
ان دھاراؤں سے بہہ نکلی آشاؤں کی لار
آشاؤں کے دیپ جلائیں جاگ اُٹھے سنگیت
آؤ بچو مل کر گائیں پیار بھرا اک گیت

گیت ہو ایسا نرمل کومل سب کے من کو بھائے
سن پائے جو چمن کا پنچھی اس کا من للچائے
جھوم کے وہ بھی ڈاری ڈاری میٹھے بول سنائے
آشاؤں کے دیپ جلائیں جاگ اُٹھے سنگیت
آؤ بچو مل کر گائیں پیار بھرا اک گیت

ایسا چھیڑیں راگ انوکھا، کلی کلی کھل جائے
جاگ اُٹھیں کھیتوں میں بالیں سارا چمن لہرائے
ناچیں مور، پپیہے چہکیں، نیل گگن مسکائے
آشاؤں کے دیپ جلائیں جاگ اٹھے سنگیت
آؤ بچو مل کر گائیں پیار بھرا اک گیت

یوسف ناظم

ہوم ورک

(یہ خاکہ بھی ہے ڈراما بھی ہے۔ یہ پڑھا بھی جا سکتا ہے۔ سُنا بھی جا سکتا ہے۔ اس میں جمّی کی ممّی، اس کے ڈیڈی، اس کی منہ بولی آنٹیاں، اس کے ماسٹر اور اسکول کے ساتھی بچّے، سبھی موجود ہیں، لیجیے ڈراما شروع ہوتا ہے۔)

ایک کمرہ (جیسا بچوں کے پڑھنے کا کمرہ ہوا کرتا ہے)۔ ایک میز پر ڈھیر سی کتابیں پھیلی ہیں، ٹیبل لیمپ رکھا ہے اور ایک کرسی پر جمّی، دوسری پر ایک کم عمر لڑکا بیٹھا پڑھ رہا ہے)۔

جمّی (اپنے آپ سے)۔ اُفوہ! سات بج گئے سات! اور ابھی مجھے کتنے سوال حل کرنے ہیں۔ پہلا سوال ہی ٹیڑھا ہے۔ پہلے چار ہزار سات سو دس کو اکتالیس سے ضرب دینا ہے۔

اکتالیس صفر صفر۔ اکتالیس اِکن اکتالیس کا ایک، حاصل آئے چار۔ اکتالیس تئے۔

(ممّی کی آواز دور سے) "جمّی، ارے او جمّی ذرا اِدھر تو آنا بیٹا۔"

(ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑاتا ہے)، لیجیے ہوگیا ہوم ورک۔

جمّی:- خدا جانے ممّی کو کیا کام یاد آیا۔

آواز:- جمّی ارے تم کیا کر رہے ہو بھئی۔ سو تو نہیں گئے کہیں؟

جمّی:- آیا ممّی۔ ذرا ہوم ورک کر رہا تھا۔

(آہستہ) اکتالیس ستے ۔ یہ یوں نہیں آئے گا۔ الگ کاغذ پر لکھنا ہوگا۔ ہاں یوں ٹھیک ہے ۔ اکتالیس ضرب سات

آواز: یہ جمی آئے گا تھوڑے!

جمی : سات ایکن سات ۔ سات چوک اٹھا ـــ

ممی : (نزدیک آکر) شاباش ہے ۔ جمی کیا تمھارے اسکول میں بھی تمیز سکھایا جاتا ہے کہ گھروں میں مائیں بچوں کو پکارتی رہیں اور بچے، مزے سے بیٹھے سات چو کے اٹھائیس کرتے رہیں ۔

جمی : میں آ ہی تو رہا تھا ممی ۔

ممی : خاک آرہے تھے ۔ اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ فیروز صاحب کے ہاں جاکر ان کی بیوی سے ان کا وہ سویٹر مانگ لاؤ جس پر سپنولے بنے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہنا کہ ذرا اپنی گیارہ نمبر کی سلائیاں دے دیں ۔

جمی : ممی اب میں کچھ کہوں گا تو آپ بگڑ بیٹھیں گی ۔

ممی : نہیں نہیں فرمائیے میں بھی تو سنوں آپ کیا بہانہ بناتے ہیں ۔

جمی : بہانہ نہیں ممی ۔ مجھے سچ مچ ہوم ورک کرنا ہے وہاں جاؤں گا تو وہ آدھ گھنٹہ مجھے بٹھائیں گی دس کام بھی لیں گی ۔

ممی : تم جاؤ تو سہی ۔ تمھارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے، میں تمھارا ہوم ورک ان سے کروا کے رکھ دوں گی۔

جمی : (اچھل کر) نہیں نہیں ممی ۔ خدا کے لیے ڈیڈی سے ہوم ورک کے لیے نہ کہیے گا ۔

ممی : ارے تو ڈرتا کیوں ہے۔ میں اپنی طرف سے کہوں گی ۔

جمی : ڈروں نہ تو کیا کروں ۔ کل ڈیڈی نے حساب کے سوال نکال کر دیے تھے اور میں بنا دیکھے اسکول لے کر چلا گیا۔ اسکول میں آج میری وہ گت بنی کہ کچھ نہ پوچھیے ۔

ممی : بکتا ہے ۔ میں سب سمجھتی ہوں تیرے بہانے ۔۔ جاتا ہے تو جاؤ ورنہ

میں خود چلی جاؤں گی۔

جمی : لیجیے میں جاتا ہوں ممی ۔ لیکن میرا ہوم ورک یوں ہی رہنے دیجیے ہاں کیا کہا آپ نے ۔ کیریوں والا سوئٹر اور بائیس نمبر کی سلائیاں ؟

ممی : کیریوں نہیں ، پیتولے والا سوئٹر اور گیارہ نمبر کی سلائیاں ۔ بائیس نمبر کی سلائیاں ابھی ایجاد نہیں ہوئیں۔ اب صورت کیا دیکھ رہے ہو ؟ جا بھی چکو اور ہو سکے تو واپس بھی آؤ۔

جمی : میں وہاں ایک منٹ سے زیادہ نہ ٹھہروں گا۔ پر ممی ڈیڈی کو میرے ہوم ورک کی ہوا بھی نہ لگنے دیجیے گا۔ بس میں گیا اور آیا...... ٹا ٹا ۔ (چلا جاتا ہے)۔

ممی : میں بھی تو دیکھوں کل کے ہوم ورک میں کیا کمالات ہوئے ؟ (کاپی اُلٹتے ہوئے) اے ہے یہ تو ساری کی ساری کاپی لال ہو رہی ہے — جبھی تو بچارا ہائے ہائے کر رہا تھا۔

جمی : آنٹی —— آنٹی

آنٹی : ارے کون جمی ! تم وہاں دروازے میں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو اندر آؤ نا ۔ اچھا ہوا تم آ گئے ۔ میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہی تھی کہ وہ آئے تو میرا ہاتھ بٹائے ۔

جمی : آداب آنٹی — ممی نے کہا ہے کہ

آنٹی : ممی نے جو کہا ہے ، وہ تو خیر میں سنوں گی ہی ۔ لیکن تم پہلے (جمی کی آواز ہائے اللہ) رامن صاحب کے ہاں سے میرا چشمہ تو لے آؤ ، میں وہیں بھول آئی ہوں ۔

جمی : آنٹی میں معافی چاہتا ہوں، مجھے بڑی جلدی ہے ۔

آنٹی : اوہو ! بڑی جلدی ہے صاحب زادے کو ! کیوں نہ ہو آج کل یہی تو انڈیا کے پرائم منسٹر ہیں. ارے پانچ منٹ بھی تو نہیں لگیں گے آنے جانے میں جمی صاحب !

جمی : بہت اچھا جاتا ہوں۔

(جانے کی آواز)

آنٹی: دیکھو تو ذرا ان صاحبزادے کی شان! ہم چھوٹے تھے تو خود پوچھ پوچھ کر سارے محلے کے لوگوں کے کام کرتے تھے اور کبھی نہ تھکتے تھے۔

جمی: چل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔ یا اللہ میاں۔ یہاں تو تو مجھے محفوظ رکھیو ــــ آنٹی آنٹی۔ فیروز آنٹی نے اپنا چشمہ منگوایا ہے۔

آنٹی: اے ہے جمی ہے۔ ارے بیٹا باہر کھڑے کیوں چیخ رہے ہو۔ اندر آؤ نا۔ تم ان کا چشمہ لینے کیسے آگئے؟

جمی: میں جلدی میں ہوں آنٹی۔ فیروز آنٹی شائد اپنا چشمہ یہاں بھول گئی ہیں منگوا رہی ہیں۔

آنٹی: کیا تمہاری ممی بھی وہیں ہیں جمی؟

جمی: نہیں میں اکیلا گیا تھا۔ آنٹی چشمہ دے دیجیے تو میں جاؤں!

آنٹی: تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جمی۔ پوسٹ مین کی طرح آتے ہو گیا! ایک چھوٹا سا کام تو کرتے جاؤ۔

جمی: (آہستہ سے) مرگیا۔ (زور سے) آنٹی پُرامت مانیے مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔

آنٹی: ہاں ہاں میں کچھ باندھے تھوڑی لے رہی ہوں۔ پانچ ہی منٹ کا تو کام ہے۔ میں نے گوپال کو اس کے انکل کے ہاں بھیجا ہے۔ اس کا ہوم ورک یونہی پڑا ہے۔ اس کے ڈیڈی بھی ابھی نہیں آئے۔ تو ذرا ایک سوال نکال دے بیٹا۔ تب تک میں تیری فیروز آنٹی کا چشمہ ڈھونڈھ کر لاتی ہوں۔ دیکھ وہ رہی گوپال کی کاپی ــــ

جمی: اپنا ہوم ورک تو کرنے سے رہا۔ چلو یہی سہی۔ سات گھوڑے پندرہ میل کا فاصلہ ۹ گھنٹوں میں طے کرتے ہیں۔ تو ایک گھوڑا۔ یہ فاصلہ کتنے گھنٹوں میں طے کرے گا ــــ (ہنس کر) ارے یہ بھی کوئی سوال ہوا۔ پتہ نہیں ہمارے ماسٹر صاحب ہمیں ایسے سوال کیوں نہیں دیتے ــــ سات گھوڑے ۹ گھنٹوں میں

پندرہ میل چلتے ہیں تو ایک گھوڑا ظاہر ہے ایک گھوڑا اکیلے سات ضرب نو تریسٹھ گھنٹوں میں پندرہ میل چلے گا۔ چلو ایک سوال تو ہوا۔ لو دوست گوپال پانچ نمبر تو کہیں گئے نہیں۔ (زور سے) آنٹی چشمہ مل گیا یا نہیں؟

آنٹی:۔ ابھی لاتی ہوں۔ تم وہ ہوم ورک تو پورا کرلو۔ ورنہ کل بے چارہ اسکول میں نکو بنے گا۔

جمی: (بڑبڑاتا ہے) ہاں ہاں ہماری کسی کو فکر نہیں۔ اسے نہ جانے کہاں بھیج دیا۔ خود آرام سے بیٹھی ناول پڑھ رہی تھیں۔ اب محلہ کے لڑکے، ان کے نٹلو لاڈلے کا ہوم ورک کرتے رہیں۔ میں تو ایک دن ماسٹر صاحب سے کہوں گا کہ بچوں کو ہوم ورک کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر کسی کے گھر میں یونہی بہت کافی کام رہتا ہے۔ پتہ نہیں ماسٹروں کے بچے گھر میں کیا کرتے ہوں گے — ہاں دوسرا سوال تو پہلے سوال سے بھی زیادہ آسان ہے۔ گوپال کے ماسٹر جی شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں — خیر یہ سوال گوپال خود ہی کرے گا۔ (زور سے) آنٹی لائیے چشمہ۔ اب میں چلا۔

آنٹی: شاباش جمی۔ ہوم ورک پورا کردیا نا۔ یہ رہا چشمہ۔ ہاں راستہ میں کمال صاحب کے ہاں کہتے جاؤ کہ میں ان کی لڑکی کی راہ دیکھ رہی ہوں۔

جمی: ہاں ہاں میں ضرور کہہ دوں گا۔ لیکن گھر کے باہر سے ہی کہوں گا۔

ٹاٹا — (دور پہنچ کر) اب اگر میں کمال صاحب کے ہاں گیا تو بس صبح ہی ہوجائے گی — یہاں سے تو چھٹکارا ہو۔ آٹھ تو بج ہی رہے ہوں گے۔ اب خدا معلوم سینیورے والا سوئٹر کب ملے گا۔ ممی کو بھی وہ سوئٹر اسی وقت یاد آنا تھا، جیسے ابھی بنائیں گی اور رات میں پہن کر سوئیں گی۔

جمی: آنٹی یہ رہا چشمہ آپ کا سوئٹر اور سلائیاں دے دیجیے تو میں جاؤں۔

آنٹی: اتنی دیر کہاں لگا دی

تم نے ۔ میری تو آنکھیں دکھنے لگیں ۔
لو یہ سوئٹر اور ممی سے کہنا سلائیوں
پر میرا دوسرا سوئٹر چڑھا ہوا ہے ۔
بازار سے منگوالیں ۔ اور دیکھو سوئٹر کل
شام کو بھیجا دینا ۔

جمی : میں ضرور کہہ دوں گا ۔ اچھا
آداب آنٹی ۔

ممی : لے آئے جمی ! بڑی دیر لگادی
تمہیں تو کہیں بھیجو اور بس بھول جاؤ ۔

جمی : جی ممی وہ تو کہیے میں جلد
آگیا ۔ دو ہی گھر کے تو کام کیے میں نے
انٹی کی مہربانی تھی کہ انھوں نے مجھے
کہیں اور نہیں بھیجا ، اے لیجیے وہ
ڈیڈی بھی آ گئے ۔ (کھنکارنے کی آواز)

ڈیڈی : آج تو بڑی دیر ہوگئی
آفس میں ۔۔۔ جمی ڈیر دیکھو اپنے ڈی سوزا
انکل سے جاکر اتنا کہہ دو کہ ......

ممی : جمی ابھی تو باہر سے آیا ہے
اور اُسے ابھی اپنا ہوم ورک بھی کرنا
ہے ۔

ڈیڈی : ہوم ورک کرنا ہے ۔ اب
تو ساڑھے آٹھ ہونے آئے ۔ اچھا جمی
تم کھانا کھاکر ان کے ہاں چلے جاؤ ۔ میں
کھانے کے بعد تمھارا ہوم ورک کردوں
گا ۔

جمی : مرگیا ۔۔۔ جی اچھا ڈیڈی ۔

ممی : جمی کہہ رہا تھا کہ کل آپ
نے اس کا ہوم ورک کرکے دیا تو آج
اسکول میں اس کی خوب گت بنی ۔

ڈیڈی : ایں ایں ! آخر کیا بات ہوئی

جمی : جی کچھ نہیں ڈیڈی ۔۔۔ لیکن
ڈیڈی میں ہوم ورک خود کرلوں گا ۔ آپ
ابھی تو آفس سے آئے ہیں ۔ کیا کہوں
انکل سے ۔

ڈیڈی : نہیں پہلے بتاؤ ۔ تمھارے
اسکول میں آخر کیا ہوا ؟ میں بھی تو سنوں
اسکول میں ماسٹر کیا کیا کرتے ہیں ۔ اگر
وہ تمھیں یونہی ستاتے ہیں تو میں ہیڈ
ماسٹر سے رپورٹ کروں گا ۔

جمی : نہیں ڈیڈی ۔ ہیڈ ماسٹر سے
کہنے کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی ۔ ہمارے

ماسٹر صاحب......

ڈیڈی : میں پوچھتا ہوں کیا کہا تمہارے ماسٹر صاحب نے؟

ممی : ارے تم تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ پہلے کھانا وانا تو کھا لو۔

ڈیڈی : نہیں ابھی نہیں۔ مجھے زیادہ بھوک بھی نہیں ہے۔ چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ وسکٹ کھائے تھے۔ ہاں جمی بتاتے کیوں نہیں۔

جمی : جی — جی وہ — جی وہ۔

(بچوں کی آوازیں)

ماسٹر صاحب : جمی! یہ سوال تم ہی نے نکالا ہے؟

جمی : جی سر! میں نے ہی نکالا ہے۔

ماسٹر : اپنا سر نکالا ہے۔ پچپن میں سے ڈوگئے تو کیتے رہے۔

جمی : باون سر۔

ماسٹر : باون سر!! پھر یہاں ترپن کیسے لکھے ہوئے ہیں۔ اور ہاں اس صفر کا کیا مطلب ہے جو پانچ کے بائیں طرف لگا ہوا ہے۔ صفر سے کون سا عدد شروع ہوتا ہے جناب؟

(بچے ہنستے ہیں) — جمی یہ سوال سناؤں میں کلاس کو۔ سنو لڑکو۔ جمی صاحب جواب لکھ کر لائے ہیں کہ — جمی لیکن تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنے لائق کیوں ہوتے جا رہے ہو۔ کیا نواسی یوں ہی لکھتے ہیں۔ نو اِدھر اور آٹھ اُدھر۔ ارے صاحبزادے یہ نواسی نہیں اٹھانوے لکھا ہے تم نے۔ اور یہاں جمع کا نشان لکھ کر تم نے تفریق کر رکھی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اکیلا آدمی اتنی غلطیاں بھی کر سکتا ہے۔ کیا کل تم نے گھاس کھائی تھی۔

(بچوں کے ہنسنے کی آواز)

جمی : سر! کل رات! میرے سر میں درد تھا۔

ماسٹر : تمہارے سر میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اچھا تم ذرا بنچ پر کھڑے ہو جاؤ۔

جمی : بنچ پر ماسٹر صاحب؟

ماسٹر : بنچ پر نہیں تو کیا میرے

سر پر کھڑے ہونے کا ارادہ ہے ؟

(بچوں کی ہنسی کی آواز)

جمی : سر میرے پاؤں میں تکلیف ہے ۔ آج معاف کر دیجیے ۔ میں سوال کل ٹھیک کر لاؤں گا ۔

ایک بچہ : سر میں ایک بات کہوں ۔

ماسٹر : فرمایئے ۔

بچہ : جمی کے جس پیر میں تکلیف ہے وہ اوپر کر لے اور ایک ہی پیر پر کھڑا ہو جائے ۔

(بچے ہنستے ہیں)

ماسٹر : خاموش ! ورنہ جمی کو بنچ پر کھڑا کر کے ، بنچ سب کے سروں پر رکھ دوں گا — جمی آج تو معاف کر دیتا ہوں اور تمھاری کاپی پر صرف اتنا ہی لکھتا ہوں کہ تمھارے سر میں بھوسا بھرا ہوا ہے ۔ اور اپنے ابا کو دکھا کر اس پر ان کے دستخط لیتے آؤ ۔ انھیں بھی تو معلوم ہو کہ ان کے ہونہار صاحب زادے کیا کیا کمالات دکھا رہے ہیں — اور یاد رکھو آئندہ اگر تم نے ایسی غلطیاں کیں تو بنچ پر نہیں اسکول کی چھت پر کھڑا کر دوں گا — معلوم ہے ! میرا نام امام بخش ہے ۔

عبدالحلیم ندوی

مصر کے تہوار

(۲)

عیدوفاءالنیل یا نیل کی باڑھ کا تہوار:

مصر میں ایک بالکل الٹا تہوار منایا جاتا ہے۔ سلاب سے کون نہیں ڈرتا، ہمارے یہاں تو باڑھ کے نام سے لوگ کانپتے ہیں، مگر مصری نہ صرف باڑھ آنے کی دعا مانگتے ہیں، بلکہ جب خوب زوروں کا سیلاب آجاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں، اور اس دن کو تہوار کی طرح مناتے ہیں۔

اس تہوار کو عیدوفاءالنیل یا طغیانی نیل کا تہوار کہتے ہیں۔ مارچ اپریل میں دریائے نیل کے اوپری حصہ میں سوڈان دیس سے پرے جو بارشیں ہوتی ہیں' ان کا پانی جمع ہوکر جولائی اگست تک مصر کے علاقے میں پہنچتا ہے، اور دریائے نیل چڑھنا شروع کردیتا ہے۔ آخر اگست میں سیلاب اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ جب سیلاب کا پانی گاؤں، کھیتوں اور ڈیلٹا کی ساری زمینوں کو ڈبو دیتا ہے تو یہ تہوار منایا جاتا ہے، اور بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ نیل کا سیلاب اپنے ساتھ کالے رنگ کی مٹی لاتا ہے۔ مصری اسے طمی کہتے ہیں، جب سیلاب کا پانی کھیتوں میں پہنچتا ہے تو یہ مٹی زمین پر جم جاتی ہے، یہ بڑی زرخیز بڑی اپجاؤ' ہوتی ہے کھاد سے بھی بڑھ کر کام کرتی ہے، چنانچہ سیلاب ختم ہوتے ہی کسان

اپنے کھیت بوتے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں کھیت
لہلہانے لگتے ہیں اور مصری کسان غلّہ اور
روئی سے اپنا گھر بھر لیتے ہیں، اگر یہ سیلاب
نہ آئے تو کھیتوں میں مٹی کی تہ نہ جمے،
اور مصر کی روئی جو دنیا بھر میں مشہور ہے'
پیدا نہ ہوسکے، اس لیے جب یہ سیلاب
آتا ہے تو اس کی بہت خوشی منائی جاتی
ہے۔ مصر کے تمام دفتر، اسکول، کالج،
یونیورسٹیاں سب بند ہوجاتے ہیں، دو بجے
کے قریب کومبری قصر النیل کے پل کے
پاس، نیل کے مشرقی کنارے پر، پانچ
چھ بجرے پھولوں، ہاروں، اور مصری
جھنڈوں سے دلہنوں کی طرح سجائے
جاتے ہیں۔ ان بجروں کو عروس النیل یعنی
نیل کی دلہن کہتے ہیں، سب سے آگے
والے بجرے میں وزیر، سفیر اور مہمان
بیٹھتے ہیں، پچھلے بجروں میں دوسرے
مصری مہمان اور حکومت کے ذمہ دار افسر
بیٹھتے ہیں، آخری بجرے میں گولے، پٹاخے
غبارے ہوتے ہیں۔ ڈھائی بجے تک یہ
بجرے مہمانوں، افسروں، وزیروں، اور
سیفروں سے بھر جاتے ہیں، چھوٹے بڑے لڑکے
لال پیلے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں غبارے
لیے، منہ سے سیٹیاں بجاتے، عرشوں پر
دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ عورتیں گاتی
بجاتی رہتی ہیں، اتنے میں دنا دن'
تین چار گولے چھوٹتے ہیں، اسی کے
ساتھ لاؤڈ اسپیکروں سے مدھر راگنیاں
بلند ہونے لگتی ہیں ایک فوجی سپاہی
زور سے چلاتا ہے، خبردار! ہوشیار!
اتنے میں بجروں کی سیڑھیاں اوپر اٹھائی
جاتی ہیں، اور ان کے دروازے بند
ہوجاتے ہیں، اگلے بجرے کا کیپٹن
مصری جھنڈا ہلاتا ہے، اور تین گولوں
کی آواز کے ساتھ بجرہ چل پڑتا ہے۔
اور اسی کے پیچھے دوسرے بجرے۔ ادھر
بجرے روانہ ہوتے ہیں، ادھر کناروں
سے اتنے گولے داغے جاتے ہیں کہ سارا
شہر قاہرہ گونج اٹھتا ہے۔ جشن سیلاب
کا یہ قافلہ اس دھوم دھام کے ساتھ نیل
کے بہاؤ کے خلاف، دکھن کے رخ
حلوان کی طرف چل پڑتا ہے اور گھنٹہ،

دو گھنٹہ تک گاتے بجاتے، گولے داغتے نیل الروضۃ پہنچتا ہے، یہ جگہ نیل کے ایک مشرقی جزیرہ میں ایک کنارے پر واقع ہے، یہاں پانی ناپنے کی مشین لگی ہے۔ کھیتی باڑی کی وزارت کا نمائندہ، وزیروں اور بعض بڑے سفیروں کے ساتھ اترتا ہے، اور پانی ناپا جاتا ہے۔ جب یہ رسم ہو جاتی ہے تو پھر گولے داغے جاتے ہیں، تھوڑی دیر تک قہوہ اور کوکو کولا کا دور چلتا ہے، اس کے بعد بجرے واپس کیے جاتے ہیں، اور شام کو ۶ بجے کے قریب، کوبری قصر النیل کے پُل کے سامنے آ لگتے ہیں، سیڑھیاں لگائی جاتی ہیں، اور سب لوگ ہنسی خوشی اترتے ہیں اور پاس ہی لگی ہوئی کشتیوں میں کشتی چلانے کے مقابلہ میں شریک ہوتے ہیں، اور سیر کرتے ہیں، سورج ڈوبنے کے بعد حکومت ایک دعوت کا انتظام کرتی ہے۔ سب شہر کے بڑے لوگ، غیر ملکوں کے سفیر، حکومت کے وزیر، اور دوسرے بڑے مہمان شریک ہوتے ہیں اور اس طرح یہ تہوار ختم ہوتا ہے۔

محمد حفیظ الدین

بہادر ماں

سید حسن مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا ایک مشہور افسر تھا۔ اس کی بہادری اور دلیری کی دھاک دور دور تک تھی۔

ایک بار شاہ جہاں نے سید حسن کو مالوے کی مہم پر بھیجا۔ یہاں کے راجاؤں نے خراج یا باج دینے سے انکار کر دیا تھا۔

سید حسن پہلے ہامونی ریاست یا صوبے میں پہنچا۔ وہاں بڑے زور کا رن پڑا۔ دونوں طرف کی فوجیں بڑی بہادری سے لڑیں پر آخر میں سید حسن کا پلّہ بھاری رہا۔ راجہ ہار گیا۔ اس نے صلح کی شرطیں قبول کر لیں۔ اور سید حسن کے دربار میں حاضری دینے کے لیے روانہ ہوا۔

مگر کس شان سے؟ بدن پر سلاح ہتھیار سجائے، گردن اونچی کیے، سینہ تانے، پان چبانے، اکڑتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ ہارنے کے بعد یہ دم خم تھے راجہ صاحب کے۔ یہ اکڑفوں تھی ان کی۔

سید حسن کے خیمے سے ذرا فاصلے پر پہنچے تو دربانوں اور محافظوں نے روک ٹوک کی اور بتایا کہ دربار میں ہتھیار لگا کر نہیں جاتے۔ یہ بات راجہ کو بری لگی۔ سید حسن کو پیغام بھیجا کہ میں آپ کے بڑے دربار میں تن تنہا آ رہا ہوں۔ یہاں آپ کا اتنا بڑا لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ میری حیثیت آپ کے سامنے ایک مچھر سے زیادہ نہیں ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایسی صورت میں مجھ ایسے بے بس انسان کو نہتا ہونے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

سید حسن نے یہ پیام بہت حِلم، بہت بُردباری
ے سنا اور بہت شائستگی سے کام لیا۔ دربانوں
کو حکم دیا کہ راجہ کو اسی حالت میں آنے
دو۔

اور راجہ صاحب اسی طرح اکڑتے
ہوئے چلے آرہے تھے۔ پر آداب گاہ
کے قریب پہنچے تو چوبدار نے للکارا۔
یہ جائے آداب (آداب کرنے کی جگہ)
ہے، یہاں سے آداب کرکے آگے بڑھو۔
پر راجہ نے سنی ان سنی کر دی،
آگے چل کر زیادہ روک ہونے لگی تو بولا۔
یں نے سید بزرگ کی شان میں گستاخی
لی ہے، اپنے گناہوں کی معافی کے لیے
ن کے چرن چھونا چاہتا ہوں"۔
سید حسن نے چوبداروں سے کہا:۔
اجہ کو نہ روکو، آنے دو"۔
پر راجہ صاحب چرن تو کیا چھوتے،
ہی سید حسن کے قریب پہنچے ان کے
تیور بدل گئے۔ جھٹ تلوار کھینچ، بھرپور
ار کر دیا۔ وہ تو کہو سید حسن پہلے سے
ہ رکتا تھا۔ اس نے وار خالی دیا۔

ایک طرف کو ہٹ گیا۔ تلوار گاؤ تکیے
پر پڑی۔ تکیہ دو ٹکڑے ہو گیا۔

اس ناکامی سے راجہ صاحب جلبلا
گئے۔ سنبھل کر دوسرا وار کرنا چاہتے تھے
مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ ایک خنجر نے
ان کا کام تمام کر دیا۔

یہ خنجر شیخ وجیہہ الدین کا تھا۔ آپ
نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام
سنا ہوگا۔ دنیا کے بہت بڑے عالموں میں
ان کا شمار ہے۔ شیخ وجیہہ الدین ان کے
دادا تھے اور شاہ عبدالرحیمؒ کے باپ تھے۔
شاہ عبدالرحیم اس وقت پانچ سال کے تھے۔
یہ معرکہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

سید حسن پر شیخ کی اس دلیری اور ہمت
وجرأت کا بہت اثر ہوا۔ بے اختیار گلے
لگا لیا۔ اس دن سے کوئی کام ان سے
مشورہ لیے بغیر نہ کرتا تھا۔ شیخ وجیہہ الدین
بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

سید حسن کو اسی روز ایک اور ریاست
پر چڑھائی کرنا تھی۔ اس ریاست کا راجہ

بڑا بہادر اور جیوٹ تھا۔ ادھر سے سید حسن کی فوج پہنچی، ادھر راجہ کی فوج تیار کھڑی تھی۔

اتنے میں ایک نہایت ہیبت ناک اور شاندار جوان زرہ بکتر پہنے دونوں طرف دو تلواریں لٹکائے ہاتھوں میں نیزے لیے گھوڑے پر سوار، صفوں کو چیرتا دونوں فوجوں کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ سج دھج بتلا رہی تھی کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔

آنے والے کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور سب کے کان کھڑے ہوئے۔ کہنے لگا "میں اس علاقے کا راجا ہوں۔ یہ لوہے میں ڈوبی ہوئی سینا (فوج) مجھ پر جان چھڑکتی ہے لیکن میں ناحق خدا کی مخلوق کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ میں تنہا کھڑا ہوں تمھارا جی چاہے تو مار ڈالو۔ مگر یہ بہادری اور شرافت کے خلاف ہوگا کہ ایک آدمی پر تم سب پل پڑو۔ اچھا ہو کہ سید حسن اور میرا فیصلہ یہ تلوار کر دے اور اس پر سب راضی ہو جائیں۔"

یہ سن کر سید حسن نے فوراً ہتھیار سنبھالے اور میدان میں آ کودا۔ دونوں نے خوب خوب سپاہیانہ ہاتھ دکھائے۔ ہوتے ہوتے آخر راجا نے ایک ایسا زبردست وار کیا کہ اس کی تلوار سید حسن کی ڈھال کو چیرتی ہوئی دستے تک پہنچ گئی اور دونوں دستوں میں الجھ گئی۔ راجا نے پوری قوت سے اسے کھینچا، تلوار تو نکل آئی پر جھٹکا اس زور کا لگا کہ سید گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر آ رہا۔ ابھی وہ سنبھلنے اور اٹھنے نہ پایا تھا کہ راجا گھوڑے سے کود چھاتی پر چڑھ بیٹھا، چاہتا تھا کہ خنجر سے کام تمام کر دے، پر شیخ وجیہہ الدین نے جو پاس ہی تھے للکارا کہ گرے ہوئے پر وار کرنا جائز نہیں ہے اور خود راجا سے گتھم گتھا ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کر دیا۔

فوج میں غصے کی لہر دوڑ گئی تھوڑی ہی دیر میں بالکل اس کا ہم شکل، اسی آن بان کے ساتھ صفوں میں سے نکلا

اور کہنے لگا "میں مقتول کا بھائی ہوں، چاہتا ہوں کہ میرے مقابلے کے لیے وہی سورما آئے جس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔" شیخ تو تیار بیٹھے تھے دندناتے میدان میں پہنچے۔ یہ شخص بھی فن سپہ گری میں طاق تھا اور قوت و ہیبت میں پہلے سے کم نہ تھا۔ پر شیخ کی تلوار نے اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب ایک تیسرا شخص سامنے آیا، ان دونوں سے زیادہ بھاری بھرکم تن و توش رکھتا تھا۔ ایسا قوی ہیکل تھا کہ دیکھ کر اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہوجائے اور وہ سامنے آتے ہی للکارا کہ میرے بھائیوں کا قاتل مقابلے میں آئے۔

اس پہاڑ سے ٹکرانا آسان نہ تھا۔ پھر وہ تازہ دم تھا غصے سے بھرا ہوا تھا، اور لڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ شیخ تھکے ہارے تھے۔ سانس درست کر رہے تھے اور دم لے رہے تھے۔ مگر مقابلے کے بغیر چارہ نہ تھا مجبور ہوکر میدان میں آئے لڑتے لڑتے یہاں تک نوبت آئی کہ دشمن نے شیخ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور چاہتا تھا کہ جھٹکا دے کر گھوڑے سے کھینچ لے۔ شیخ اب بالکل بے بس تھے مگر حواس قائم تھے، سامنے دیکھ کر چلائے "خبردار! اس بہادر پر پیچھے سے حملہ نہ کرنا۔" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، کوئی نہ تھا، مگر اتنی دیر میں اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ شیخ کے لیے اتنا موقع کافی تھا وہ اب آزاد تھے اور تھوڑی دیر میں اس راجا کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

اب تو دونوں فوجیں غصے سے بے قابو ہوکر آپس میں گتھ گئیں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی حق یہ ہے کہ دونوں فوجوں نے ایک دوسرے کے چھکے چھڑا دیے سید حسن کی قسمت کا ستارہ اونچا تھا۔ راجا کی فوج کو شکست ہوئی۔

فاتح فوج شہر میں گھسی، چپے چپے پر مقابلہ ہوا۔ قدم قدم پر مزاحمت ہوئی۔ بڑی مشکلوں کے بعد شہر پر قبضہ ہوا۔

جب چاروں طرف امن و امان ہوگیا

تو تیسرے دن ایک بڑھیا سید حسن کے فوجی کیمپ میں شیخ وجیہہ الدین کا پتہ پوچھتی آئی اور فوراً شیخ کے ڈیرے پر پہنچا دی گئی۔

وہ شیخ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ چٹ چٹ بلائیں لیں بڑی شفقت اور محبت سے کہنے لگی، "بیٹا! میں تیری بہادری اور دلیری کا سارا حال سن چکی ہوں۔ میدان جنگ میں جو پہلے تین بہادر مارے گئے ہیں۔ میں ان کی ماں ہوں میں اب تک سمجھتی تھی کہ دنیا میں میرے بیٹوں سے زیادہ کوئی دلیر نہیں۔ مگر تو ان سے زیادہ دلیر اور بہادر نکلا۔ آج سے میں تجھے اپنا بیٹا بناتی ہوں۔ میرے ساتھ گھر چل، کچھ دن اپنی اس ماں کے ساتھ سکھ چین سے رہ۔"

شیخ بغیر کسی جھجک کے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ عزیز و اقارب، دوست احباب نے جب یہ دیکھا تو راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور شیخ سے کہا، "اے شیخ تعجب ہے کہ آپ ایسا سمجھ دار اور دانا انسان ایک عورت کی باتوں میں آگیا۔ یہ سراسر دھوکا ہے اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر آپ یہ بھول گئے کہ جس کے دل پر تین بیٹوں کا داغ ہو وہ اپنے بیٹوں کے قاتل کو لے جا کر کیسے سکھ سے رکھے گی؟"

شیخ نے کہا، "میں کسی کی نہ مانوں گا میں آدمی کو خوب پہچانتا ہوں اس کی بھولی صورت اور بے لوث باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سچی اور راست باز عورت ہے۔ میں اس کا بیٹا بن چکا ہوں اور اس کے گھر جاؤں گا۔"

یہ خبر کسی نے سید حسن کو پہنچا دی وہ دوڑے دوڑے آئے اپنی محبت کا واسطہ دیا، طرح طرح سے سمجھایا، جب کوئی بات پیش نہ گئی تو ایسی قسمیں دیں کہ انھیں رک ہی جانا پڑا، بڑی بی کو علیحدہ لے جا کر کہا: "ماں میں اس وقت بے بس ہوں۔ تم دیکھتی ہو کیسے نرغے میں ہوں، مگر یقین جانو میں تمھارے گھر ضرور ضرور آؤں گا اور تمھارے ساتھ

چند روز رہوں گا۔ یہ ایک مسلمان کا وعدہ ہے مسلمان کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتا"۔ بڑی بی افسردہ و مغموم واپس لوٹ گئیں۔

کچھ وقت بیت گیا لوگ یہ بات بھول بھال گئے، ایک روز شیخ اٹھے اور سیدھے بڑی بی کے گھر کی راہ لی۔ بڑھیا کو معلوم ہوا کہ آج اس کا منہ بولا بیٹا اس کی ارمانوں کی دنیا آباد کرنے آرہا ہے تو اسے لینے بڑھی، بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ گھر لائیں قیمتی فرش پر بٹھایا۔ کبھی اس کی بلائیں لیتیں کبھی اس کی دلبری کا ذکر کرکے واری جائیں۔ تین روز یہ بیٹا ماں کے گھر رہا ماں نے جی بھر کر دیکھا باتیں کیں، خوب خاطر تواضع کی۔ آخر واپسی کا وقت آیا تو بے دلی سے اجازت دی اور اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔

شاہ عبدالرحیم صاحب بچے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنی حقیقی دادی کو نہیں دیکھا تھا۔ میں ان بڑی بی کو دادی سمجھتا تھا، ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ میں جب انھیں دادی کہہ کر پکارتا تو وہ باغ باغ ہو جاتی تھیں۔

یہاں یہ بات بھی جتا دینا بے موقع نہیں کہ ایسا نہ تھا کہ بڑی بی کو اپنے دوسرے بچوں سے محبت نہ رہی ہو، ماں کی ممتا کو کوئی چیز بھی مٹا نہیں سکتی۔ پھر یہ کیا بات تھی؟ بیٹوں کا قاتل کیوں اتنا پیارا ہو گیا؟ بات اصل یہ ہے کہ جو لوگ حوصلے والے ہوتے ہیں جن کے کردار اونچے اور اخلاق بلند ہوتے ہیں وہ ذات پات، دیس، ودیس، گورے کالے کے بھید بھاؤ میں نہیں پڑتے۔ رشتہ اور دوستی کی پاسداری نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک خوبی جہاں بھی ہو خوبی ہے۔ نیکی جہاں بھی ہو۔ نیکی ہے شرافت جہاں بھی ہو شرافت ہے۔

روشن ستارے

سید منیر الحسن

جو کرتے نہیں ہیں کسی سے بُرائی
انھیں نے تو دنیا میں عزت ہے پائی
شریف ان کو کہتی ہے ساری خدائی
انھیں زیب دیتی ہے ہر اک بڑائی
ہر اک شے نے رونق انھیں سے ہے پائی
انھیں نے ہے نیکی کی مشعل جلائی

وہ ہرگز کسی سے جھگڑتے نہیں ہیں
کوئی لاکھ بگڑے بگڑتے نہیں ہیں
الجھتے نہیں اور لڑتے نہیں ہیں
وہ ہرگز کسی سے اکڑتے نہیں ہیں
کسی بے خطا کو پکڑتے نہیں ہیں
کسی کے بھی پیچھے وہ پڑتے نہیں ہیں

بھلائی کا ہر وقت دم ہیں وہ بھرتے
نہیں بیٹھے پیچھے بُرائی وہ کرتے
ہر اک سے ہیں پہلے وہ آداب کرتے
سر راہ جب ہیں کہیں سے گزرتے
کڑی مشکلوں سے نہیں ہیں وہ ڈرتے
یہی لوگ ہیں زندگی میں اُبھرتے

ہے نیکی ہی ہر وقت اک کام ان کا 	محبت سے لے گا ہر اک نام ان کا
یہی شغل ہے صبح اور شام ان کا 	بھلا کیسے بگڑے گا پھر کام ان کا

زمانہ میں پھیلے گا پیغام ان کا
ہر اک راہ ان کی ہر اک گام ان کا

یہی نیک بچے خدا کے ہیں پیارے 	ابھی سے بنے ہیں یہ روشن ستارے
بلندی پہ پہنچیں گے سارے کے سارے 	بتلاتے ہیں مجھ کو یہ ان کے اشارے

یہ دنیا کی زینت زمیں کے ستارے
منیر ان کو اچھا نہ پھر کیوں پکارے

تو جانیں......

(یہ نظم مدرسہ غازی کے ایک لڑکے نے [illegible] پر سورج چاند کا نشان دیکھ کر لکھی تھی)

نئی یہ زمیں ہو نیا آسماں ہو
نیا اپنا [illegible] نئی روشنی ہو
نئی صبح ہو اور نیا [illegible] ہم پہ چھائے
جہاں پر نفاق اور نفرت نہ پاؤ!
جہاں سے غم و درد و [illegible] مٹ [illegible]
[illegible]
فسادی کو [illegible]
[illegible]

نئی اپنی دنیا بناؤ تو جانیں
بنا اس کا عالم بناؤ تو جانیں
نغمہ گیت الفت کے گاؤ تو جانیں
تم اپنی ہی سحر میں جاؤ تو جانیں
اصول محبت سکھاؤ تو جانیں
نئی دھن میں بنسی بجاؤ تو جانیں
[illegible] میں اپنی [illegible] تو جانیں
[illegible] بجاؤ تو جانیں

علیم بیگ [illegible]
جماعت نہم

جمال اختر (مدرسہ ثانوی)

مدرسہ ثانوی جامعہ کا الکشن

ہمارے مدرسے (ثانوی) میں ایک انجمن ہے۔ اس انجمن کا نام مجلس طلبا ہے۔ اس انجمن کے عہدے دار یا نمائندے ہر شروع سال میں الکشن کے ذریعے چُنے جاتے ہیں۔ اس الکشن میں مدرسے کے تمام لڑکے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے ہیں۔

اس سال بھی ہم گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد گھر سے واپس آئے تو اور دوسری دلچسپیوں کے ساتھ الکشن کے لیے بھی کانا پھوسی شروع ہوگئی تھی اور الکشن سے ایک مہینے پہلے تو لڑکوں نے باقاعدہ مہم بناکر یہ کام شروع کردیا تھا۔

جوں جوں الکشن کے دن قریب آتے گئے، ساتھیوں کا جوش بڑھتا گیا۔ مدرسے کی چھٹی کے اور پڑھائی کے کاموں سے چھٹی پانے کے بعد ساتھی زیادہ تر اپنا وقت کنویسنگ میں اور ووٹروں کو سمجھانے بجھانے میں لگاتے تھے۔

اس مرتبہ صرف دو پارٹیاں مقابلے میں آئیں اور دونوں کے ہمدردوں اور ساتھیوں نے اپنی اپنی پارٹی کو جتانے کے لیے زمین وآسمان ایک کردیا۔ دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ ایسے زوردار نعرے لگتے تھے کہ ساری آبادی گونج اٹھتی تھی۔

الکشن سے کچھ دنوں پہلے ایک عام جلسہ ہوتا ہے۔ اس جلسے میں سب امیدواروں کے نام پیش کیے جاتے ہیں۔ امیدواروں

کو بھی اس جلسے میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہ نام زدگی کی گویا آخری تاریخ ہوتی ہے ۔ اس کے بعد کوئی امیدوار اپنا نام واپس نہیں لے سکتا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ۔ اس مرتبہ صرف دو پارٹیوں نے اپنے اپنے امیدوار پیش کیے ان امیدواروں کے نام یہ ہیں :-

نائب صدر :	اکرام الحق	ظفر اقبال
سکرٹری :	امین احمد خاں	شہاب الدین
مدیر امنگ :	عائشہ خاتون	عزیز اختر
مدیر المصور :	جمال اختر	عبدالغفار
ناظم کتب خانہ :	گیان پرکاش	سلطان الرشید
ناظم کھیل :	ذوالفقار حسین	صدرالدین

لیجیے ۱۳ر اگست کو الکشن ہے ۔ گنے چنے دن رہ گئے ہیں۔ پوسٹر تیار ہوچکے ہیں ۔ چارٹ بن رہے ہیں۔ کارٹونوں کی ڈرائنگ ہو رہی ہے ۔ ان میں سے کچھ تو ایسے دلچسپ اور خوب صورت ہیں کہ ساتھیوں کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے ۔ یہ سب انھوں نے اپنی طبیعت اپنی اپج سے بنائے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الکشن کے جوش میں ان کی ساری صلاحیتیں ابھر آئی ہیں۔ ہاں دونوں پارٹیوں کی طرف سے چھپے ہوئے کارڈ بھی تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ ان میں اردو یا انگریزی میں کابینہ یا عہدے داروں کے نام ہیں۔

ہوتے ہوتے ۸ر اگست کی رات آگئی ساتھیوں کا جوش وخروش اپنی انتہا پر ہے ۔ اسکول کے کونے کونے میں پوسٹروں کی، چارٹوں کی بھرمار ہے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے آرٹ کی نمایش ہے اور بہت بڑا میلا لگ رہا ہے ۔

الکشن کی صبح کو الکشن کے سلسلے کا آخری پروگرام ہوتا ہے یعنی جلسہ ہوتا ہے اور اس جلسے میں دونوں پارٹیوں کے امیدوار خوب جوشیلی تقریریں کرتے ہیں۔ ووٹروں کے سامنے اپنے اپنے پروگرام پیش کرتے ہیں، انھیں بتاتے ہیں کہ اگر انھیں کامیاب بنایا گیا تو وہ اپنے ساتھیوں کی بھلائی اور فائدے کے لیے کیا کیا کام کریں گے۔

ان تقریروں کا الکشن پر بہت اثر پڑتا ہے۔

آخر امتحان کا وقت آگیا۔ ووٹ پڑنا شروع ہو گئے، ہر ووٹر کو ووٹ ڈالنے کا حق ہے۔ دونوں پارٹیوں کے الگ الگ بکس ہیں۔ بہت باقاعدگی سے ووٹ پڑ رہے ہیں۔ نگرانی کے لیے دونوں پارٹیوں کا ایک ایک نمائندہ موجود ہے، پرانی کابینہ کے دو عہدے دار بھی موجود ہیں۔

تین بجے سہ پہر کو نتیجہ نکلنے والا تھا۔ ساتھیوں کو جلدی تھی۔ بڑی جلدی کہ جس قدر جلد نتیجہ معلوم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ امیدواروں کی بے چینی تو نہ پوچھیے۔ پر وہاں تو ابھی ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی اور پرانی کابینہ کے دو ممبر موقع پر موجود تھے۔

آخر ٹھیک تین بجے دروازہ کھلا نتیجہ سنایا گیا۔ اکرام الحق کی پوری پارٹی جیت گئی تھی۔ اف فوہ! اس وقت کے جوش و خروش کی نہ پوچھیے۔

اکرام الحق کے ساتھیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا، ہاری ہوئی پارٹی بھی اس سے الگ نہیں تھی۔ یوں سمجھیے کہ اس وقت دو پارٹیوں والی بات ختم ہو گئی تھی سب ایک تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔

اس الکشن کے سلسلے میں مجھے کئی فائدے نظر آئے۔ ایک تو دلچسپی ہی دلچسپی میں الکشن لڑنے کے بہت سے طور طریقے معلوم ہو جاتے ہیں، دوسرے اس گہما گہمی میں بہت سے طالب علم ایک دوسرے سے قریب آجاتے ہیں۔ انجانے ساتھی ہم نوالہ وہم پیالہ بن جاتے ہیں۔ نئی نئی دوستیاں نئے نئے تعلقات قائم ہوتے ہیں، الکشن کے زمانے میں دونوں پارٹیوں کے کچھ لوگوں کو ایک دوسرے سے کچھ شکائتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر الکشن کے بعد سب ایک ہو جاتے ہیں۔ گلے شکوے ختم ہو جاتے ہیں۔

مس فریدہ خاتون

ٹیڈی بیر

دن کے کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ باورچی خانے میں اچھا خاصا شور ہو رہا تھا۔ اچھی خاصی چیخ پکار مچی تھی۔

ابا جان باہر برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس چیخ پکار سے انھیں الجھن سی ہو رہی تھی۔ اتنے میں ایک آواز آئی۔

"سنتے ہیں! ذرا ان بچوں کو اپنے پاس بلا لیجیے۔ کھانا پکنے میں ابھی کچھ دیر ہے — ان نالائقوں نے میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔"

"اوہو یہ بات ہے۔" ابا جان مسکرا دیے۔ سب بچوں کو اپنے پاس بلا لیا اور نیر صاحب کی کتاب "بچوں کی نظمیں" اور انگریزی کی نظموں اور کہانیوں کی کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں سنانے لگے۔ کہانیوں کی ایک کتاب میں ایک ننھی سی بچی کی بڑی پیاری سی تصویر تھی۔ یہ کسی جانور کا ننھا منا سا بچہ باہوں میں لیے سو رہی تھی۔

"اوئی" ننھی رابعہ نے ناک سکوڑ کر کہا:۔ "بھلا جنگلی جانور کو ساتھ لے کر سونے کا کیا تک ہے جو کاٹ کھائے تو! ہم تو بھیا اپنی گڑیا کو لے کر سوتے ہیں۔" اس نے اپنی گڑیا کو کندھے سے لگا کر کہا۔

"آخر یہ ہے کون سا جانور ابا جی؟"

قدیر نے پوچھا۔
"یہ ریچھ کا بچہ ہے بیٹا۔" ابّا جان نے کہا۔ "اسے انگریزی میں 'ٹیڈی بیر' کہتے ہیں۔"
"ہم تو اب تک یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ریچھ کو انگریزی میں بیر کہتے ہیں" بڑے بھائی شوکت نے کہا: "پر اب معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ "ٹیڈی" بھی جوڑنا ہوتا ہے۔"
ابّا نے سمجھایا: "نہیں بچو، ٹیڈی تو امریکہ کے پچھلے صدر تھیوڈور روزویلٹ کا پیار کا نام ہے۔ ہر ریچھ کے ساتھ ٹیڈی کا لفظ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آج کل تو ٹیڈی بیر کھلونے کو کہتے ہیں وہی جسے یہ بچی لے سو رہی ہے۔"
"توبہ، توبہ" رابعہ نے ملامت بھرے لہجے میں کہا: "کتنی بُری بات ہے۔ بھلا اپنے صدر کو کوئی ریچھ کہتا ہے! ہم تو اللہ بخشے اپنے وزیرِ اعظم کو نہرو چاچا کہتے تھے۔"

ابّا نے ہنس کر کہا: "نہیں بیٹا یہ بات نہیں۔ اچھا آؤ میں تمہیں بتاؤں۔ ریچھ کے اِن کھلونوں کے ساتھ "ٹیڈی" کیوں جوڑا جاتا ہے؟
امریکہ کے صدر تھیوڈور روز ویلٹ بہت اچھے شکاری تھے۔ ایک بار وہ دریائے مس سی سپی پر ریچھ کے شکار کے لیے گئے۔"
اتنا کہہ کر انھوں نے پوچھا: اچھا بتاؤ مس سی سپی کہاں ہے؟"
"شمالی امریکہ میں۔" شوکت نے جواب دیا۔ "کیوں ابّا جی یہ سب سے بڑا دریا ہے نا؟"
"جی نہیں۔" قدیر نے جلدی سے کہا: دریائے مسوری مس سی سپی سے زیادہ لمبا ہے۔"
ابّا جان اس جواب سے خوش ہوئے اور شاباشی دی۔ پر بی رابعہ نے پھر ناک سکوڑی۔ اپنی چھوٹی بہن کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور بولیں "چلو منّو، باورچی خانے چلیں۔ یہاں تو وہی کلاس

کی باتیں دُہرائی جا رہی ہیں۔"

ابا نے دونوں کو پکڑ کر بٹھا لیا اور کہنے لگے :- اچھا بھئی پورا قصہ سنائے دیتے ہیں۔ لو سنو :-

ہاں تو امریکہ کے صدر تھیوڈور روز ویلٹ ایک بار دریائے مس سی پی پر ریچھ کا شکار کھیلنے گئے۔ وہاں انھیں ریچھ کا ایک بچہ نظر آیا۔ آدمی رحم دل تھے۔ اس کا شکار کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی رحم دلی کی یہ خبر اخباروں میں چھپ گئی۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی دنوں بعد روز ویلٹ کسی شادی میں گئے۔ وہاں میزبان نے چھوٹے چھوٹے ریچھ کے کھلونوں سے میز سجا رکھی تھی۔ بھلا کس لیے؟ —— اچھا تم بتاؤ رابعہ۔"

" تاکہ میز پر بھی شکار کھیلنے کا مزہ آجائے۔"

سب ہنس پڑے ابا بھی مسکرا دیے انھوں نے شوکت سے کہا :- اچھا تم بتاؤ

شوکت نے جواب دیا : "شاید وہ روز ویلٹ کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ اس واقعے کو جانتے ہیں اور ان کی رحم دلی سے متاثر ہیں۔"

" شاباش۔" ابا سچ مچ بہت خوش ہوئے اور بولے : تھیوڈور روز ویلٹ میز پر اتنے بہت سے کھلونے دیکھ کر مسکرانے لگے اور بولے :- آپ لوگ جانتے ہیں ریچھ کے شکار کی مجھے کافی مہارت ہے۔ پر اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کھلونوں کو کیا نام دوں؟"

اچانک ایک مہمان نے حاضر جوابی سے کام لیا اور کہا، کیوں نہ انھیں "ٹیڈی بیر" کہا جائے؟"

ابا نے سب بچوں کی طرف دیکھا۔ بچوں کو یہ بات جان کر خوشی ہوئی۔ پر بی رابعہ ناک سکوڑ کر بولیں :- "بھئی اس مُوئے ٹیڈی بیر سے تو یہ ہماری گڑیا ہی بھلی۔"

اپنے منہ کی کھائے

محمد یوسف

ایک جگہ پر ایک مکان تھا — اس کی بغل میں پیڑ لگا تھا
پیڑ پہ اک چڑیا رہتی تھی — رنگ ہرا تھا چونچ ہری تھی
اس کے دو ننھے بچے تھے — اڑ سکتے نہ چل سکتے تھے
پاس ہی اک بلی رہتی تھی — تھی مغرور، بہت بنتی تھی
اک دن وہ چڑیا سے بولی — "بول مری صورت ہے کیسی؟"
چڑیا نے دل میں یہ سوچا — بات کہوں کیا ۔ اب کیا ہوگا
گر یہ کہوں وہ ہے بدصورت — دل میں بڑھے گی اس کے کدورت
بچوں کو کھا جائے گی وہ — مجھ کو اور ستائے گی وہ
پھر وہ بولی "سنیے بی بی — آپ کی صورت سب سے اچھی
چاند میں بھی یہ نور نہیں ہے — آپ سی کوئی حور نہیں ہے"
بلی نے تعریف سنی جب — مارے خوشی کے پھول گئی تب

ناچی خوب مگن وہ ہوکر جیسے ناچے سوانگ میں جوکر
اب وہ روزانہ ہی آتی اپنی تعریفیں سن جاتی
مدت میں پھر وقت وہ آیا قدرت نے جب رنگ دکھایا
چڑیا کے وہ چھوٹے بچے ہوگئے اب اڑنے میں پکے
پھر اس دن جب بلّی آئی اور اس نے آواز لگائی
"میں کیسی لگتی ہوں بتاؤ میرے حُسن کا راگ سُناؤ"
زور سے چڑیا فوراً بولی "بلّی کیوں کرتی ہے ٹھٹھولی
تو بدصورت کالی بلّی بھونڈی صُورت والی بلّی"
بلّی پھر غصے میں دوڑی ہاتھ نہ آئی جھنجی کوڑی
رہ گئی بلّی دانت دکھا کر اڑ گئے بچے پر پھیلا کر
بلّی کچھ ایسی کھسیائی پھر نہ کبھی وہ لوٹ کے آئی
بچّو یہ بلّی کی کہانی بتلاتی ہے بات پرانی

جھوٹی جو تعریف کرائے
بعد میں اپنے مُنھ کی کھائے

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

بھارت درشن

مہابلی پورم

(۳)

ہمارے دیس کی تاریخ میں گپت راج کو سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے۔ کالی داس جیسے ناٹک لکھنے والے اور بھرتری ہری جیسے مہاکوی اسی زمانے کی یادگار ہیں، اجنتا کی گپھائیں بھی اسی زمانے میں بنیں، مگر گپت راج کے بعد بھی بعض ایسے راجہ ہو گزرے ہیں جنھوں نے گپت راجاؤں کی سی شان و شوکت قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی مثلاً راجہ پُل کیسین دوم اور راجہ ہرش وردھن وغیرہ۔ مگر ان میں پالوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن اول (۶۳۰ء تا ۶۶۷ء) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس کی راجدھانی کانچی ورم تھی۔ یہ کنجی ورم اب بھی ایک بڑا شہر ہے۔ پالوا راجاؤں کے بسائے ہوئے ایک دوسرے شہر مہابلی پورم کا نام اس کے شاندار مندروں کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ مہابلی پورم کا صحیح نامماملا پورم تھا جس کے معنی ہیں "ماملا کا شہر"۔ اور ماملا خطاب تھا راجہ نرسمہا ورمن کا۔ اسی نے مہابلی پورم کے وہ مندر بنوائے تھے جو آج کل سات پگوڈا یا سات رتھ کے نام سے مشہور ہیں۔

مہابلی پورم مدراس سے ۳۵ میل دکھن کو سمندر کے کنارے پر ہے۔ کسی زمانہ میں پالوا خاندان کی یہ بڑی مشہور

بندرگاہ تھی۔ یہاں سے بڑے بڑے تجارتی جہاز سامان سے لدے پھندے ہمارے ملک کے مختلف حصّوں اور دوسرے ملکوں کو جایا کرتے تھے۔ وقت نے اس تجارتی چہل پہل کو ختم کیا لیکن نرسمہ ورمن نے پتھر کی چٹانوں کو کاٹ کر جو مندر بنوائے تھے وہ آج بھی جوں کے توں قائم ہیں اور پالوا خاندان کی مورتی کلا (مورتی یا بُت بنانے کے فن) کی ترقی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مہابلی پورم میں یوں تو بہت سی چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ مثلاً مندپ یا گپھائیں جو پہاڑی کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ خوب صورت اور دل کش، مختلف چھوٹے بڑے مندر پہاڑی کے دامن پر تراشے ہوئے خوب صورت اور دل کش مناظر۔

اچھا آیئے ہم آپ کو اس وقت صرف ان مندروں کی سیر کرائیں جو پتھر کی ٹھوس چٹانیں کاٹ کر بنائے گئے ہیں اور جنھیں وہاں کی زبان میں "رتھ" کہتے ہیں۔

ہمارے دیس میں پہاڑوں میں گپھائی مندر بنانے کا کام تو بہت پہلے شروع ہوچکا تھا، لیکن ساتویں صدی میں مہابلی پورم میں پتھر کی ٹھوس چٹانوں کو کاٹ کر جو "رتھ" بنائے گئے ہیں، یہ اپنی قسم کے پہلے مندر ہیں۔ اِن رتھوں کی تعداد پانچ ہے۔ نرسمہ ورمن نے ان پانچ مندروں کو مہا بھارت کے پانچ پانڈو سورما بھائیوں یعنی بدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل، سہدیو اور ان کی پتنی (بیوی) دروپدی کی یاد میں بنوایا تھا۔ سب سے پہلے یہاں کے سب سے بڑے مندر "دھرم راج رتھ" کو لیجیے۔

دھرم راج رتھ کی اونچائی پانچوں رتھوں میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ جس چٹان سے یہ رتھ کاٹے گئے تھے اس کا ڈھلان دکن سے اتر کی طرف تھا۔ اس مندر کی بنیاد چوکور ہے، مگر اوپر جاکر تا ہرامی شکل کا ہوگیا ہے۔ اس کی

تین منزلیں ہیں۔ آخری منزل کے اوپر آٹھ کونوں والا گنبد ہے۔ مندر میں جگہ جگہ محرابیں کاٹ کر ان میں مورتیاں بنائی گئی ہیں کہیں چار ہاتھوں والے شیوجی نظر آتے ہیں تو کہیں پاروتی، کہیں، وشنو تو کہیں کرشن۔ ایک جگہ پر خود نرسمہ ورمن اول کی مورتی بھی چٹان سے کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ جس پر اس وقت کی بول چال کی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ ان تمام مورتیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ سنگ تراشوں کے ہاتھوں میں یہ سخت اور ٹھوس چٹانیں موم بن گئی ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے مورتیوں کے تراشنے میں صرف اعضا کے تناسب یا سڈول پن ہی کا خیال نہیں رکھا ہے بلکہ چہروں پر جو کیفیت ہونی چاہیے وہ بھی ان مورتیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

دھرم راج رتھ کے برابر دوسرا مندر "بھیم رتھ" کا ہے اس کی شکل مستطیل نما (طولانی) ہے۔ اس کے اوپر جو چھت بنائی گئی ہے وہ دیہاتی گاڑی کے ٹپ کی سی ہے دور سے ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے ستون کھڑے کرکے جھونپڑی ڈال دی گئی ہو۔ اس مندر میں مورتیاں تو نہیں ہیں مگر سجاوٹ کا باقی کام دھرم راج رتھ کے نمونہ پر ہے۔

تیسرے مندر کا نام "ارجن رتھ" ہے۔ یہ بھیم رتھ کے بائیں طرف ہے بناوٹ کے لحاظ سے یہ مندر دھرم راج رتھ کی نقل ہے لیکن مندر کے اندر کی مورتیاں مختلف ہیں مثلاً اس مندر کے ایک حصے میں شیو کو نندی بیل پر، اندر کو آیراوت پر اور وشنو کو گرڈر پر جھکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پتھر کی ایک سل پر ایک رشی ڈنڈا ہاتھ میں سنبھالے اپنے چیلے کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ ارجن رتھ کی بنیاد کے چاروں طرف ایک ہاتھی اور ایک شیر چٹان سے اس طرح کاٹے گئے ہیں جیسے یہ مندر کو سہارا دے رہے

ہوں ۔ اس رتھ کی پہلی منزل میں کچھ
بونے ایک قطار میں کھڑے ہیں جن کی
شکلوں اور کھڑے ہونے کے انداز کو
دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے ۔ دوسری
طرف بہت سی بطخیں دکھائی گئی ہیں
جو سچ مچ کی معلوم ہوتی ہیں ۔ اس
رتھ کے پیچھے نندی کی ایک بہت
بڑی مورتی بھی ہے جو مکمل نہیں ہے ۔
یہ پھر بھی بہت خوب صورت لگتی ہے ۔

اس سے اگلا مندر جسے "درو پدی
رتھ" کہتے ہیں ان پانچوں مندروں میں
سب سے زیادہ خوب صورت ہے ۔ اس
کی چھت باقی رتھوں سے بالکل مختلف
ہے ۔ مندر کے باہر محرابوں میں بہت سی
مورتیاں بنائی گئی ہیں اور ان سے سجاوٹ
کا کام لیا گیا ہے ۔ مندر کے اندر چار
ہاتھوں والی درگا دیوی دکھائی گئی ہے ۔
دیوی کے بازوؤں پر دو پجاری جھکے ہوئے
ہیں ۔ ان میں سے ایک پجاری دوسرے
کا سر کاٹنے کے لیے اپنی تلوار تیز کر رہا
ہے اور اسی کے سر پر چار بونے ہوا میں
اڑ رہے ہیں ۔ دروپدی رتھ کے سامنے
ایک شیر کی مورتی بنی ہے جو سینہ تانے
کھڑا ہے ۔

پانچواں اور سب سے آخری مندر
"نکل سہدیو رتھ" کے نام سے مشہور
ہے یہ بھیم اور ارجن رتھ کے سامنے
ہے ۔ اس مندر میں مورتیاں نہیں ہیں
لیکن اس کے پاس ہی پتھر کا تراشا ہوا
ہاتھی کا ایک بہت بڑا مجسمہ ہے ۔

ان پانچ رتھوں سے کوئی پون
میل دور اتر میں ایک چٹان پر "گنگا کا
نزول" دکھایا گیا ہے ۔ یہ کام شاید
مہابلی پورم کے آثار میں سب سے زیادہ
اچھا ہے ۔ یہاں ۹۶ فٹ لمبی اور
۴۰ فٹ اونچی ایک چٹان پر دیوی،
دیوتاؤں ۔ انسانوں اور حیوانوں کی مورتیں
بنی ہیں ۔ اس چٹان میں ایک شگاف ہے
اس کے ایک طرف چندر سوریہ، کنتر اور
سدھ، گندھارو اور اپسرائیں ایک رشی
کی طرف دوڑتی ہوئی دکھائی گئی ہیں ۔
دوسری طرف شیو بہت سے بونوں کے

ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ بہت سے شکاری، رشی منی، چیلے اور جنگلی جانور جیسے شیر، چیتا، ہاتھی اور سؤر دکھائے گئے ہیں۔ ہاتھیوں کی مورتیاں کو دیکھ کر تو بس اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ چٹان کے شگاف میں بہت سے ناگ دیوتا اور ناگ دیویاں نظر آتی ہیں۔ شگاف کے بائیں طرف وشنو کا مندر ہے، جس کے آس پاس بہت سے رشی تپسیا کرتے ہوئے دکھائی گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہرن اور شیر بھی ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ لیکن شاید سب سے زیادہ دلچسپ ایک بلی کی مورتی ہے جو اپنے دو پاؤں کو ہوا میں اٹھائے اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ اب وہ چوہوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اور اس کے قریب بہت سے چوہے دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔

مہابلی پورم کے کام کو دیکھ کر آپ اچھی طرح سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پالوا خاندان کے عہد میں مورتی کلا، (بت بنانے کے فن) نے کتنی ترقی کر لی تھی اور ہمارے دیس میں ایسے مندر بننے شروع ہو گئے تھے جن کو دیکھنے کے لیے آج دنیا کے کونے کونے سے سیاح یہاں آتے ہیں اور پرانے زمانے کے فن اور مہارت پر عش عش کرتے ہیں +

کتاب : علم کی روشنی (ڈراما)
قیمت : تیرہ پیسے
مصنف : اسلم الہ آبادی
ملنے کا پتہ : ۱۱۲ - پایدھنی روڈ (مشرقی) بمبئی ۳

دو دوست تھے۔ ایک کا نام تھا سوہن، دوسرے کا انور۔ ایک امیر تھا، دوسرا غریب۔ ایک پڑھنے سے جی چراتا دوسرا پڑھنے میں دل لگاتا۔ دونوں ابھی بچہ تھے۔ لیکن جب بڑے ہوئے تو ان کی زندگیاں کس طرح گزریں؟ اس بات کا پتہ "علم کی روشنی" پڑھنے سے چلے گا۔

اسلم الہ آبادی نے اس چھوٹے سے ڈرامے کے ذریعہ یہ سمجھانا چاہا ہے کہ علم کی روشنی سے ہی زندگی روشن ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بات سیدھے سادے طریقے پر آسان زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں دو ایک مشکل الفاظ بھی آگئے ہیں۔ یہ بھی نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ اور ہاں! اگر کہنے کا انداز کسی قدر دلچسپ ہوتا تو آپ کو کچھ اور مزہ آتا۔ پھر بھی یہ ڈراما ایک اچھا اثر ڈالتا ہے۔ اس میں ایک استاد کی تقریر بھی آپ پڑھیں گے۔ پر وہ بالکل پھُس پھُسی ہے۔ آپ جب اپنے کسی استاد کی کوئی نصیحت یاد کریں گے یا سنیں گے تو اس تقریر کی کمزوری صاف ظاہر ہو جائے گی۔ ایک جگہ "دہرکرادیا" لکھا ہوا ہے۔ اس کی جگہ "دہرادی" زیادہ صحیح ہوگا۔

بچوں کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ ڈراما کیسے کریں؟ یہ معلومات بھی بڑے آسان اور دلچسپ انداز میں پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "آؤ ڈراما کریں" سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کی لکھائی چھپائی گھٹیا ہے۔ اگر خوب صورت طریقے سے چھاپی جاتی تو غالباً آپ کو کچھ اور پسند آتی۔

"معلم"

دارجلنگ کا تعلیمی سفر (نمبر ۱)

پچھلے سال (۱۹۶۳-۶۴) اکتوبر میں ابتدائی ششم کے طلبا، اپنے پروجکٹ کے سلسلے میں دارجلنگ گئے تھے۔ بچوں نے سال بھر "ہمالہ کی ہندوستانی مہم" پر بڑی مستعدی سے کام کیا۔ سورج کنڈ پر چڑھائی کی، ایورسٹ کے کامیاب کوہ پیما مسٹر کمار کی تقریر سنی، چڑھائی کی کئی فلمیں دیکھیں دارجلنگ جاکر کوہ پیمائی کی، تین سنگھ فاتح ایورسٹ سے ملاقات کی۔ بچوں نے دارجلنگ میں جو کچھ دیکھا وہ انھی کے الفاظ میں سنیے۔

سید احمد علی (استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ)

(۱) دارجلنگ

دارجلنگ تک ریل جاتی ہے۔ اسٹیشن ۶۱۱ فٹ کی بلندی پر ہے۔ اور تین پلیٹ فارم ہیں۔ ایک ریل میں گارڈ کے ڈبے

اور انجن کے علاوہ تین ڈبے اور ہوتے ہیں۔ دار جلنگ کی عورتیں قلیوں کا کام کرتی ہیں، دودھ بیچتی ہیں۔ اجرت پر کپڑے دھوتی ہیں۔ گھوڑے کی سواری کے وقت لگام پکڑے رہتی ہیں۔ چائے کے باغوں میں کام کرتی ہیں، سبزی بیچتی ہیں۔ غرض مردوں کے تمام کام کرتی ہیں۔

دار جلنگ بہت خوب صورت پہاڑی مقام ہے۔ میں نے وادیوں میں بادلوں کو دیکھا، بالکل سفید، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دھنی ہوئی روئی وادیوں میں پھیلا دی ہو۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادلوں کی فوج وادیوں سے نکل کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر حملہ کرنے جا رہی ہے، واقعی تمام پہاڑوں پر یہ بادل ایسے چھا جاتے تھے کہ پہاڑوں کے سلسلے اور ان کی چوٹیاں بالکل نظر نہیں آتی تھیں۔

یہاں پھولوں کی بہتات ہے۔ چپہ چپہ پر پھول اور سبزہ نظر آتا ہے خواہ ان کی کوئی دیکھ ریکھ کرے یا نہ کرے۔ ان سبزہ زاروں کے درمیان پختہ صاف ستھری سڑکیں ہر طرف بنی ہوئی ہیں۔ ان پر موٹر اور ٹیکسی سے آمد و رفت ہوتی ہے۔ اسکول اور کالج بے شمار ہیں اور ایک سے ایک اچھے اور شاندار ہیں۔ رات کے وقت تو یہاں اور بھی بہار ہوتی ہے۔ بادل پہاڑوں کی چوٹیوں پر ٹھہر جاتے ہیں اور وادیوں میں دور تک، مکانوں میں بجلی کے قمقموں کے جلنے سے، دیوالی کا سماں معلوم ہوتا ہے۔ ہر اجنبی کو پہلی رات یہی دھوکا ہوتا ہے کہ آج دیوالی ہے۔

(حسن حیدر عمر ۱۳ سال)

(۲) کنچنجنگا کی برف پوش چوٹی

۱۰ اکتوبر کو فجر کے بعد سب لڑکے کنچنجنگا کی چوٹی دیکھنے چلے، سورج نکل چکا تھا اور چوٹی صاف نظر آرہی تھی۔ تمام لڑکے چوٹی دیکھنے میں محو ہو گئے دیکھنے کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ محمد شمیم دھنبادی بولے: "اگر ماسٹر صاحب

ہم کو اجازت دے دیں تو ہم چوٹی پر چلے جائیں۔" اقبال حسین کہنے لگے:" میں اور نسیم چوٹی فتح کریں گے۔" اس پر جمیل الرحمٰن نے اپنی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر کہا:" اگر تم نیچے کی چوٹی ہی چھو کر چلے آؤ تو میں تم کو ابھی یہ روپے دے دوں گا۔" عادل منصور فرمانے لگے:" دل چاہتا ہے کہ کن چن جنگا کی چوٹی کو چھو کر آجاؤں۔"

چوٹی بہت صاف نظر آرہی تھی۔ اقبال حسین کہنے لگے:" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاندی کا پہاڑ ہے اور سورج کی کرنوں کے پڑنے سے چمک رہا ہے۔" اس کے جواب میں عادل منصور فرمانے لگے:" مجھے ایسا لگتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹیوں پر کسی نے بہت عمدہ طریقے سے سفیدی کر دی ہے۔" میری زبان کیوں چپ رہتی، میں نے کہا" یہ تو تاج محل کی طرح ہے۔ تاج محل بھی چاندنی رات میں خوب چمکتا ہے۔ یہ برف پوش چوٹی سورج کی کرنوں سے چمک رہی ہے۔ یقیناً یہ چوٹیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔" اس طرح چوٹی دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

(منظور الاسلام غیاثی عمر ۱۵ سال)

کن چن جنگا کی چوٹی پر جب پہلی بار میری نظر پڑی تو میں سمجھا کہ سنگ مرمر کے ٹکڑے وہاں رکھے ہیں۔ اس لیے کہ میں نے ایسا پہاڑ کبھی نہیں دیکھا تھا میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ برف جمی ہوئی ہے۔ چوٹی اتنی قریب معلوم ہو رہی تھی کہ ہم لوگ ایک گھنٹہ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ چوٹی یہاں سے ۴۶ میل دور ہے۔ اس کی بلندی ۲۸۱۴۶ فیٹ ہے۔ لیکن وہاں سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پر پہنچنا بہت آسان ہے۔ لیکن جب فتح کرنے جائیں گے تو بہت مشکل بات ہوگی۔ ہاں کوئی بلند ہمت پکا ارادہ کرلے تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

جب تک میں اس کو دیکھتا رہا رہ رہ کے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اس کو فتح کرکے ہندوستان کا نام روشن کروں۔ لیکن یہ خیال بھی آتا تھا کہ ابھی میں چھوٹا ہوں

(محمد اسحاق)

(۳) چڑھائی کے اسکول کا میوزیم

ہم لوگ چڑھائی کے اسکول ½ ۹ بجے پہنچے۔ فوراً ہمیں شرما صاحب مل گئے۔ وہ ہمیں میوزیم میں لے گئے۔ دیوار پر لگی ہوئی تصویروں اور وہاں رکھے ہوئے ماڈلز کو ہمیں اچھی طرح سمجھایا۔ تصویروں میں کہیں برف پر چڑھائی ہو رہی تھی، کہیں برف کے بڑے بڑے دریا پار ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ برف کی چوڑی چوڑی گھاٹیوں کو زینہ لگاکر پار کیا جا رہا تھا۔ کہیں موٹے موٹے لباس پہنے ہوئے خیموں کے پاس لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ایک کوہ پیما آکسیجن سیٹ لگائے بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں پر موٹے موٹے چشمے تھے۔ ایک جگہ تین سنگھ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ کر جھنڈا گاڑ رہے تھے۔

آگے بڑھے تو ایک خیمہ دیکھا۔ اس خیمے میں وہ تمام چیزیں تھیں جن کو خیمے میں بچھاکر اور اوڑھ کر سوتے ہیں۔ لحاف کے اندر ایڈر پرندے کے پر بھرے ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ اسکنڈی نیویا میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پر بہت گرم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگ اوپر گئے۔ ایک شرپا قلی کا بہت بڑا مجسمہ دیکھا۔ یہ مجسمہ شرپا قلیوں کی کوہ پیمائی کی تاریخ میں محنت، جفاکشی، ذمہ داری، وفاداری، فرمانبرداری، اور قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے شرما صاحب کا شکریہ ادا کیا اور واپس آگئے۔

(یوسف حسین، عمر ۱۲ سال)

(۴) چڑھائی کی مشق

نماز اور ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم

لوگ ۹½ بجے چڑھائی کے اسکول پہنچ گئے۔ آج چڑھائی کی مشق کرنی ہے۔ سینیر انسٹرکٹر صاحب نے ۱۰۰ فیٹ لمبی ریشمی رسی اپنے ہمراہ لی اور چل پڑے۔ کوئی دو میل چلنے کے بعد ایک ۳۰۰ فیٹ بلند چوٹی کے قریب پہنچے۔ سب سے پہلے انھوں نے چڑھ کر تبلایا کہ کس طرح چڑھنا چاہیے۔ یہ تبایا کہ چڑھتے وقت پنجے کے بل چڑھنا چاہیے۔ اگر کوئی پکڑنے کی جگہ ہو تو اوپر سے پکڑ لینا چاہیے۔ اگر نیچے سے پکڑنے کا موقع ہو تو نیچے سے پکڑنا چاہیے۔ پھر انھوں نے گرہ باندھنے کا طریقہ تبلایا اور محمد شمیم، منہاج الاسلام اقبال حسین اور جمیل الرحمن کی کمر میں رسی باندھتے گئے اور گرہ دکھلاتے گئے۔ دو لڑکوں کے درمیان رسی کا فاصلہ ۱۰ فیٹ تھا۔ اس طرح دس منٹ میں یہ لڑکے چوٹی پر پہنچ گئے۔ رسی اس لیے باندھی جاتی ہے کہ اگر اوپر کا لڑکا گرے تو بیچ کے لڑکے اس کو روک لیں۔ چوٹی کے مغرب جانب ایک ہزار فیٹ گہرا غار تھا جس کو دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔

(مختار حسین، عمر ۱۲ سال)

(۵) چڑھائی کا سامان

چڑھائی کے سامان میں خیمے، گرم لباس، آکسیجن سیٹ، خوراک اور اسٹوو وغیرہ کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن رسی، کلہاڑی اور کیل والے جوتوں کی۔ ان سب سامانوں میں بڑی اہمیت ہے۔ اپنی کلہاڑی سے یہ لوگ برف میں راستے بناتے ہیں۔ جب کہیں بلندی پر چڑھنا ہوتا ہے تو پہلے ایک آدمی کیلیں لگا لگا کر اوپر چڑھ جاتا ہے اور اوپر جاکر ایک کنڈا گاڑ دیتا ہے اور اس رسی کو اس کنڈے میں باندھ دیتا ہے۔ اسی رسی سے

کوہ پیما چڑھتے اور اُترتے ہیں ۔ اگر چڑھائی کرنے والوں کے پاس سارا سامان ہو اور یہ تینوں چیزیں نہ ہوں تو چوٹی فتح نہیں ہو سکتی۔ چڑھائی کے اسکول میں بھی رسّی اور کلہاڑی بنی ہوئی ہے۔ تین سنگھ کی کوٹھی پر جو ماڈل بنا ہوا ہے اس میں بھی رسّی اور کلہاڑی ہے اور جو لوگ چڑھائی کے اسکول سے کامیاب ہوکر نکلتے ہیں انھیں جو بیج ملتا ہے اس میں بھی رسّی اور کلہاڑ بنی ہوتی ہے ۔

(عادل منصور، عمر ۱۴ سال)

(۶) تین سنگھ سے ملاقات

ہم سب کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ تین سنگھ سے ملاقات کریں۔ ویسے تو روزانہ ان کو چڑھائی کے اسکول میں آتے جاتے دیکھتے تھے۔ اور ہمارے کئی ساتھیوں نے ہاتھ بھی ملایا تھا لیکن آخری دن تین سنگھ سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ ہم لوگ لائبریری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شرما صاحب نے آکر فرمایا کہ ۱۱ بجے دن کو تین سنگھ سے ملاقات ہوگی اور تصویر کھنچے گی ۔ گیارہ بجے سے کچھ پہلے ہم لوگ ہال سے پانچ کرسیاں لے آئے۔ اور عمارت کے صحن میں شمال کی طرف رکھ دیں تاکہ جنوب سے روشنی پڑے۔

تین سنگھ صاحب آئے تو بیچ میں ہمارے اُستاد جناب سید احمد علی صاحب اور داہنے طرف تین سنگھ، بائیں جانب اسکول کے پرنسپل صاحب آخر کی دونوں کرسیوں پر جمال الدین، منصور اور شمیم احمد دربھنگوی بیٹھے۔ اس ترتیب سے دو تصویریں لی گئیں اس کے بعد تین سنگھ نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

(جمیل الرحمٰن
عمر ۱۴ سال)

ہاکی

ہم نے آپ کی خواہش پر کھلاڑی صاحب سے یہ مضمون خاص طور پر لکھوایا ہے امید ہے کہ آپ اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ہم ان سے اولمپک پر بھی ایک مضمون لکھوا رہے ہیں یہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔ (ایڈیٹر)

دنیا کے اور پرانے کھیلوں کی طرح ہاکی بھی بہت پرانا کھیل ہے۔ بہت پرانے زمانے سے کھیلا جاتا ہے۔ مگر اس وقت لوگ ہاکی اسٹک کی جگہ درخت کی ٹیڑھی میڑھی شاخ سے کھیلتے تھے۔ گیند کی جگہ پتھر کا ٹکڑا ہوتا تھا۔

مگر زمانے کے ساتھ ساتھ اس کھیل نے بھی ترقی کی اور بہت ترقی کی۔ آج کل تو باقاعدہ لچک دار ہاکی اسٹک اور چمڑے کی سخت اور سفید گیند سے کھیلتے ہیں۔

کچھ دنوں سے اس کھیل کی دو قسمیں ہوگئی ہیں۔

(۱) آئس ہاکی :- یہ کھیل برف پر کھیلا جاتا ہے۔ کناڈا میں اس کا بہت رواج ہے۔ اپنے دیس میں کشمیر اور شملے میں اس کا کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے۔

ہاکی کا کھیل مرد اور عورتیں دونوں کھیلتے ہیں۔ ہمارے دیس میں تو دونوں کے الگ الگ کلب ہیں۔ صرف امریکہ میں عورتیں ہی یہ کھیل کھیلتی ہیں مرد اس سے بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔

کہتے ہیں یورپ میں یہ کھیل بہت پرانے زمانے سے کھیلا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ یورپ ہی سے آیا ہے۔ دوسرے دیسوں میں: انگلستان، ہالینڈ، جرمنی بلجیم، فرانس، آسٹریا، کناڈا، جاپان اور کینیا نے اس کھیل میں بہت ترقی کی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں تو اس کھیل کا بہت ہی شوق ہے۔ گلی کوچوں میں، سڑکوں پر، پارکوں میں میدانوں میں بچے اور نوجوان ہاکی اسٹک سے گیند کو نچاتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ہاکی بہت دلچسپ، بہت تیز کھیل ہے، ایک بار اس کھیل کو دیکھنے کے بعد ہر بچے اور نوجوان کے دل میں اسے کھیلنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑی کو پیروں کی پھرتی اور ہاتھوں کی مہارت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اگر آپ نے کوئی بہت اچھا ہاکی کا میچ دیکھا ہو جس میں ہندوستان کے نامور کھلاڑی کھیل رہے ہوں تو آپ کو اس کھیل کے لطف کا صحیح اندازہ ہوا ہوگا۔

آپ نے دھیان چند کا نام تو سنا ہوگا کھیل کے جگت میں وہ جادوگر کہلاتا تھا۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے اس کا کھیل دیکھا ہوگا۔ شاید کچھ ایسے بھی ہوں گے جنھیں اس کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا ہو۔ بس وہی لوگ بتا سکتے ہیں کہ دھیان چند کو جادوگر کیوں کہتے تھے۔

دھیان چند کا کھیل بہت ہی اونچے درجے کا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کو اس صفائی سے پاس دیتے کہ مخالف ٹیم کے کھلاڑی کو اس کا اندازہ ہی نہ ہو پاتا۔ بے چارہ منہ تکتا رہ جاتا۔ مخالف کھلاڑیوں کو نچاتے ہوئے گیند کو اسٹک کے سہارے گول تک لے جانے میں انھیں ایسا ملکہ تھا جیسے گیند ان کے پورے بس میں ہے اور ان کی اسٹک سے چپکی ہوئی ہے۔

دھیان چند کو گیند کا مل جانا مخالف ٹیم کے لیے خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ یا تو وہ اپنے ساتھی کو بہت اچھا پاس

بناکر دیتے ۔ یا خود ہی لے کر آگے بڑھتے اس وقت کوئی بھی ان سے گیند کو چھین نہ پاتا ۔ گول کے پاس پہنچتے ہی ہٹ مارتے ۔ بے چارہ گول کیپر ٹاپک ٹوئیاں مارتا رہ جاتا ۔ اسے گیند نظر بھی نہ آتی۔ اور گول کے تختے پر جاکر کھٹ سے لگتی۔ تبھی معلوم ہوتا کہ جادوگر نے گول کردیا۔ کہتے ہیں دھیان چند کے دس ہٹوں میں اوسطاً آٹھ یا نو گول ضرور ہوتے تھے۔

ایک بار دھیان چند یورپ میں ہاکی کھیل رہے تھے۔ تماشائی ان کا کھیل دیکھ کر حیران تھے ۔ پر کچھ لوگوں کے دلوں میں شبہ پیدا ہوا۔ انھوں نے سوچا ہو نہ ہو یہ دھیان چند کی اسٹک خاص طرح کی بنی ہوئی ہے ۔ یہ کمال ان کا نہیں ان کی اسٹک کا ہے ۔کھیل ختم ہونے پر ان کی اسٹک دیکھی گئی۔ خوب ٹھونک بجاکر دیکھی گئی ۔ پر بھلا اسٹک میں کیا رکھا تھا وہ تو کھلاڑی (دھیان چند) کے فن کا کمال تھا۔ وہ اسٹک کے سہارے گیند کو اپنے بس میں کرلیتے تھے ۔ جبھی تو ہاکی کے کھیل کا ذکر آتے ہی دھیان چند کا کھیل نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

دھیان چند کے دور کے بعد ہاکی کے کھیل سے دلچسپی کچھ کم ضرور ہوئی ہے ۔ پر اب بھی دیس کے ہزاروں کلبوں، اسکولوں کالجوں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے ۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں اس کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں ۔ ان میں کچھ تو بہت ہی مشہور ہیں ۔ مثلاً

۱۔ بیٹن کپ کلکتہ
۲۔ آغاخان کپ بمبئی
۳۔ رنگا سوامی کپ (نیشنل چیمپین شپ) مدراس
۴۔ سندھیا گولڈ کپ گوالیار
۵۔ عبیداللہ گولڈ کپ بھوپال
۶۔ ڈی۔سی۔ام (دہلی کلاتھ مل) دہلی

یہ کہانی ادھوری رہ جائے گی۔ اگر چند ممتاز کھلاڑیوں کا ذکر نہ کیا گیا۔ جے پال سنگھ ۱۹۲۸ء میں بھارت کی اولمپک ٹیم کے کپتان تھے ۔ ۱۹۳۲ء میں لال شاہ بخاری اولمپک ٹیم کے کپتان

چُنے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں دھیان چند کپتان بنے۔
ان کی سرداری میں بھارت کی ٹیم خوب چمکی۔
پرانے کھلاڑیوں میں روپ سنگھ
(دھیان چند کے بھائی) دارا، جعفر، پینیجر،
گیلی، ایلن اور محمد حسین نے بہت شہرت
حاصل کی۔

بعد کے کھلاڑیوں میں کشن کے۔ ڈی
سنگھ (بابو)، بلبیر سنگھ، جنٹل، فرانسس،
کیشو، جسونت، اور کلاڈیس نے خوب
نام پایا۔

اس کھیل کے مقابلے بھی بڑے پیمانے
پر ہونے لگے ہیں۔ دنیا کے بہت سے
ملک ان مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔
اولمپک کھیلوں کا آپ نے نام سنا ہوگا۔
اب سے ہزاروں سال پہلے یونان میں
ورزشی کھیلوں کے مقابلہ ہوتے تھے۔
وہاں ایک جگہ ہے اولمپیا وہیں پر اولمپک
مقابلوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔
۱۸۹۶ء میں بین الاقوامی کھیلوں کا
کیا گیا تو اولمپیا کی یادگار میں
مقابلوں کا نام بھی اولمپک کھیلوں کے
مقابلے" رکھا گیا۔ یہ مقابلے ہر چار سال
بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں ہوتے ہیں۔
دنیا کے بہت سے ملک ان مقابلوں
میں حصہ لیتے ہیں۔ ہاکی کا کھیل
بھی ۱۹۲۸ء سے ان مقابلوں میں
شامل ہے۔

آپ جانتے ہیں ہاکی کے کھیل میں ہمارا
دیس ہمیشہ نیک نام رہا ہے۔ یہ شروع
(۱۹۲۸ء) سے اولمپک کے ہاکی کے
مقابلوں میں شریک رہا ہے اور برابر
چیمپین شپ حاصل کرتا رہا ہے۔ البتہ
۱۹۶۰ء کے اولمپک کے مقابلوں میں
ہاکی کی چیمپین شپ پاکستان کے ہاتھ رہی
تھی۔ ہماری ٹیم نے اس ناکامی اس
ہار سے بہت کچھ سبق سیکھا ہے اور
ٹوکیو کے اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے
کے لیے وہ پوری طرح تیار ہو کر گئی ہے۔
(نتیجہ جو کچھ بھی ہو) پکے ارادے کے ساتھ
گئی ہے کہ چیمپین شپ ضرور حاصل کرے گی۔

آپ کی دلچسپی کے لیے نیچے ہم
۱۹۲۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کے اولمپک

کھیلوں میں ہاکی کے مقابلوں کا ذکر کرتے ہیں :

۱۹۲۸ء میں یہ مقابلے امسٹرڈم (ہالینڈ) میں ہوئے تھے۔ ہماری ٹیم کے کپتان جے پال سنگھ تھے۔ یہاں ہماری ٹیم نے آسٹریا کو چھ، بلجیم کو نو، ڈنمارک کو پانچ، سوئٹزر لینڈ کو چھ ہالینڈ کو تین گولوں سے ہرایا تھا۔

۱۹۳۲ء میں اولمپک مقابلے لاس انجلیز (امریکہ) میں ہوئے تھے۔ کپتان لال شاہ بخاری تھے۔ یہاں ہماری ٹیم نے جاپان کو ۱-۱۱- اور امریکہ کو چوبیس گولوں سے ہرایا تھا۔

۱۹۳۶ء میں یہ مقابلے برلن (جرمنی) میں ہوئے تھے۔ ہماری ہاکی ٹیم کے کپتان دھیان چند تھے۔ یہاں ہماری ٹیم نے۔ ہنگری کو چار، امریکہ کو بیس، جاپان کو نو فرانس کو دس، اور جرمنی کو ا- ۹ گولوں سے ہرایا تھا۔

۱۹۴۸ء میں اولمپک مقابلے لندن (انگلستان) میں ہوئے۔ ہماری ٹیم کے کپتان کشن لال تھے۔ اس ٹیم نے آسٹریا کو ۰-۸، ارجنٹائن کو ۰-۹، اسپین کو ۰-۲، ہالینڈ کو ۱-۲، اور ارجنٹائن اور انگلستان کو ۰-۴ گولوں سے ہرایا۔

۱۹۵۲ء میں اولمپک مقابلے ہل سینگی (فن لینڈ) میں ہوئے۔ ہماری ٹیم کے کپتان کے ڈی۔ سنگھ (بابو) تھے۔ اس ٹیم نے آسٹریا کو چار۔ مصر کو ۱-۳ ہالینڈ کو ۱-۶ گولوں سے ہرایا۔

۱۹۵۶ء میں اولمپک مقابلے (آسٹریلیا) میں ہوئے۔ ہماری ٹیم کے کپتان بلبیر سنگھ تھے۔ اس سال بھی ہماری ٹیم نے چیمپین شپ حاصل کی۔

۱۹۶۰ء میں اولمپک مقابلے روم (اٹلی) میں ہوئے۔ ہماری ٹیم کے کپتان کلاڈیس تھے۔ یہاں ہماری ٹیم پاکستان سے ہار گئی۔
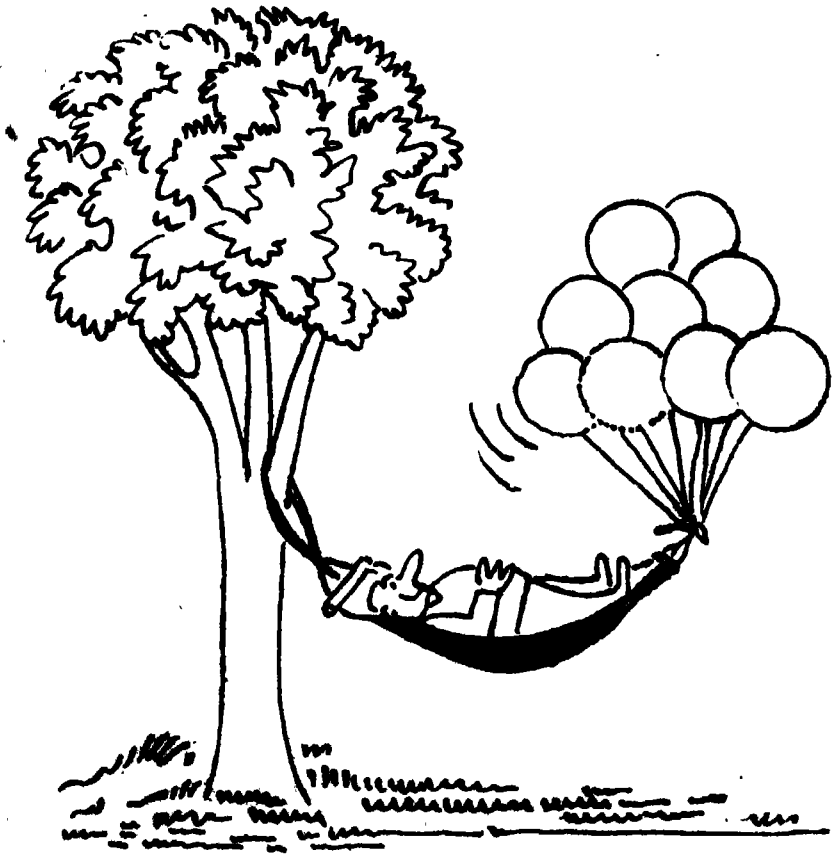
کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے

محمد امین ام اے علیگ۔

اڑن تشتری

آج کل نیویارک میں بہت بڑی نمایش ہو رہی ہے۔ نیویارک امریکہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور بھئی یہ نمایش بھی بین الاقوامی نمایش ہے یعنی دنیا کی بہت سی قوموں، بہت سے ملکوں نے اپنے اپنے ہاں کی بنائی ہوئی چیزیں اس نمایش میں بھیجی ہیں۔ ہمارے دیس ہندوستان نے بھی بھیجی ہیں اور اکیلے ہندوستان کے پویلین کو دیکھنے اب تک بیس لاکھ آدمی آچکے ہیں اس سے اندازہ کر لو کتنی بڑی نمایش ہے۔

اور تو اور آج کل اڑن تشتریاں بہت زیادہ دکھائی دے رہی ہیں۔ امریکہ کے سائنس داں بہت حیران ہیں وہ کہتے ہیں اتنی بہت سی اڑن تشتریاں آخر پہلے کیوں نظر نہ آئیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں اس میلے کی دھوم دوسرے تاروں پر بھی ہے۔ خاص کر مریخ کے لوگ ان اڑن تشتریوں پر بیٹھ نمایش دیکھنے آتے ہیں۔

پھر یہ اڑن تشتری آخر ہے کیا چیز؟

انگلستان میں ایک مشہور سائنس داں ہیں۔ یہ لگاتار تین سال سے اس اڑن تشتری کی تحقیقات میں یا کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ سائنس داں صاحب فرماتے ہیں کہ اڑن تشتری کا ذکر سننے

کی سب سے پُرانی کتابوں میں بھی ہے اور بیل میں بھی ہے ۔ ان کے خیال کے مطابق اُڑن تشتری کوئی خیالی پلاؤ نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا ہوائی جہاز ہے اور ایک سیارے کے رہنے والے دوسرے سیارے کے باسیوں سے ملنے ملانے اور ملاقات کرنے جاتے ہیں تو اسی اڑن تشتری میں بیٹھ کر جاتے ہیں ۔

ان صاحب نے ایک بات اور کہی ہے ۔اُڑن تشتری اڑانے والے یہ کام محض تفریحاً یا خالی سیر سپاٹے کے لیے نہیں کر رہے ہیں ۔ ان کے سامنے تین مقصد ہیں : زمین کے کم آبادی والے علاقوں کا چکر لگائیں ۔ اسے اچھی طرح دیکھیں بھالیں (۲) اس کے بعد وہ خاص خاص علاقوں میں زمین پر اُتریں (۳) اور آخر میں وہ بڑے بڑے شہروں میں اُتریں۔ اور وہاں کے لوگوں سے ناتا جوڑیں یا یوں کہیے کہ تعلقات قائم کریں ۔

ان سائنس داں صاحب کا خیال ہے کہ دوسرے سیاروں یا دوسری دنیاؤں کے یہ لوگ بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہے ہیں ، اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ہماری زمین کے لوگوں کو ان کی نیت پر کوئی شک و شبہ نہ رہے اور جب وہ اپنی اُڑن تشتری سے اُتریں تو لوگ واویلا نہ مچائیں ۔

یہ اڑن تشتریاں آسمان پر آج سے نہیں ۱۹۴۸ء سے نظر آ رہی ہیں. لگ بھگ سولہ سال سے ۔کہتے ہیں اب تک لگ بھگ دو لاکھ اڑن تشتریاں دیکھی جا چکی ہیں ۔ ان میں سے دو ہزار تو ایسی ہیں ۔ جو زمین پر اتر چکی ہیں اور ان کے مسافروں نے زمین کے رہنے والوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی ۔

اور سنیئے ، بڑے مزے کی بات ! انگلستان میں ایک ایتھی ری اس سوسائٹی (روحانی جماعت) ہے ۱۹۶۳ء میں اس کے ۷۰ ممبر آئنائے برسٹل کے پاس ایک پہاڑی پر چڑھ گئے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے ۔ پورے ۳۰ منٹ تک جوں

کے توں کھڑے رہے۔
دعا کیا تھی ؟
"اے خدا ہمیں تو ایشیا سے آنے والی وبا سے بچانا"
اُس وقت اُس آبنائے میں بڑی طوفانی کیفیت تھی۔ لوگوں نے کہا: بھلا ایسی طوفانی حالت میں پہاڑی پر چڑھنا کون سی عقل مندی تھی؟
جواب بھی سُن لیجیے: "اس آنے والی وبا سے ہمیں مریخ کے شریف باشندوں نے خبردار کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی روک تھام کے لیے دعائیں مانگی جائیں۔ یہ وبا اگر پھیل گئی تو ساری دنیا ختم ہو جائے گی اور قیامت آنے سے پہلے قیامت آجائے گی"
دیکھا آپ نے! یہ اُڑن تشتریاں بھوت کی طرح لوگوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سے مذہبی پیشوا اور روحانی لوگ بھی اس چکر میں پھنس گئے ہیں۔
آج کل ان اُڑن تشتریوں کا چرچا ساری دنیا میں کچھ اس طرح سے ہو رہا ہے کہ اس وقت لگ بھگ سو رسالے اور میگزین محض ان کے ناموں پر نکل رہے ہیں اور خوب چل رہے ہیں۔
امریکہ کی ہوائی فوج کے ایک دستے نے ۱۶ سال تک ۱۲۸۸ مقامات پر اڑن تشتریوں کے دیکھنے اور اُترنے کے بارے میں چھان بین کی ہے۔ پر اسے کوئی پکا ثبوت نہیں ملا ہے جس کی بنا پر انھیں دوسرے سیاروں کا یا خلا کا ہوائی جہاز ثابت کیا جاسکے۔
اس ہوائی دستے کا کہنا ہے کہ جتنی اُڑن تشتریاں اُسے نظر آئی ہیں ان میں سے ۹۲ فی صدی کو تو یقیناً ہوائی جہاز نہیں کہہ سکتے۔ ہاں آٹھ فیصدی اڑن تشتریوں کا بھید ابھی نہیں کھلا ہے۔ اسی لیے اس بارے میں وہ کوئی آخری بات نہیں کہہ سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی اور چھان بین اور تحقیقات کی ضرورت ہے۔
بعض سائنس داں تو یہاں تک کہتے

ہیں کہ امریکہ کے لوگ ان اڑن تشتریوں میں اسی طرح دلچسپی لیتے رہے اور ان کے بارے میں چھان بین کرتے رہے تو کوئی عجب نہیں جو اس سے دوسری دنیاؤں کے ان مسافروں کی ہمت بڑھے، وہ نہ صرف نیویارک کی نمائش دیکھنے آئیں بلکہ زمین کے دوسرے بڑے شہروں کی سیر بھی کریں ۔ اور بھئی کیا عجب جو تھوڑے ہی دنوں بعد یہ تشتریاں سچ مچ کے ہوائی جہاز ثابت ہوں اور ہمیں مریخ والوں سے دوستی قائم کرنے کے متعلق بہت سنجیدگی سے غور کرنا پڑے ۔

بس مسافروں سے بھر چکی تھی ڈرائور گاڑی چلانے والا تھا کہ سڑک پر کھڑا ایک لڑکا زور زور سے چیخنے لگا۔

کنڈکٹر نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

لڑکا بولا :۔ "امی نے مجھے بس کا کرایہ دیا تھا جیب میں سے نکل گیا۔ اب کیسے مدرسے پہنچوں گا۔"

رحم دل کنڈکٹر نے کہا :۔ کوئی بات نہیں بیٹا۔ آؤ آؤ جلدی سے بس میں بیٹھ جاؤ۔"

بس تھوڑی دور نکل گئی تو اس نے پھر اسی طرح چیخنا چلاّنا شروع کیا۔

کنڈکٹر نے پوچھا "اب کیا بات ہے؟"
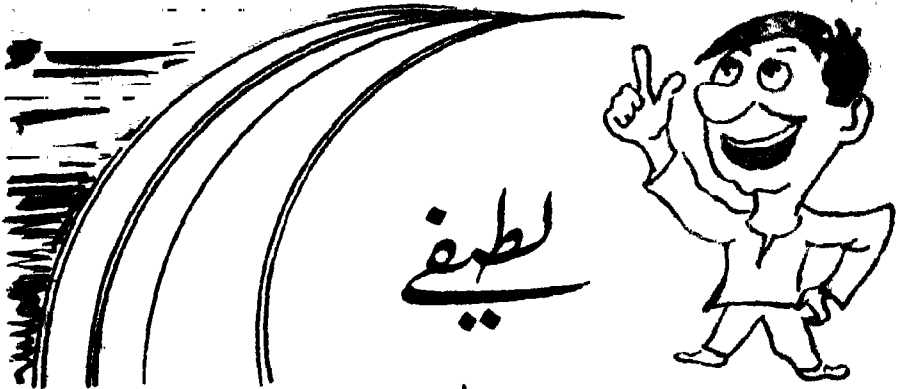
لڑکا رونی آواز میں بولا :۔ "ٹکٹ کے باقی پیسے۔"

اُستاد :۔ (نالائق شاگرد سے) تمھاری عمر کیا ہے؟

شاگرد :۔ بارہ سال ماسٹر صاحب۔

اُستاد :۔ تمھیں شرم آنی چاہیے۔ اس عمر میں نپولین بونا پارٹ اپنے درجے میں سب سے اونچا تھا

شاگرد :۔ صحیح فرمایا ماسٹر صاحب۔ مگر جب وہ آپ کی عمر کو پہنچا ہے تو شہنشاہ ہو چکا تھا۔

ایک قرض دار اپنے قرضخواہ ہوں سے

چھپا چھپا پھرتا تھا۔ اتفاق کی بات ایک دن اس دکان دار سے بیچ رستے مڈبھیڑ ہوگئی، دکاندار نے چھوٹتے ہی کہا "اجی حضور ہمارے دام وام کب ملیں گے؟"

قرض دار نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "دیکھیے جناب مہینے کے آخر میں سارے بل ایک صندوقچے میں ڈال کر خوب ہلاتا ہوں جب سب گڈ مڈ ہوجاتے ہیں تو ان میں سے تین بل نکال لیتا ہوں اور ان کے پیسے چکا دیتا ہوں۔

دکاندار آگ بگولا ہوکر بولا:۔ یہ سب بکواس میں نہیں سننا چاہتا مجھے بتایئے میرے دام آپ کب دیں گے؟"

قرض دار نے جواب دیا:۔ دیکھیے جناب دھیرج سے کام لیجیے، ورنہ آئندہ میں آپ کے بل بکس میں بھی نہیں ڈالوں گا۔

پاگل خانے کے نئے سپرنٹنڈنٹ سے ایک پڑھے لکھے پاگل نے بڑی شائستگی سے پوچھا:۔

"آپ کی تعریف؟"

"میں اس پاگل خانے کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔

"جی، جی، بجا فرمایا آپ نے۔ میں بھی جب نیا نیا آیا تھا تو اپنے کو کمشنر کہا کرتا تھا۔"

منیجر صاحب (موڈ میں آکر) اچھا بھئی کلو سچ سچ بتا اگر ہم دونوں اپنی اپنی جگہ بدل لیں، میں چپراسی ہوجاؤں اور تو منیجر ہوجائے تو تو سب سے پہلا کام کیا کرے گا؟

کلو:۔ تو حضور سب سے پہلے میں یہ کام کروں گا کہ چپراسی کو بدل دوں گا۔

(خلیق انجم افسرفی)

انوکھا چناؤ

(۲)

محمد حسین حسان

دوسرے دن سورج
نکلتے ہی زور شور سے تیاریاں
شروع ہوگئیں. بچے، عورتیں
نوجوان مقابلہ دیکھنے کے لیے
اکٹھے ہونے لگے۔

ہوتے ہوتے یہ خبر
آس پاس کے قبیلوں میں
پھیل گئی۔ ان قبیلوں کے
عورت مرد بھی تماشا دیکھنے
آگئے۔ ان مہمانوں کی بہت
خاطر مدارات کی گئی. سب
کو الاؤ کے چاروں طرف بٹھایا گیا. انھیں
بہت شان دار ناشتہ کرایا گیا۔ مکئی
کا دلیہ کھلایا گیا۔ بھنی ہوئی مچھلی، بھنی
ہوئی گھیری کھلائی گئی۔

ناشتے کے بعد آپس میں مقابلے کی
باتیں چل پڑیں۔ کچی عمر کے لڑکے پہلے
ہی میدان میں پہنچ چکے تھے۔ اور اپنی
نشانہ بازی کی جانچ کر رہے تھے. کنواری
لڑکیاں وگوام (خیموں) میں بیٹھی باتیں بنا
رہی تھیں بیچ بیچ میں وگوام سے الاؤ کے

چاروں طرف بیٹھے ہوئے بہادروں کو جھانکتی بھی جاتی تھیں۔ غرض پوری آبادی میں خوب چہل پہل تھی۔

اس وقت کی پنچایت نے سات بوڑھوں کو پنچ یا جج چُنا۔ ان کا کام مقابلے کے لیے قانون بنانا تھا۔ مقابلوں کی نگرانی کرنا تھی، مقابلے میں اوّل آنے والے بہادر کو سردار چُننا تھا۔

مقابلوں کے لیے آبادی کے پیچھے کی خوب لمبی چوڑی اکسار زمین چُنی گئی۔ چاقو، نیزے اور ٹوما پھینکنے کے لیے، تیر چلانے کے لیے اور اکھاڑے کے لیے یہ میدان بہت موزوں تھا۔

یہ بات طے پا گئی تھی کہ جب سورج کا سایہ فلاں جگہ آجائے گا تو ساتوں جج میدان کی طرف روانہ ہوں گے۔ بڑسنگھے اور ہرن قدم کے دوستوں نے ایک بات اور کی: دوسرے بہادروں کو اس مقابلے سے الگ رہنے پر راضی کر لیا۔

رہے میاں چٹ دتے تو انھوں نے جب دیکھا کہ سردار کا چناؤ طاقت کے بل پر ہوگا تو بے چارے دم سادھ گئے۔ اپنا خیال ہی بدل دیا۔ بڑھاپے نے اب ان میں اتنا کس بل کہاں چھوڑا تھا۔ اب تو ان کے ٹوماہاک کا پتھر ہرے درخت کے تنے میں آدھ انچ بھی مشکل سے گھس سکتا تھا۔ پہلے کی طرح اب وہ تیر بھی زیادہ دور نہیں پھینک سکتے تھے۔ پہلوانی اور کشتی بھی ان کے بس کی بات نہیں۔

لیجیے اب ساتوں جج ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سب سے کم عمر جج پورب کی طرف تھا۔ سب سے بوڑھا جج پچھم کی طرف۔ مقابلے بھی سات ہی تھے۔ ہر مقابلے کی جانچ کے لیے ایک جج مقرر کیا گیا۔ باقی ججوں کے ذمے یہ کام رکھا گیا کہ مقابلے میں حصّہ لینے والے کوئی غلطی یا فاؤل نہ کرنے پائیں۔ ان ساتوں میں سب سے بوڑھا جج پردھان یا صدر چنا گیا۔

صدر جج سے دونوں مقابلہ کرنے

والوں کو بلواکر اپنے سامنے کھڑا کیا اور کہا :۔
"قبیلے کے ساتھی اور مہمان سردار کے چناؤ کا تماشا دیکھنے یہاں اکٹھا ہوئے ہیں۔ قبیلے کے ہم سات بڑوں نے اپنے سردار کے لیے تین معیار قائم کیے ہیں : ۱۔ ہمارا سردار مضبوط اور طاقت ور ہو۔ (۲) بہادر ہو اور (۳) سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔
"قبیلہ اپنے لیے ایسا سردار چاہتا ہے جو دوڑنے پہ آئے تو سب سے تیز دوڑے، کودنے پر آئے تو سب سے اونچا کودے ، اکھاڑے میں اترے تو سب سے اچھی کشتی لڑے۔ نیزہ سب سے دور پھینکے۔ جس کا ٹوکا اک پتھر درخت میں سب سے گہرا چلا جائے، تیر نشانے پر سب سے سیدھا پھینکے۔ مقابلے بھی کل سات رکھے گئے ہیں۔ ان سات میں سے چار مقابلوں میں جو سب سے اول آئے گا۔ اور باقی تین مقابلوں میں اچھا رہے گا بس وہی ہمارا سردار ہوگا۔"

صدر جج ایک قدم اور آگے بڑھاکر ذرا اونچی آواز سے بولا :۔ "پنچایت یہ جانتی ہے کہ بڑ سنگا اور ہرن قدم دونوں بہادر ہیں۔ یہ مقابلے تو بس یہ بتائیں گے کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ مضبوط ہے۔

"ایک سردار کے لیے سب سے زیادہ اہم سوجھ بوجھ ہے عقل و تدبر اور دور اندیشی ہے۔ حلم اور بردباری ہے۔ بہادری دوسرے درجے پر ہے۔ اگر تم نے یہ بات ثابت کردی کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ زیادہ بہادر ہے چاہے وہ زیادہ چست نہ ہو، زیادہ مضبوط نہ ہو، زیادہ پھرتیلا نہ ہو، تو بس وہی سردار چنا جائے گا۔"

ایک اور بوڑھا جج ان دونوں بہادروں سے بولا :۔
"یہ درخت تمھاری طاقت کی جانچ کرے گا۔ تم دونوں اس پر تین تین

بار ٹوماہاک چلاؤ گے اور میں ناپوں گا کہ اس کے سبز تنے میں سے کتنا عرق باہر نکلتا ہے۔"

یہ درخت شاہ بلوط کا تھا۔ میدان کے ایک سرے پر کھڑا تھا۔ پہلے بہادروں کے ہتھیاروں کا تختۂ مشق بنتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ہتھیاروں کی طاقت اور ٹوماہاک کی تیزی اسی پر آزماتے تھے۔

بڑسنگا اور ہرن قدم دونوں اس درخت کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے یہ ہرن قدم بڑسنگے سے قد میں ذرا اُنیس تھا۔ بدن چھریرا مگر سڈول اور خوب صورت۔ بڑسنگا گٹھے ہوئے بدن کا تھا۔ بھاری بھرکم۔ رگ پٹھوں میں بل پڑے ہوئے۔

دونوں بہادروں نے اپنے ٹوماہاک کا دستہ مضبوطی سے پکڑا۔

جج نے آواز لگائی:۔ "ہاں ہرن قدم پہلے تم"

لے لیجیے ٹوماہاک اونچا اٹھا اور ہرن قدم کے سر پر سے ہوتا، ایک چمکیلی کمان بناتا درخت کے تنے میں جا گھسا جیسے بجلی کوند گئی۔

جج نے ٹوماہاک تنے میں سے نکالا اور ایک لکڑی سے درخت کے زخم کی گہرائی ناپ لی۔ ایک دوسرے جج نے یہ لکڑی اپنے پاس رکھ لی۔

اب بڑسنگے کی باری تھی۔ اس نے اپنا ٹوماہاک اونچا اٹھایا۔ اسے اپنے سر کے پیچھے لے گیا۔ اک ذرا پیچھے کو جھکا اور پھر آگے بڑھ کر درخت پر بھرپور وار کیا۔ ٹوماہاک درخت میں گھستا چلا گیا۔ جج نے دوسری لکڑی سے گہرائی ناپی۔ یہ ہرن قدم سے زیادہ تھی کچھ ایسی زیادہ نہیں مگر اُنیس بیس کا فرق ضرور تھا۔ ججوں نے دونوں کو دوبارہ بلایا اور پھر تیسری بار۔ تینوں بار بڑسنگے کا ٹوماہاک درخت میں کچھ زیادہ گہرا گیا۔

جج نے اعلان کیا:۔ "اس مقابلے میں بڑسنگا اوّل رہا"

بڑسنگے کے ساتھیوں نے ایک زوردار نعرہ لگایا۔

ہرن قدم کے ساتھی کہنے لگے :۔ "خیر جی کوئی بات نہیں ذرا بڑ سنگے کے چوڑے چکلے بازو تو دیکھو۔ یہ مقابلہ تو اسے جیتنا ہی تھا پر ابھی تو کچھ مقابلے باقی ہیں۔"

سارے جج اب درخت کے پاس سے ہٹ کر بیچ میدان میں آگئے، انھوں نے اشارے سے دو نوجوان بہادروں کو بلایا۔ ان سے دو نیزوں کے برابر لمبی لکیر کھنچوائی۔ مجمع کو کافی پیچھے ہٹا دیا کہ مقابلے میں حصہ لینے والوں کو لمبی کود کے لیے زیادہ سے زیادہ میدان ملے

اب دوسرا جج سامنے آیا اور بولا :۔ "اب ہم لمبی کود میں مقابلہ کرنے والوں کی جانچ کریں گے۔"

پھر اس نے آواز دی :۔ "ہرن قدم" ہرن قدم آواز سنتے ہی آگے آیا۔ لکیر کو دیکھا پھر پیچھے کو پلٹا۔ اس جگہ پہنچا جہاں سے دوڑ لگا کر اسے کودنا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک ذرا پیچھے کو جھکا اور تیزی سے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لکیر تک پہنچا اور پلک مارنے میں ایک جست لگائی۔ اور دور فاصلے پر آہستگی سے نیچے آیا۔ یہ بہت لمبی جست تھی پرلی لکیر سے بھی آگے۔

ایک لڑکے نے ایک بڑے لمبے بانس سے فاصلہ ناپا۔ جج بہت غور سے اسے دیکھتے رہے۔

اب بڑ سنگا آیا۔ اس نے لکیر کے پاس پہنچ کر فاصلے کا اندازہ کیا۔ پھر پیچھے لوٹا۔ پوری طاقت سے لکیر تک دوڑ کر ایک زقند بھری۔ اور لگ بھگ وہیں جا کر گرا جہاں ہرن قدم کے قدموں کے نشان تھے۔

پر کیا بڑ سنگا ہرن قدم سے آگے کودا تھا؟ ہاں تھوڑا بہت تھوڑا۔ ناپنے کے بعد معلوم ہوا کہ تیر کی لکڑی کی چوڑائی بھر۔

اب پھر ہرن قدم کی باری تھی وہ چُپ چاپ سامنے آیا اور بڑی صفائی سے جست لگائی پر اب

کے تو وہ اپنے پچھلے نشان سے کہیں آگے کودا۔ اس کے ساتھی خوشی سے چیخ اُٹھے۔ ججوں نے ایک لمبے بانس سے فاصلہ ناپا۔

اب بڑسنگے کی باری تھی۔ وہ پورے اطمینان کے ساتھ چلا پیچھے جاکر بڑی تیزی سے دوڑا اور لکیر پر پہنچ کر پوری طاقت سے چھلانگ لگائی۔ ارے! اب کے تو بڑسنگے میاں ہرن قدم سے پیچھے رہ گئے۔ ان کے پیر کا نشان ہرن قدم کے نشان سے پیچھے تھا۔ لگ بھگ جج کے جوتے کے برابر۔

پر ابھی تو دونوں کو ایک ایک باری اور لینا تھی۔ جج نے ہرن قدم کو پکارا اور تیسری مرتبہ بھی اسی شان سے خاموشی کے ساتھ آیا اب کے وہ اپنی پہلی کدائی سے تو آگے تھا مگر دوسری سے ایک ہاتھ پیچھے! اگر وہ اس بار بھی اتنا ہی کودتا تو یقیناً مقابلے میں جیت جاتا۔

اب پھر بڑسنگے میاں چلے، پکے ارادے کے ساتھ چلے جیسے یہ مقابلہ بھی جیت کے رہیں گے۔ اب کے وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز دوڑا اور پوری طاقت سے چھلانگ لگائی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہوا میں تیر رہا ہو اور دھم سے زمین پر گر پڑا۔ ارے! کیا اس نے پالا مار لیا ہے؟ بہت سے لوگ آگے جھک گئے۔ بہت غور سے قدموں کے نشان دیکھنے لگے۔

جج نے فاصلہ ناپا۔ ہر شخص چُپ سادھے ہوئے تھا: بڑسنگا جیت گیا۔ بس ایک انگلی کے برابر وہ ہرن قدم سے آگے تھا۔ وہ دو کدائیوں میں ہرن قدم سے آگے رہا تھا۔ اس لیے کامیابی کا سہرا اس کے سر رہا۔ اس کے ساتھی اور دوست بے اختیار مسکرا دئے۔

صحافی

اِدھر اُدھر سے

جاپان کا انوکھا چڑیا گھر

جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو کے پاس ایک چڑیا گھر ہے۔ یہ اپنے ڈھنگ کا نرالا چڑیا گھر ہے۔ اس میں شیروں کا ایک باغ ہے، اس باغ میں شیر آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ انوکھی بات یہ کہ لوگ انھیں باغ کے اندر جاکر قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

پر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ لوگ ان شیروں کو قریب جاکر کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ بات یہ ہے بھی تعجب کی۔ اس کے لیے چڑیا گھر میں خاص طرح کی موٹر بنائی گئی ہے، اسی موٹر پر بیٹھ کر لوگ شیروں کے باغ کے اندر جاتے ہیں۔ یہ شیر کہیں جھاڑی یا درخت کے نیچے سوئے ہوئے ملتے ہیں یا لیٹے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر جیسے ہی موٹر کا ہارن سنتے ہیں موٹر کے قریب آکر ٹہلنے اور گھومنے لگتے ہیں۔

افریقہ کے جنگلوں میں بھی اس طرح شیروں کے گھیرے بنائے گئے ہیں، جہاں سے لوگ شیروں کو جنگل کی دنیا میں گھومتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔

جاپان میں ایک اور انوکھا چڑیا گھر بھی ہے۔ اس چڑیا گھر میں سمندری جانور رکھے گئے ہیں۔ کیوں نہ ہو جاپان چاروں

طرف سمندر سے گھرا ہوا بھی تو ہے۔

مصر کے صدر ناصر کو راکھی بھیجی گئی

رکشا بندھن ہندوستان کا مشہور تہوار ہے۔ یہ بھائی بہن کی محبت جیسا پاک تہوار ہے۔ اس دن بہنیں اپنے بھائیوں کے ہاتھ میں راکھی باندھتی ہیں۔ ان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی ہیں۔

راکھی بھائی بہن کی محبت کے اٹوٹ رشتے کا نشان ہے۔

رکشا بندھن ہمارا قومی تہوار ہے۔ تاریخ میں بھی اس کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ ایک بار چتوڑ پر حملہ ہوا۔ چتوڑ کی رانی نے ہمایوں کے پاس راکھی بھیجی۔ ہمایوں کو راکھی ملی تو وہ بہن کی حفاظت کے لیے چتوڑ پہنچا اور دشمنوں کو مار بھگایا۔

اس سال اس تہوار (رکشا بندھن) پہ ہندوستان کی ایک لڑکی نے متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) کے صدر جمال عبدالناصر کے پاس راکھی بھیجی ہے۔ دوسرے ملکوں سے دوستی بڑھانے کا یہ بہت نیک شگون ہے۔

تصویر والے ٹیلی فون

ریڈیو پر ہمیں صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ بولنے والے کی صورت ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ٹیلی ویژن پر آواز کے ساتھ تصویریں بھی آتی ہیں۔ ہندوستان میں صرف دلی ہی ایک شہر ہے جہاں ٹیلی ویژن کا انتظام ہے۔

اس طرح ٹیلی فون پر بات کرنے میں صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ بولنے والے کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ امریکہ میں آج کل یہ تجربے کیے جا رہے ہیں کہ ٹیلی فون" پر ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے وقت ایک دوسرے کی صورت بھی دکھائی دے۔ اس ٹیلی فون کو "پکچر فون" یا تصویر والے ٹیلی فون کہتے ہیں۔ پکچر فون میں ایک اور آلہ لگا ہوتا ہے جس کے ذریعے ٹیلی فون پر

بات کرنے والے ایک دوسرے کی صورت دیکھ سکتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ٹیلی فون کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹیلی ویژن کا کیمرہ بھی لگا ہوتا ہے، جو بات کرنے والے کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔

بچوں کی حکومت

۱۷ ستمبر کو مدرسہ ابتدائی جامعہ میں بچوں کی حکومت کے انتخابات ہوئے امیدوار تین تھے۔ افسر امین، جاوید علی، شوکت علی۔ افسر امین بہت سے ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ کئی ہفتے سے بڑی دھوم دھام تھی۔ بچوں میں بڑا جوش وخروش تھا۔ جلوس نکلتے تھے۔ نعرے لگتے تھے۔ اب شور مچتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ننھے بچوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کارٹون بھی بنائے تھے۔ پوسٹر بھی تیار کیے تھے۔ یہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

شکریہ

ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ پیام تعلیم کے شائع ہوتے ہی ہندوستان کے اخبارات ورسائل نے خاص طور پر توجہ فرمائی اور رسالے پر تبصرے کی زحمت گوارا فرمائی۔ ان تبصروں نے یقین جانیے ہماری بہت ہمت بندھائی ہے اور ہمارے ارادوں میں بڑی تقویت پیدا ہوئی ہے۔ ان رسائل و اخبارات کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

قومی آواز لکھنو (روزانہ) انقلاب بمبئی (روزانہ) اردو ٹائمز بمبئی (روزانہ) ہماری زبان علی گڑھ (ہفتہ وار) روہیلکھنڈ اخبار بریلی (ہفتہ وار) کتاب لکھنو (ماہنامہ) ساقی لکھنو (ماہنامہ) کلیاں لکھنو (ماہنامہ) افق حیدرآباد (ماہنامہ) گگن بمبئی (ماہنامہ) سراج دہلی (ماہنامہ)

ہمیں امید ہے کہ ہمارے دوسرے ساتھی بھی جلد اس طرف توجہ فرمائیں گے اور تبصرے کے ذریعے اپنی رائے اور مشورے سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

محمد حسین حسان، (ایڈیٹر)

... محمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع کیا۔

OCTOBER 1964 Regd. No.

Payam -i- Taleem

NEW DELHI - 25

پیامِ تعلیم

پیدائش ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء وفات ۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء

پیامِ تعلیم دہلی

جلد ۱ || نومبر ۱۹۶۴ء || شمارہ ۴

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

سالانہ چندہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵

فہرست مضامین

بچّوں سے باتیں

لیجیے جناب یہ آپ کا نہرو نمبر حاضر ہے۔ ہم نے اس کی تیاری کے وقت ایک بات خاص طور پر دھیان میں رکھی ہے۔ پنڈت جی کے بارے میں زیادہ تر مضمون بچوں ہی کے ہوں۔ ہمیں بڑی حد تک اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ رسالہ پڑھ کر آپ کو خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

چاچا نہرو کے بارے میں بڑوں کے مضمون بس گنتی کے ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر چاچا نہرو کی بچپن کی زندگی کے بارے میں ہیں۔

جامعہ ملیہ سے چاچا نہرو کا تعلق اُس وقت سے ہے جب جامعہ وجود میں آئی تھی۔ یہ تعلق آزادی ملنے کے بعد بھی جوں کا توں قائم رہا۔ پنڈت جی باوجود کم فرصتی کے جامعہ کی اکثر تقریبوں میں شرکت کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ یہاں آکر انھیں ایسی ہی خوشی ہوتی تھی جیسے کسی کو اپنے گھر میں آکر ہوتی ہے۔ یہاں وہ بڑوں کے علاوہ بچوں سے بھی ضرور ملتے تھے۔ اس طرح کی دو ایک تصویریں آپ کو اس پرچے میں نظر آئیں گی۔

جامعہ سے اس تعلق کی بنا پر ان کی کتابوں کے اردو ترجمے صرف مکتبہ جامعہ چھاپتا تھا۔ اپنی ان کتابوں کا گیٹ اپ اور اچھی لکھائی چھپائی دیکھ کر انھیں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ایسی ہی خوشی جیسے کسی کو خود اپنے ادارے کے اچھے کام کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ نہرو انعامی مقابلے میں ہمارے بہت سے پیامیوں نے حصہ لیا۔ امید سے کہیں زیادہ مضمون ہمارے پاس پہنچے۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق نتیجہ نیچے لکھا جاتا ہے۔

پہلا گروپ (چھ سے بارہ سال):

۱۔ نسیمہ خاتون ابتدائی پنجم جامعہ اول انعام ۱۰ر

۲۔ جاوید لطیف ابتدائی ششم جامعہ دوم " ۵ر

دوسرا گروپ (۱۳ سے ۱۷ سال):

۱۔ زاہدہ خاتون ثانوی پنجم جامعہ پہلا انعام ۱۵ر

۲۔ حبیب الدین دھولی واڑہ برہانپور دوسرا انعام ۱۰ر

۳۔ رافعہ خاتون ثانوی چہارم جامعہ، تیسرا " ۵ر

یہ پانچوں انعامی مضمون اسی پرچے میں شائع ہو رہے ہیں۔

پچھلے پرچے میں مدرسہ ثانوی جامعہ کے الیکشن پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ پیامیوں نے بہت سے مدرسوں کے استادوں نے اس مضمون کو بہت پسند کیا۔ اس پرچے میں مدرسہ ابتدائی کے الیکشن کا حال دیا جانا تھا۔ پنڈت نہرو پر مضامین کی کثرت کے سبب روک لینا پڑا۔ اب اگلے پرچے تک اس کا انتظار کیجیے۔

ہماری خواہش ہے کہ دوسرے مدرسوں کے بچوں کی سرگرمیاں بھی وقتاً فوقتاً پیام تعلیم میں چھپتی رہیں۔ امید ہے کہ مدرسوں کے پیامی اور ان کے استاد اس سلسلے میں ہماری مدد کریں گے۔

پچھلے پرچے کے مضامین "ہوم ورک" "بہادر ماں" "مصر کے تہوار" "ٹیڈی بیر"، "بھارت درشن" "انوکھا جیالا" خاص طور پر پسند کیے گئے۔ "ہوم ورک" اور "بہادر ماں" کا نمبر اول سمجھیے۔

اس پرچے کے لیے ہم نے چند اچھے اچھے مضمون اپنے بزرگوں سے حاصل کیے تھے، محترمہ آصفہ مجیب اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اگلے پرچے میں چھپیں گے۔

گُلاب

وقار خلیل حیدر آباد

پھولوں میں سب سے بہتر
پھولوں میں سب سے برتر
اک پھول ہے جہاں میں
جس کو گلاب کہیے
گل کا شباب کہیے
اس پھول کے جگر میں
"لالے" کے دل کی ٹھنڈک
"نرگس" کی آبرو ہے
"چمپا" کی، "موتیا" کی، "سنبل" کی جستجو ہے
باغِ وطن میں اپنے
اِک گل کھِلا تھا ایسا
جس کو گلاب کہیے
گل کا شباب کہیے
ہندوستان کو جس نے جنت نشاں بنایا
جہد و طلب سے اپنی یہ گلستاں سجایا
پھولوں میں سب سے بہتر
پھولوں میں سب سے برتر

اک پھول تھا جو آہر
بُستان رنگ و بُو میں
صُبحوں کا پاسباں تھا
ظُلمت میں کہکشاں تھا
دھرتی پہ آسماں تھا
اک تازہ گلستاں تھا
دستِ اجل نے جس کو افسوس ہم سے چھینا!
وہ گل نہیں وطن میں
خوشبو امر ہے اُس کی
ہر بھارتی کے دل میں
وہ پھول، وہ جواہر
اب بھی مہک رہا ہے
ہر بھارتی کے دل میں
بچوں کی انجمن میں
خوشبو امر ہے اُس کی
خوشبو امر رہے گی
خوشبو امر رہے گی

سید منیر الحسن جامعہ نگر

چاچا نہرو کی ایک جھلک

چاچا نہرو میں بہت سی خوبیاں تھیں بہت سی اچھائیاں تھیں۔ یوں سمجھیے کہ وہ پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ تھے جس کی خوشبو کی مہک سے ہر ایک کا دل و دماغ معطر ہوتا تھا۔ چاہے وہ بچہ ہو، جوان ہو، بوڑھا ہو، عورت ہو یا مرد۔ پورب کا رہنے والا ہو یا پچھم کا، سب ان کو پیار کرتے تھے۔ سب ان کو چاہتے تھے۔

جو خوبیاں لوگوں میں الگ الگ پائی جاتی ہیں وہ سب چاچا نہرو میں ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ جبھی تو ان کی شخصیت بڑی پیاری ہو گئی تھی۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، ہمیں ان کی یاد اس لیے بھی زیادہ آ رہی ہے کہ اب ان جیسی خوبیوں والے لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ سچ ہے ایسے لوگ ہزاروں سال کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو اپنی اچھی صلاحیتوں کا جادو دکھا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر ان کو دیکھنے والے، ان کے بارے میں ملنے والے اور ان کے بارے میں پڑھنے والے حیرت زدہ ہو کر ان کے اچھے کاموں کو تکا کرتے ہیں۔ اور دل میں ان جیسا کام کرنے کا حوصلہ اور امنگ محسوس کرتے ہیں۔ ان کی اس رنگا رنگ شخصیت کے اتنے پہلو ہیں جن کا ایک وقت میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس وقت تو آپ صرف

اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکتے ہیں۔

(۱)

یہ اب سے بہت دن پہلے کی بات ہے۔ پنڈت جی ایک گاؤں میں تقریر کرنے کے لیے پہنچے۔ وہاں پر لاکھوں لوگ ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے لیے آئے۔ بہت سے لوگ ان کو ہار پہنا رہے تھے۔ پیارے بچو! جانتے ہو، پنڈت جی کو جب لوگ ہار پہناتے تھے تو وہ ان کا کیا کرتے تھے؟ وہ انھیں اچھے بچوں کو پہنا دیتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی وہ اچھے بچوں کو تلاش کرنے لگے۔ تمام بچے صاف ستھرا لباس پہن کر آئے تھے اور خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں چاچا نہرو کس کے گلے میں ہار ڈالتے ہیں۔ اچانک پنڈت جی کو دور ایک غریب ماں کے پاس اس کا ایک پیارا بچہ لنگوٹی لگائے بیٹھا نظر آیا۔ بس پھر کیا تھا پنڈت جی اس کی طرف لپکے۔ وہ بھی مسکرایا۔ پنڈت جی اس کی ہنسی پر لٹو ہو گیے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ بلکہ ان گنت ہار انھوں نے اس بچے کو پہنا دیئے۔ لوگوں نے زوروں سے تالیاں بجائیں۔ بچہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ماں بھی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اس کے بعد دوسرے بچوں کو بھی انھوں نے ہار پہنائے۔ لیکن سب لوگ اس دیہاتی بچے کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

(۲)

ایک دفعہ ایک راجہ اور رانی نئی دہلی میں واقع کوٹھی تین مورتی میں ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ ان کا چار یا پانچ سال کا بچہ بھی تھا۔ پنڈت جی نے پہلے اس بچے سے ہی ہاتھ ملایا۔ اسے گود میں اٹھایا۔ پیار کیا، چمکارا اور پھر زمین پر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد راجہ اور رانی سے کہا۔ "پھر کبھی تشریف لائیے، اس وقت مجھے کچھ ضروری کام ہیں"

(۳)

ایک مرتبہ پنڈت جی کلکتے دورے پر گئے وہاں کسی سڑک سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایک بچہ ان کی موٹر کے سامنے آگیا۔ پولیس والے نے اسے ہٹانا چاہا۔ لیکن پنڈت جی نے فوراً کہا۔ "بچہ کیا چاہتا ہے؟" بچے نے جواب — "چاچا نہرو سے ملاقات کرنا" پنڈت جی نے اسے اپنے پاس موٹر میں بٹھا لیا۔ وہ بچہ بہت ہی غریب تھا۔ بھوکا تھا۔ میلے کپڑے پہنے تھا۔ پھر بھی پنڈت جی کو وہ بہت پیارا معلوم ہوا۔ اسے اپنے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس لے گئے۔ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ چمکارا اور رخصت کر دیا۔

(۴)

یہ واقعہ بھی اس وقت کا ہے، جب پنڈت جی اپنی سرکاری کوٹھی تین مورتی میں اپنے نواسوں رجیو اور سنجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ رجیو اور سنجے ان کے باغ کے مالی کے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ پنڈت جی کو ان کا اس طرح کھیلنا بہت اچھا لگا۔ انھوں نے جھک جھک کر تینوں بچوں کو پیار کیا تب کہیں جاکر آگے بڑھے۔

(۵)

پنڈت جی کی زندگی کا یہ واقعہ آزادی سے پہلے کا ہے۔ بہار میں زلزلے سے بڑی تباہی مچی تھی پنڈت جی جب اس سلسلے میں بہار کے ایک ضلع مونگیر میں پہنچے تو مصیبت زدہ لوگ ہار لیے ان کا استقبال کرنے آئے۔ اس وقت پنڈت جی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور کہا — "بھائیو! یہ ہار پہنانے کا وقت نہیں ہے، بلکہ گرے ہوئے مکانوں میں دبے ہوئے لوگوں کے نکالنے کا ہے۔ مجھے ہار نہیں، ٹوکری اور کدال چاہیے" اور سچ پنڈت جی

مزدوروں کی طرح سڑکوں کو صاف کرنے لگے۔

(۶)

پنڈت جی کو آئے دن ملک کے دورے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ پنڈت جی جنوبی ہند یعنی دکن کا دورہ کر رہے تھے، لوگوں کا بے قابو ہجوم جگہ جگہ ان کی موٹر روک رہا تھا۔ اور ان کا استقبال کر رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک جگہ ان کی موٹر رکی تو دور لوگوں کے ہجوم میں ایک بوڑھا ان کو غبارے بیچتا ہوا نظر آیا۔ پنڈت جی موٹر سے اتر کر اس کے پاس گیے انھوں نے محبت سے اپنا ہاتھ اس کی بغل میں ڈال دیا۔ بوڑھا ان کے قدم چومنے کے لیے جھکا تو انھوں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا —
"غبارے کتنے میں بیچ رہے ہو؟"
"دو دو آنے میں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ پنڈت جی نے اپنے کسی ساتھی سے روپے لے کر وہ سارے غبارے خرید لیے اور راستے بھر بچوں کو بانٹتے ہوئے چلے گیے۔

(۷)

فسادات کے زمانے میں نئی دہلی میں کچھ غنڈے دکانیں لوٹ رہے تھے۔ یکایک اُدھر سے پنڈت جی کا گذر ہوا۔ انھوں نے اس طرح جب غنڈوں کو دکانیں لوٹتے ہوئے دیکھا تو وہ یہ بات برداشت نہ کر سکے اور پاس کھڑے ہوئے ایک فوجی افسر سے ڈنڈا چھین کر خود غنڈوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حالت دیکھ کر غنڈے بھاگ کھڑے ہوئے۔

(۸)

یہ بھی کئی سال پہلے کی بات ہے کہ جب پنڈت جی نے کسی اخبار میں شہید چندر شیکھر آزاد کی ماں کا ایک خط پڑھا جس میں لکھا تھا کہ وہ بیس سال سے غریبی کی حالت میں اپنے دن کاٹ رہی ہے۔ بھر پیٹ کھانا

بھی مشکل سے ملتا ہے۔ لیکن اب زندگی کے آخری دن وہ ہر دوار جاکر گذارنا چاہتی ہے۔ پنڈت جی کو جیسے ہی اس کا علم ہوا انھوں نے فوراً ڈھائی سو روپے ان کے پاس بھیج دیے اور آئندہ بھی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

(۹)

ایک نوجوان ادیب یورپ کے سفر پر جا رہے تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے پنڈت جی سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ پنڈت جی نے ان کو ملنے کا وقت دیا۔ جب کچھ دیر ان سے بات چیت ہو چکی تو پنڈت جی نے ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا اور کہا "اسے جہاز پر ہی کھولنا" انھوں نے اس کا وعدہ کیا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ جہاز پر ان کو وہ لفافہ یاد آیا۔ جب اسے کھولا تو بہت چکرائے۔ اس لفافے میں سو سو کے کئی نوٹ تھے۔

(۱۰)

کئی سال ہوئے الہ آباد میں پنڈت جی پیدل جا رہے تھے۔ راستے میں ان کو دیکھنے کے لیے بہت لوگ جمع تھے اور "نہرو زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ یکایک مجمع میں سے ایک بڑھیا نے آگے آکر کہا "اے جواہر! تو کہتا ہے کہ آزادی مل گئی۔ پر میرے لڑکے کو آج تک نوکری نہیں ملی۔ کیا یہی تیری آزادی ہے؟" پنڈت جی کو بڑھیا پر بڑا ترس آیا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ماتا جی! آپ ملک کے وزیر اعظم کو 'تو' کہہ کر بلاتی ہیں کیا یہ کم آزادی ہے؟" پنڈت جی کی یہ نیک مزاجی، شرافت اور نرمی دیکھ کر بڑھیا شرما گئی۔

(۱۱)

پنڈت جی کے مرنے کی خبر امریکہ پہنچی تو صدر کینیڈی مرحوم کے بچوں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ آپ کس کے مرنے کا غم منا رہی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا "اس بزرگ اور اچھے آدمی کا جس نے تم کو ہاتھی کا بچہ ہندوستان سے تحفہ میں بھیجا تھا" بچوں کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کو چاچا نہرو یاد آ گئے اور وہ بھی ان کی یاد میں ان کے غم میں کھو گئے۔

سیدہ فرحت، علی گڑھ

چاچا نہرو امر ہیں

(انتقال کی خبر سُن کر اسی دن لکھی گئی)

ہیں کس کے غم میں اہلِ وطن سوگوار آج
آنکھیں ہوئی ہیں کس کے لیے اشکبار آج

سنتے ہیں آج ایک بڑا سانحہ ہوا
نہرو کو موت آئی، بڑا حادثہ ہوا

موتی کچھ آنسوؤں کے انھیں نذر کیجیے
پُرسا چچا کا قوم کے بچوں کو دیجیے

نہرو نہیں رہے ہمیں آتا نہیں یقیں
محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ہیں یہیں کہیں

بچوں کے چہچہوں میں ذرا دیکھیے انھیں
معصوم قہقہوں میں ذرا دیکھیے انھیں

نہرو امر ہیں دل سے یہ آواز آتی ہے
مرتا ہے جسم روح کو کب موت آتی ہے

وہ روح اب تم ہی میں تو جلوہ دکھائے گی
بچو! یہ تم کو مثلِ جواہر بنائے گی

بچوں کی محفلوں کو وہ جنت سمجھتے تھے
بچو! تمھیں وہ قوم کی دولت سمجھتے تھے

قوم و وطن کی آس ہے تم سے لگی ہوئی
روشن کرو گے دل کی شمع تم بجھی ہوئی

عبدالحلیم ندوی جامعہ کالج

مصر کے تہوار

(۳)
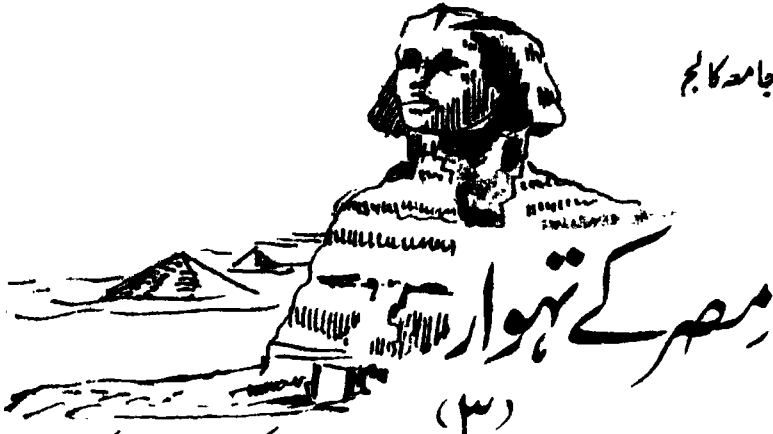
رمضان اور عید

عید بھی مصر کے تہواروں میں بہت اہم تہوار ہے۔ اس کی ابتدا چاند رات ہی سے شروع ہوجاتی ہے، چاند رات کو ایک بڑا سا شامیانہ لگایا جاتا ہے، اس میں انقلاب سے پہلے بادشاہ اور انقلاب کے بعد صدر جمہوریہ یا ان کا نمائندہ، شیخ ازہر، بڑے بڑے عالم، اور حکومت کے وزیر سورج ڈوبنے سے پہلے آکر جمع ہوجاتے ہیں۔ چار پانچ بڑی عمر کے متقی پرہیز گار اور اونچی حیثیت کے لوگ چاند دیکھنے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ چاند دیکھ کر شیخ ازہر کے سامنے آکر ادب سے کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی آنکھ سے چاند دیکھنے کی گواہی دیتے ہیں۔ شیخ ازہر ان کی گواہی قبول کرکے بادشاہ یا صدر جمہوریہ سے درخواست کرتے ہیں کہ چاند ہونے کا اعلان کردیا جائے۔ صدر کھڑے ہوکر مجمع میں چاند دکھائی دینے کا اعلان کرتا ہے۔ جونہی اعلان ہوتا ہے گولے دغنے لگتے ہیں؛ غبارے اڑائے جاتے ہیں۔ اور ریڈیو سے رمضان کے شروع ہونے کا اعلان ہوجاتا ہے۔

آج سے پوری مصری قوم بالکل پرہیز گار بن جاتی ہے۔ ہوٹل، قہوے خانے، شراب خانے سب دن کو بند ہوجاتے ہیں۔ یہاں روزہ رکھنے کا رواج بہت ہے۔

دوسرے مذہب کے لوگ بھی اپنے مسلمان
بھائیوں کی خاطر، دن کو راستوں میں، کھلی
جگہوں پر نہیں کھاتے پیتے اور اگر آپ
کو کوئی دیہاتی سر بازار کھاتے پیتے دیکھ
لے تو ٹوک ضرور دے گا کہ شرم نہیں آتی
مسلمان ہوکر روزہ نہیں رکھتے!

رمضان میں خاص طور سے ایک قسم
کے شربت سے روزہ کھولا جاتا ہے جسے
قمر الدین کہتے ہیں، یہ شربت اخروٹ کشمش
بادام اور ناریل کو پیس کر بنایا جاتا ہے اور
بہت مزہ دار ہوتا ہے۔ رات کو دوست
احباب بیٹھ کر با میش رمضان کھاتے ہیں
اور گپیں لڑاتے ہیں۔ چھلکے دار بادام، اخروٹ
کشمش، فندق اور ناریل آپ کے سامنے
رکھ دیا جائے گا۔ ہر پلیٹ میں سروتے
جیسی ایک پھل توڑنے والی چیز رہتی ہے۔
اس سے بادام اخروٹ توڑتے جایئے کھاتے
جایئے اور قہوہ پیتے جایئے۔ رمضان المبارک
کی یہ مجلسیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں، عام
طور سے گپوں میں کوئی سچا قصہ، جسے آپ
نے یا تو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو یا کہیں پڑھا
ہو یا تاریخی ہو، بیان کیا جاتا ہے، یا پھر کوئی
علمی مذہبی یا ادبی بحث چھڑ جاتی ہے اور
لوگ خوب گرماگرمی سے بحث کرتے ہیں،
دلیلیں دیتے ہیں۔ جو ہارتا ہے اسے
بناتے ہیں، اور جو جیتتا ہے اس کے نام کا
نعرہ لگاتے ہیں۔

اسی قسم کی محفلیں رات گئے تک
رہتی ہیں، گھر واپس آکر سحری کھاتے ہیں
اور سو جاتے ہیں اور پھر دس گیارہ بجے
دن کو اٹھتے ہیں۔ عید کے دن ایسی ہی
دھوم ہوتی ہے جیسی ہمارے یہاں۔ مرد عورت
خوب زرق برق کپڑے پہن کر عید کی نماز
پڑھنے جاتے ہیں، نماز پڑھ کر کنافہ
کھاتے ہیں، کنافہ سویّوں کی ایک
قسم ہے، جو بڑی مزے دار ہوتی
ہے۔ ہمارے یہاں تو سویّاں، دودھ،
کریم، بالائی کے ساتھ کھائی جاتی ہیں لیکن
ان کے یہاں حلوہ کی طرح سوکھی پکتی
ہیں، اور سینیوں میں جمی جمائی دکانوں
پر لگی رہتی ہیں، لوگ خرید کر یا گھر میں
پکا کر، دوست، احباب میں بانٹتے ہیں۔

اسی کے ساتھ "عید کے کیک" بھی بڑے اہتمام سے بنائے جاتے ہیں۔ اور دوستوں، عزیزوں میں بانٹے جاتے ہیں، عید کے ان کیکوں کی وہاں بڑی اہمیت ہے، اگر آپ کنافہ اور "عید کے کیک" دوستوں اور عزیزوں کو نہ بھیجیں یا ان کو بلا کر نہ کھلائیں تو یہ بڑی شکایت کی بات سمجھی جاتی ہے۔

عید الأُم یا ماں کا تہوار

یہ تہوار عام طور سے اسکولوں کے بچے اور بچیاں مناتے ہیں، اس کے لیے اسکولوں میں مہینوں پہلے سے تیاریاں ہوتی ہیں۔ جس دن یہ تہوار منایا جاتا ہے سارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں چھٹی ہو جاتی ہے، اسکولوں میں بہت خوب صورت شامیانے لگائے جاتے ہیں، جنھیں پھولوں، ہاروں اور گلدستوں سے سجایا جاتا ہے۔ اس میں ایک اسٹیج بنایا جاتا ہے، اسٹیج کے سامنے اسکول میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں کی ماؤں کو بٹھایا جاتا ہے۔ پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب اس تہوار کی اہمیت پر ایک تقریر کرتے ہیں جس میں بچہ پر ماں کے احسانات گناتے ہیں، ماں جس محبت سے پالتی پوستی ہے اور دودھ پلاتی ہے اس کی یاد دلاتے ہیں۔ اور ملک و قوم کے لیے اچھی ماں کی جو اہمیت ہے اسے واضح کرتے ہیں، ماں کا حکم ماننے میں جو بھلائیاں ہیں انھیں اچھی طرح سمجھاتے ہیں۔ پھر بچے بچیاں گروپ میں اسٹیج پر آکر مختلف قسم کے ناچ دکھاتے ہیں اور گانے گاتے ہیں جن میں ماں کی تعریف ہوتی ہے، اور اس کی محبت و شفقت اور احسانوں کے گن گائے جاتے ہیں، جب یہ پروگرام ختم ہو جاتا ہے تو سب بچے اپنی اپنی ماؤں کو تحفے پیش کرتے ہیں۔ یہ تحفے اپنی جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسوں سے خریدے جاتے ہیں۔ بچوں کی اس محبت اور تعلق کو دیکھ کر ماؤں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ بے اختیار اپنے ننھے ننھے بچوں کو گلے لگا لیتی ہیں، پیار کرتی ہیں۔

یہ تہوار صرف اسکولوں میں ہی نہیں منایا
جاتا، بلکہ ہر مصری اگر اس کی ماں زندہ
ہے تو کوئی نہ کوئی تحفہ اس دن ضرور
دیتا ہے۔ اور مصر کے کسی گوشے میں ہو
اس دن اپنی ماں کے پاس تحفے لے کر
پہنچتا ہے۔ بلکہ مصر سے باہر کام کرنے
والے بھی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس
موقع پر ماں کے قدم چومیں۔ جن ماؤں
کے بچے نہیں ہوتے، عام طور سے پڑوسیوں
کے بچے یا خاندان کے بچے ان کے پاس
تحفے لے کر آتے ہیں۔

عرس حضرت حسین علیہ السلام

مصر میں اولیاء اللہ اور بزرگوں کے
عرس بھی بہت ہوتے ہیں، مگر ہمارے
یہاں کے عرس میں اور ان کے یہاں کے
عرس میں ایک بڑا فرق ہے ہمارے یہاں
تو بزرگ کے مرنے کا دن منایا جاتا ہے
لیکن مصر میں پیدائش کے دن کا عرس
ہوتا ہے۔ ان عرسوں میں سب سے مشہور
اور اہم حضرت حسین علیہ السلام، اُن کی
بہن سیدہ زینب اور حضرت سید طنطاوی
کا عرس، بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اور
سب سے زیادہ دھوم دھام حضرت امام
حسینؑ کے عرس پر ہوتی ہے۔ اس عرس
میں شہر کے بڑے لوگ، سفراء، وزراء
اور علماء سب شریک ہوتے ہیں۔ یہ
عرس ازہر کے علاقے میں ایک بہت
خوب صورت اور پرانی مسجد میں ہوتا
ہے جس کا نام مسجد امام حسینؑ ہے۔ اس
مسجد کے اندر ایک قبر ہے جس کے متعلق
کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا
سر اس میں دفن ہے، عرس کے دن مسجد
کے اندر اور باہر بہت ہجوم ہوتا ہے۔
لوگ سب سے پہلے مسجد کے اندر جاتے
ہیں، وضو کرکے عام طور سے قبر کا چکر
لگاتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں، اور پھر
تھوڑی دیر تلاوت قرآن پاک کرکے حضرت
امام حسینؑ کی روح کو ثواب پہنچاتے ہیں۔
اس کے بعد باہر نکل کر میلے میں سیر سپاٹا
اور خرید و فروخت کرتے ہیں۔ آپ میں
سے بہت سے پیامیوں نے حضرت نظام الدین

اولیاء کا عرس تو دیکھا ہوگا، بس سمجھ لیجیے کہ حضرت امام حسینؑ کے عرس کا بھی بالکل وہی نقشہ ہوتا ہے۔ ویسا ہی شور وغل، ویسا ہی ہنگامہ اور ویسی ہی بھیڑ بھاڑ۔ اسی طرح کی دوکانیں، ویسے ہی قوالیاں۔ اور ویسے ہی خرافات۔

قوالی کا یہاں عجیب ڈھنگ ہے، بیچ مجمع میں چار پانچ آدمی دائرہ بناکر ڈھول لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اس دائرہ کے بیچ میں عام طور سے ایک عورت ہوتی ہے جسے شیخہ کہتے ہیں ایک مرد ہوتا ہے جسے شیخ کہتے ہیں۔ یہ دونوں تھرک تھرک کر آلہ اودل کے انداز میں ڈھول کی تھاپ پر عرس والے کی تعریف میں گیت گاتے ہیں۔ دیکھنے والے ان کی طرف آنہ دو آنے پھینکتے جاتے ہیں۔

آگے بڑھیے تو ایک صاحب ایک جھولی رکھے کچھ لوہے کے کڑے اور ہڈیاں لیے جادو کے کرتب دکھاتے نظر آئیں گے۔ ان سے تھوڑی دور پر مداری صاحب اپنی ایک بندریا کو کوداتے دکھائی دیں گے، اور ان کے پاس کباب والے، بوٹی والے، چیخ چیخ کر مزےدار چٹ پٹے کباب، سیخ پر بھنی بوٹیاں بیچتے ہوئے ملیں گے۔ پھل والے الگ امرود، انگور، سیب، ناشپاتی وغیرہ زور زور سے چلّاکر بیچ رہے ہوں گے۔ ان عرسوں میں باہر سے دیہاتی بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ ان دنوں مصر کے سستے ہوٹل اور تمام مسجدیں زائرین سے بھر جاتی ہیں، اور دوکانداروں، خوانچے والوں کی خوب بکری ہوتی ہے۔ ٹراموں، بسوں میں جگہ نہیں ملتی، ہر طرف چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ ان عرسوں میں شکر کی بنی ہوئی لال پیلی گڑیاں خوب بنتی ہیں۔ جنھیں بچے بڑے شوق سے خریدتے ہیں، خود بھی کھاتے ہیں اور دوستوں کو تحفہ میں دیتے ہیں۔

سیدنا الشیخ الطنطاوی مصر کے ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کا مزار قاہرہ سے تھوڑے فاصلہ پر

طنطا شہر میں واقع ہے۔ یہیں پر ایک بزرگ
الشیخ السید احمد البدوی کا مزار بھی ہے۔
دونوں بزرگوں کا عرس اس شہر میں بہت دھوم دھام
سے ہوتا ہے۔ ان عرسوں میں دور دور
سے دیہات کے لوگ بڑی عقیدت
سے شریک ہوتے ہیں۔
مصر میں قبروں پر چادر چڑھانے
کا رواج بالکل نہیں ہے۔ البتہ پھولوں
سے قبریں ڈھکی رہتی ہیں۔ اور مقبرہ خوشبوؤں
سے بسا رہتا ہے۔ ہر وقت اگر بتیاں،
مشک وعنبر جلا کرتا ہے۔ مجاور ان کی
دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی میں لگے
رہتے ہیں۔ اور بالکل اسی طرح نذرو
نیاز کے نام سے پیسے مانگتے ہیں، جس
طرح اپنے یہاں مزاروں پر پیچھے پڑکر
نذر کے پیسے مجاور وصول کرتے ہیں۔
میں نے یہاں قبر کی جالیوں کو چومتے
ہوئے لوگوں کو دیکھا، لیکن آج تک
میں نے کبھی قبر کے آگے کسی کو سجدہ
کرتے نہیں دیکھا، مصر کا مسلمان، خواہ
کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو، سجدہ صرف
خدا کے آگے کرتا ہے۔
مصر کے گاؤں میں چھوٹے موٹے مقامی
میلے، جو عام طور سے فصلوں کے موقع پر لگتے
ہیں، بہت ہوتے ہیں، خاص طور سے
"عید الحصاد" یعنی غلّہ کٹنے کا تہوار بہت
دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ صرف
دیہاتوں کا تہوار ہے، اور وہیں منایا جاتا
ہے، اس موقع پر دیہاتوں کے مدرسوں
میں چھٹی ہو جاتی ہے۔ کھیتی باڑی کے محکمے
کے افسر اپنے اپنے حلقہ میں ان میلوں
میں شریک ہوتے ہیں۔ ان میلوں میں
اچھی کھیتی، خاص طور سے اچھی روئی
پیدا کرنے کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ پرگنہ
بھر کی پیداوار کا نمونہ تحصیل میں جمع
کیا جاتا ہے، پھر ایک کمیٹی ان کا
معائنہ کرتی ہے اور جس کی پیداوار
سب سے اچھی نکلتی ہے اسے انعام
دیا جاتا ہے۔ شام کو دیہات کے لوگ
ناچ رنگ کی محفلیں گرم کرتے ہیں
اور رات گئے تک کھیل تماشوں، گانوں
اور غل غپاڑے میں مشغول رہتے ہیں۔

دوسرے دن قاہرہ یا اپنے پاس والے شہر میں جاکر سیر و تفریح کرتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں، اور خوب دل کھول کر کھاتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں۔ دو دن کے بعد گھر واپس جاتے ہیں اور بچوں کے لیے مٹھائی اور عورتوں کے لیے سال بھر کا کپڑا لتا خرید کر لے جاتے ہیں۔ اور پھر اپنی کھیتی باڑی میں لگ جاتے ہیں۔

لطیفے

بہرا خریدار (بہرے دکاندار سے) یہ برتن کتنے کا ہے؟
بہرا دکاندار:۔ کانچ کا ہے۔
خریدار:۔ ٹین کا دو۔
دکاندار:۔ ارے بھائی ٹین کا نہیں کانچ کا ہے۔

شوہر:۔ بھئی یہ اخبار پر روز روز پیسے خرچ کرنے سے تو بہتر ہے کہ ریڈیو خرید لیں۔ خبریں سننے کے کام آئے گا۔ گانا بھی سنیں گے۔
بیوی:۔ مگر انگیٹھی میں جلانے کے کام تو نہیں آئے گا۔

پروفیسر (دعوت کے کمرے سے باہر نکل کر) دیکھو تم ہمیشہ میرے غیر حاضر دماغ ہونے کا مذاق اڑاتی رہتی ہو۔ مگر آج بات اُلٹی ہوگئی۔
بیوی:۔ وہ کیسے؟
پروفیسر:۔ تم اپنی چھتری وہیں کمرے میں بھول آئیں اور میں نہ صرف اپنی بلکہ تمھاری چھتری بھی اٹھا لایا۔
بیوی:۔ بہت خوب۔ مگر یہاں دعوت میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی چھتری نہ لایا تھا۔

(خلیق انجم اشرفی)

شمیم حنفی الہ آباد

۱۴ رنومبر کا سورج

یوں تو ہمارا سورج روز صبح کو کسی شریر بچے کی طرح ہنستا کھیلتا پورب سے طلوع ہوتا ہے اور شام کو اپنے کھیل سے تھک ہار کر پچھم میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن ۱۴ رنومبر کو نکلنے والا سورج ہر سال آپ کے لیے مسرت کا ایک پیغام لے کر آتا ہے۔ اس دن آپ اسی طرح خوش ہوتے ہیں جیسے عید کے دن۔ ۱۴ رنومبر کا دن "بچوں کا دن" کہا جاتا ہے۔ اس دن ہمارے دیس کے سارے بچے خوب دھومیں مچاتے ہیں، سینما گھروں میں ان کی پسند کی کھیل کود والی فلمیں دکھائی جاتی ہیں، نمائشوں میں انھیں مٹھائیاں اور غبارے تقسیم کیے جاتے ہیں اور جگہ جگہ پارکوں اور کھیل کے میدانوں میں نت نئے تماشے ہوتے ہیں۔

۱۴ رنومبر کو ہنستے کھیلتے وقت آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ یہ سب آخر کیوں ہوتا ہے؟ آیئے آج آپ کو اسی دن کی کہانی سنائیں!

آج سے کوئی پچھتر سال پہلے ۱۴ رنومبر ۱۸۸۹ء کو اتر پردیش کے ایک شہر الہ آباد میں ایک مشہور وکیل کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ اور یہی وہ بچہ تھا جس کی بدولت ۱۴ رنومبر ہماری تاریخ کا ایک یادگار دن بن گیا۔ ہم آپ کو اسی بچے کے بچپن کی کچھ باتیں سناتے ہیں۔

آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ آپ ہی کی طرح ہر بچے کو کھیل کود کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہ بچہ بھی کھیلنا چاہتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس بھرے پُرے گھر میں اس کی

عمر کے دوسرے بچے نہیں تھے۔ پھر وہ کھیلتا تو کس کے ساتھ؟ پھر؟ ہوا یہ کہ یہ حضرت گھر کے کسی کونے میں اکیلے بیٹھے یا تو کوئی ایسا کھیل کھیلتے جو اکیلے ہی کھیلا جاتا ہے۔ یا پھر ان کا ذہن پریوں کی کہانیوں میں اُلجھا رہتا۔ دن تو اس طرح اکیلے گذر جاتے تھے۔ لیکن رات کو ان کے ابّو کے محرّر جو ایک سیدھے سادے بوڑھے آدمی تھے انھیں اپنی گود میں بٹھا کر رامائن، مہا بھارت یا الف لیلہ کی کہانیاں سناتے۔

جب یہ حضرت تھوڑے سے بڑے ہوئے تو ان کے لکھنے پڑھنے کا انتظام کیا گیا۔ رنگ برنگی کاپیاں اور خوب صورت کتابیں منگوادی گئیں اور یہ پڑھنے لگے۔ ایک دن انھوں نے اپنے ابّو کی میز پر دو خوب صورت قلم دیکھے۔

اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ بس ان کا جی بُری طرح للچا گیا، انھوں نے یہ سوچا کہ آخر ابّو دو دو قلموں کا کیا کرتے ہوں گے اور ایک قلم اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اب اس قلم کی تلاش شروع ہوئی۔ یہ بے چارے ڈرے کہ اگر انھوں نے اپنے جرم کا اقرار کیا تو ابّو کی مار الگ کھانی پڑے گی اور لوگ ہنسیں گے بھی اس لیے بالکل خاموش رہے! لیکن آخر کار چوری پکڑ ہی گئی اور ابّو نے انھیں اس کی سزا بھی دی۔ اور اس سزا ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے پھر کبھی اس قسم کی چوری سے کان پکڑ لیا۔

ایک دن یہ گھوڑی پر سوار ہو کر سیر کے لیے نکلے۔ یہ گھوڑی بڑی خوب صورت تھی، عربی نسل کی تھی۔ روزانہ شام کو جب یہ سیر کے لیے نکلتے تو ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ رہتا۔ لیکن اس دن یہ اکیلے ہی کھسک گئے تھے۔ ایک جگہ ایسا ہوا کہ یہ حضرت گھوڑی پر سے گر پڑے۔ خود تو اسی جگہ اکیلے پڑے چوٹ کی تکلیف سے بے قرار ہو کر رہتے رہے۔ اور گھوڑی اپنے جانے پہچانے راستے سے

ہوتی ہوئی اکیلی گھر پہنچ گئی ۔ وہاں ان کے
ابّو اور ابّو کے بہت سے دوست اکٹھا تھے۔
ان لوگوں نے جب اکیلی گھوڑی دیکھی تو گھبرا
گئے ۔ پھر سب کے سب قسم قسم کی گاڑیوں
میں سوار ہو کر ایک جلوس کی شکل میں انہیں
تلاش کرنے کے لیے نکل پڑے ۔ اتفاق سے
ایک جگہ یہ حضرت راستے ہی میں مل گئے،
اور انھیں خوب شاباشی دی گئی ۔

جس گھر میں یہ رہتے تھے وہ بہت
خوب صورت ہے ۔ اس گھر کا نام "آنند بھون"
ہے۔ کبھی الٰہ آباد جانے کا موقع ملے تو آپ
اسے ضرور دیکھیے گا ۔ اس گھر کے اردگرد
بڑا لمبا چوڑا خوب صورت باغ ہے۔ اسی
باغ کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا
خوب صورت تالاب بھی ہے اس میں یہ
حضرت خوب نہایا کرتے تھے۔ اکثر شرارت
میں یہ حضرت ان لوگوں کو خوب تنگ
کرتے جن کو تیرنا نہیں آتا تھا اور
بے چارے تالاب کے کنارے کھڑے
ان حضرت کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔
ایسے ہی لوگوں میں ایک صاحب تھے،
سر تیج بہادر سپرو، اپنے وقت کے بہت
مشہور وکیل اور بڑے نامی گرامی آدمی!
انھیں بھی تیرنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے
شام کے وقت جب وہ "آنند بھون" آتے
تو اکثر اس "تالاب کے کنارے کھڑے
ہو کر تیرنے والوں کا تماشہ دیکھا کرتے ۔

وہ بے چارے تو چپ چاپ کھڑے
دیکھتے رہتے اور انھیں شرارت سوجھتی۔
یہ چپکے چپکے تیرتے ہوئے کنارے کے
قریب جاتے اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں
سے سپرو صاحب کی ٹانگ پکڑ کر
گھسیٹنا شروع کر دیتے ۔ سپرو صاحب
ڈر سے چیخنے لگتے ، اور ان کے
چیخنے پر انھیں اتنی خوشی ہوتی کہ
یہ پانی ہی میں اچھل اچھل کر تالیاں
بجاتے ۔

یوں تو آپ اس بچے کو پہچان ہی
گئے ہوں گے لیکن ہم بھی اس کا نام
بتا ہی دیں! یہی بچہ بڑا ہو کر ساری دنیا
کے بچوں کا "چاچا نہرو" بن گیا۔ جواہر لال
نہرو! ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کے سورج، ساری

دنیا کے دوست، امن اور دوستی کے سب سے بڑے پیغمبر، ہمارے دیس کے سب سے پیارے رہنما اور ہماری صدی کی ایک عظیم شخصیت!

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو یہ سورج غروب ہوگیا۔ "چاچا نہرو" ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ لیکن جب بھی ۱۴ نومبر کو مشرقی افق سے سورج طلوع ہوگا اور سارے دیس کے بچے اپنا دن منانے کے لیے ہنستے ہوئے اٹھیں گے انہیں اس سورج کی یاد آئے گی جو آج سے پچھتر سال پہلے الہ آباد کے ایک گھر میں طلوع ہوا تھا۔

آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ اس سورج نے دنیا میں امن، محبت، دوستی اور خلوص کی جو روشنی پھیلائی اسے ہم ختم نہ ہونے دیں گے۔ اور ساری دنیا کو انسانیت کا جو پیغام دیا ہم اسے گھر گھر پہنچائیں گے۔ اس طرح چاچا نہرو کی یادوں کے گلاب ہمیشہ تازہ رہیں گے۔

درگا پرشاد شاد، سلطان پوری

دیس کی شان ہے تم سے بچو!

یہ چمن جو تمھارا وطن ہے
سر سے پا تک سجی اک دلہن ہے
اس کی ہر بات میں بانکپن ہے

دیس کی شان ہے تم سے بچو!
اس کی ہر آن ہے تم سے بچو!

تم محافظ ہو اب اس چمن کے
اس ہمالے کے، گنگ و جمن کے
ہند کے، ہند کے ہر چلن کے

دیس کی شان ہے تم سے بچو!
اس کی ہر آن ہے تم سے بچو!

تم سے ہے سارے گلشن کو الفت
تم سے ہے ہر بشر کو محبت
کل کے بھارت کی تم سب ہو طاقت

دیس کی شان ہو تم سے بچو!
اس کی ہر آن ہو تم سے بچو!

آرٹ و سائنس سے لو لگاؤ
زندگی علم و فن سے سجاؤ
فرقہ بندی سے خود کو بچاؤ

دیس کی شان ہو تم سے بچو!
اس کی ہر آن ہو تم سے بچو!

کوئی تم میں سے نہرو بنے گا
کوئی آزاد و باپو بنے گا
امن کے گل کی خوشبو بنے گا

دیس کی شان ہو تم سے بچو!
اس کی ہر آن ہو تم سے بچو!

تم جو جاگو تو جاگے زمانہ
تم سے ہے زندگی کا فسانہ
ہو تمھیں اس وطن کا خزانہ

دیش کی شان ہو تم سے بچو!
اس کی ہر آن ہو تم سے بچو!

سید حرمت الاکرام مرزاپور

مل کے رہو

پنڈت جواہر لال نہرو نے قومی ایکتا پر شروع ہی سے بہت زور دیا ہے۔ یہ بات ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی کہ ہندوستان کی سرزمین پر رہنے بسنے والے انسانوں کے درمیان کوئی نفرت یا کوئی دوری ہو۔ یہ ملک جتنا بڑا ہے، اس کے باشندوں کے رہن سہن، طور طریقوں اور ان کی بولیوں میں بھی اتنا ہی فرق ہے۔ اس کے بعض بعض خطے تو ایسے ہیں کہ ایک ہی صوبے میں رہن سہن کے مختلف طریقے، مختلف قسموں کے لباس اور بولیوں کی مختلف شکلیں رائج ہیں۔

ہندوستان کے باشندوں میں سب سے بڑا فرق مذہب کا پایا جاتا ہے۔ اس کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے اور اس کا وجود ملک کے ہر صوبے، ہر خطے اور ہر علاقے میں ہے۔ یہاں سب سے بڑی تعداد ہندو دھرم کے ماننے والوں کی ہے اس کے بعد مسلمانوں کا درجہ ہے۔ عیسائی اور سکھ بھی ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح ملک کے تقریباً ہر حصہ میں موجود ہیں۔ تھوڑی تعداد بدھ، جین اور زرتشت مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کی ہے۔ دیکھا جائے اور غور کیا جائے تو ہندوستان بعض معنوں میں ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں رہنے سہنے کے رنگارنگ طریقے ہیں، طرح طرح کے لباس ہیں، کئی کئی بولیاں اور زبانیں ہیں اور ایک سے

زیادہ مذہبی عقیدے ہیں۔ اسی لیے ہندوستان میں قومی ایکتا کا کام بڑا کٹھن ہے، پر یہ کام جتنا کٹھن ہے، اتنا ہی ضروری بھی ہے۔

کوئی بھی ملک قومی ایکتا کے بغیر ترقی کے میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہمارے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بات کو ہمیشہ دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں زمانوں میں ہندوستان کے باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی پوری کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کے درمیان مذہب، رنگ، نسل، زبان اور رہن سہن وغیرہ کی بنا پر ایک دوسرے سے جو علیحدگی یا دوری پائی جاتی ہے، وہ بالکل ختم ہوجائے وہ اسی طریقے سے مل جل کر رہنے لگیں جس طرح انگریزوں کی حکومت سے پہلے رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپس کے جھگڑے باقی رہے تو ملک آزادی کے صحیح فائدے نہ اٹھاسکے گا اور ان خوشیوں یا نعمتوں سے محروم رہے گا جو کسی آزاد ملک کے باشندوں کو حاصل ہوتی ہیں لیکن وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ ملک کے تمام رہنے بسنے والوں کو زبردستی ایک رنگ میں رنگ دیا جائے یا ان کے لیے قانون کی رو سے کوئی سانچہ ڈھال دیا جائے۔

جواہر لال نہرو اس بھید کو سمجھتے تھے کہ قومی ایکتا قانون کے ذریعے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو ایسا پودا ہے جس کی جڑیں دلوں کی گہرائی میں پہنچتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ایسے خیالات پیش کیے جو ملک میں بھائی چارے کی فضا کو جنم دیں اور ہر ہندوستانی چاہے وہ کسی مذہب کا ماننے والا، کسی زبان کا بولنے والا یا کسی خطے کا رہنے والا ہو، دوسرے ہندوستانی سے دلی محبت اور رواداری کے ساتھ پیش آئے اور ایسا کوئی فرق محسوس نہ کرے جس سے انسانیت

سو ٹھیس پہنچے کیوں کہ اس سے ملک کی ترقی رکتی ہے۔

جواہر لال نہرو کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ملک میں مذہب، زبان اور صوبے کی وجہ سے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں قومی ایکتا کے کام کو زیادہ تیز کر دیا تھا۔ ان کی صاحب زادی اندرا گاندھی کو بھی یہ مقصد بے حد پیارا ہے لیکن یہ انھی کا نہیں ہر ہندوستانی کا سب سے بڑا فرض ہے کہ وہ اپنے محبوب رہنما کے نقش قدم پر چلے اور قومی ایکتا کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے۔

جواہر لال نہرو کو دیس کے بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ آپ لوگ بھی محبت کے جوش میں انھیں چاچا نہرو کہتے تھے۔ کیا اچھا ہو کہ اپنے چاچا نہرو کی اس دلی خواہش کو آپ اپنی زندگی کا مقصد بنا لیں۔ آپ کے اسکول میں، آپ کے درجے میں، آپ کے پاس پڑوس میں، ہندو، مسلمان، عیسائی سکھ پارسی سبھی طرح کے لڑکے ہوں گے، آپ ان سب سے کھلے دل سے ملیں، محبت اور پریم سے ملیں، یہ خیال دل سے نکال دیں کہ یہ ہندو ہے، یہ سکھ ہے، یہ مسلمان، سب کو اپنے دیس کا باسی سمجھیں، سب کو ہندوستانی سمجھیں چاچا نہرو کی یہ خواہش، قومی ایکتا کی خواہش آپ کے دل و دماغ میں رچ گئی تو یقین جانیے یہ ہندوستان سچ مچ جنت نشان بن جائے گا۔

شاہدہ سلطانہ فائزہ متعلمہ سٹی ہائی اسکول
حیدرآباد

علمبردار امن

آہ دنیا سے انیسِ بیکساں جاتا رہا
کارواں غم گیں ہے، میرِ کارواں جاتا رہا

ہائے وہ چاچا کہ جس پر بچہ بچہ تھا نثار
غم گسارِ حالتِ پیر و جواں جاتا رہا

وہ تکلم تھا کہ تھی ہر بات موتی کی لڑی
بلبلِ ہندوستاں، رنگیں بیاں جاتا رہا

سونی سونی ہر روش ہے، ہر کلی غمگین ہے
شور برپا ہے، چمن کا باغباں جاتا رہا

جس کی چشمِ لطف پر تھی ہم غریبوں کی نظر
وہ دوائے دردِ دل، وہ مہرباں جاتا رہا

تھی بلا تفریقِ مذہب قوم پر یکساں نظر
عدل پرور، عدل گستر، مہرباں جاتا رہا

فائزہ اک ہند کیا، عالم ہے اس غم میں شریک
امن کا پرچم کشا، جادو بیاں جاتا رہا

اجنتا ایلورا کے غار

آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے ہمارے دیش میں ایک مہارشی گزرے ہیں ان کا نام تھا گوتم بدھ سدھارتھ۔ وہ پیدا تو ہوئے تھے ایک راجا کے گھر میں لیکن انھوں نے راج پاٹ کے بندھنوں کو توڑ کر دنیا کو یہ سبق دیا کہ بڑا وہ نہیں ہے جو راجا کا بیٹا ہے، بلکہ اصل میں بڑا وہ ہے جس کا کام اچھا ہے، جو سب انسانوں کو بھائی بھائی سمجھتا ہے اور جو پریم کی طاقت سے اپنے دشمنوں کو بھی رام کر لیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اشوک جیسے سورما راجا نے تلوار پھینک کر بدھ دھرم کو قبول کر لیا۔ اور ہمارے دیس کے کونے کونے میں پتھر کی لاٹیں گڑوا کر بدھ دھرم کی موٹی موٹی باتیں ان پر لکھوا دیں۔ اشوک کے بعد دکن کے کچھ اور راجاؤں نے بھی بدھ مت کا پرچار کیا۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی تک یہ دھرم ہندوستان تو ہندوستان، چین اور جاپان تک پھیل گیا۔

بدھ مت کا پرچار کرنے والے صرف راجا مہاراجا ہی نہ تھے بلکہ ہزاروں لاکھوں بھکشو اور بھکشنی بھی۔ یہ بھکشو گیروے کپڑے پہنے، سر گھٹائے ہاتھوں میں مالائیں اور بودھی درخت کی ٹہنیاں لیے ہمارے دیش کے کونے کونے میں گھومتے پھرتے تھے، برسات

کے دن یہ لوگ دھرم شالاؤں میں گزارتے تھے جنھیں دیہار کہتے تھے۔ ان دیہارو کو عام طور پر کھاتے پیتے لوگ ان بھکشوؤں کے لیے بنوایا کرتے تھے۔ دیہار کے پاس ایک مندر بھی ضرور ہوتا تھا جسے چیتہ کہتے تھے۔ شروع شروع میں جو دیہار اور چیتہ بنائے گئے وہ بالکل سیدھے سادے سے ہوتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے بدھ مت کا اثر بڑھتا گیا ان دیہاروں اور چیتوں کے بنانے کے فن میں بھی ترقی ہوتی گئی اور آگے چل کر طرح طرح کی عمارتیں بننے لگیں ان ہی طرح طرح کی عمارتوں میں اجنتا اور ایلورا کے غار بھی ہیں جو پتھر کی چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان میں مصوری، بُت تراشی یا مجسمہ سازی اور فنِ تعمیر کو کچھ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ سمویا گیا ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

اجنتا کے غار دکن میں اورنگ آباد سے تقریباً ۵۸ میل اتر میں ایک بہت خوشنما پہاڑی کے دامن میں ہیں۔ ان کی کل تعداد ۲۹ ہے اور یہ نصف دائرہ کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ یہاں سے ایک ندی بھی نکلتی ہے جو آگے جاکر تاپتی ندی کہلاتی ہے۔ غاروں کا منہ پورب کی طرف ہے تاکہ سورج کی روشنی ان میں اچھی طرح آسکے۔ برسات کے موسم میں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی اودی چٹانیں، خوشنما درخت، قسم قسم کے پھول، آبشاریں، پرندوں کے چہچہے ایسے اچھے لگتے ہیں کہ بھکشو تو بھکشو دنیادار بھی گیان دھیان میں لگ جاتا ہے۔

یہ غار گوتم بدھ کے مرنے کے کوئی تین سو سال کے بعد بننا شروع ہوئے اور مختلف وقفوں کے ساتھ ساتویں صدی عیسوی تک بنتے رہے۔ یہ غار پہاڑوں کی چٹانوں کو صرف چھینی ہتھوڑے کی مدد سے کاٹ کر بنائے گئے ہیں اور ان میں سے بعض غار ۵۰ فٹ لمبے

اور ۴۰ فٹ چوڑے ہیں۔ غاروں میں
داخل ہونے کے دروازے کے اوپر
روشنی کے لیے محرابیں زیادہ تر نعل کی
شکل کی بنائی گئی ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر
ایسا لگتا ہے جیسے یہ پتھر کی نہیں لکڑی
کی ہیں۔ اجنتا کے غاروں کے بنانے
والوں کے سامنے شروع شروع میں عمارتوں
کا کوئی نقشہ نہ تھا اور اس زمانہ میں
مکان زیادہ تر لکڑی کے بنتے تھے۔
اس لیے انھوں نے لکڑی کے کام کی
نقل کی۔

غاروں کے اندر داخل ہو کر تو
ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ جگہ جگہ پر
بدھ کی مورتیاں پتھر سے اس صفائی سے
کاٹی گئی ہیں کہ ان پر اصل کا دھوکا
ہوتا ہے۔ بعض غاروں کی دیواروں
پر ایک خاص طرح کا پلاستر کر کے
ان پر مصوری کے کمالات دکھائے گئے
ہیں۔ جن کو فریسکو کہتے ہیں۔ فریسکو
صرف چند غاروں میں ہیں۔

یہ سب کام ساتویں صدی کے
بیچ تک ہوتا رہا اور کاریگروں اور کلاکاروں
کے خاندان کے خاندان اجنتا کے آرٹ یا فن
اور خوب صورتی کو جنم دینے میں لگے رہے۔
اس کے بعد بدھ مت پر زوال آنا شروع ہوا
اور یہ کام بھی رک گیا۔ کچھ عرصے کے بعد تو
بھکشوؤں نے یہاں رہنا بھی بند کر دیا۔
آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگوں کو
یہ بھی معلوم نہ رہا کہ ان گپھاؤں کے اندر
ہے کیا۔ جنگلی گھاس پھوس نے ان غاروں
کے دروازوں کو ڈھانک لیا۔ ان کی اندر
کی تصویریں موسم اور ہوا کے اثرات سے
خراب ہونے لگیں۔ کبھی کبھی ان پڑھ اور
سیدھے سادے کسانوں نے آرٹ اور
مصوری کے ان خزانوں کو گھر کے طور پر
استعمال کیا اور اجنتا کی تصویریں گھریلو
آگ، نمی اور غلط استعمال کی وجہ سے
خراب ہوتی رہیں۔ تباہی و بربادی کا
یہ سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہا۔

اتفاق کی بات کہ انگریزی فوج کا
ایک دستہ ۱۸۱۹ء میں یہاں سے گزرا
اور بعض سپاہیوں نے اپنا پڑاؤ یہاں ڈال

دبا لیکن جب ان سپاہیوں نے غاروں کے اندر روشنی کی تو یہاں کی تصویریں دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس بات کی خبر آہستہ آہستہ انگریز عہدے داروں کو ملی انھوں نے بھی پرانے ہندوستان کے فن کے ان خزانوں میں دلچسپی لی لیکن ان کو محفوظ کرانے کا مناسب انتظام بہت بعد کو ہو سکا اور پھر تو ایک وقت ایسا آیا جب اجنتا کے غاروں کی تصویریں پوری دنیا کی دلچسپی کا مرکز بن گئے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ چٹانوں کے سینوں سے تراشے ہوئے یہ غار دو قسم کے ہیں۔ ایک چیتیہ اور دوسرے دیہار۔ چیتیہ کے سامنے اور دونوں جانب کے بازو سیدھے ہیں اور ان میں دونوں طرف دالان بنے ہیں پیچھے کا حصہ گول ہے۔

دیہاروں کے بیچ میں ایک چوکور مرکزی ہال ہوتا ہے جس کے برابر میں ایک برآمدہ اور وہاں کے چاروں طرف بھکشوؤں کے رہنے کے کمرے اور پیچھے ایک مندر ہوتا ہے۔ ہر دیہار میں جس جس بھکشوؤں کے رہنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس حساب سے بدھ مت کے عروج کے وقت یہاں لگ بھگ تین سو بھکشو رہتے ہوں گے۔

اجنتا کی تصویریں گوتم بدھ اور ان کے پچھلے جنموں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں راجاؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے اور فقیروں کا بھی، ہرنوں کی شکلیں بھی نظر آتی ہیں اور ہاتھیوں کی بھی، محلوں کے عیش و آرام کو بھی اجنتا کے کلاکار پیش کرتے ہیں اور بھکشوؤں کی سادہ زندگی کو بھی۔ یہاں کی تصویروں میں سمندر بھی دکھائی دیتے ہیں اور گھنے جنگل بھی۔ غرض اجنتا کے کلاکاروں نے روزانہ کی زندگی کو اپنے آرٹ میں پیش کیا ہے۔ محلوں اور درباروں کا نام و نشان بھی باقی نہیں لیکن اس زمانہ کی زندگی پر روشنی ڈالنے کے لیے اجنتا کے دیہار اب بھی موجود ہیں۔ آئیے ہم آپ کو ایک غار کے اندر لے چلیں۔

یہ غار نمبر ۲ ہے جو کسی زمانہ میں وہیار یا خانقاہ کا کام دیتا تھا اس کے مرکزی ہال اور مندر کی سب دیواروں پر نقش و نگار بنے ہیں۔ ذرا اوپر چھت کی طرف دیکھیے۔ کیسے کیسے خوب صورت بیل بوٹوں سے اس کو سجایا گیا ہے۔ اس کی دیواروں پر جاتک کہانیوں کے ذریعے بدھ کے مختلف جنموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ ذرا بودھی ستوا پدم پنی کی تصویر کو دیکھیے جن کے ہاتھ میں کنول کا پھول ہے۔ ان کے چہرہ کے خوب صورت خد و خال، بھرا ہوا سڈول جسم، سر پر تاج اور چہرہ پر سکون اور روحانی مسرت کی جھلک وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اجنتا کی مصوری ہمارے دیش ہی میں نہیں پوری دنیا میں مشہور ہوگئی ہے۔

ساتویں صدی کے بیچ میں جبکہ اجنتا کے غار بن سنور کر مکمل ہو چکے تھے۔ اورنگ آباد سے ۱۴ میل اتر پچھم میں ایلورا کے غار بننا شروع ہوئے اور کوئی سو سال کی مدت میں بن کر تیار ہو گئے۔ یہ تعداد میں ۳۴ ہیں لیکن اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں یہ فرق ہے کہ اجنتا کے غار صرف بدھ متی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایلورا میں بدھ متی، ہندو اور جین متی غار بھی ملتے ہیں۔ یہاں کوئی ۱۲ غار بدھ متیوں، ۱۷ غار ہندوؤں اور ۵ غار جینیوں کے ہیں۔ ایلورا کے بعض غاروں میں بھی مصوری کے بہت اچھے نمونے نظر آتے ہیں لیکن یہاں کا سب سے مشہور غار کیلاش مندر ہے جس میں بت تراشی کے کمالات دکھائے گئے ہیں۔ کیلاش مندر کو راشٹر کوٹ خاندان کے ایک راجا کرشن اول نے ۷۶۰ء میں شروع کرایا تھا۔ برسوں کی محنت کے بعد ۲۷۶ فٹ لمبی، ۱۵۴ فٹ چوڑی اور ۱۰۰ فٹ اونچی ایک چٹان کو صرف چھینی ہتھوڑے کی مدد سے کاٹ کر ۱۶۴ فٹ لمبا، ۱۰۹ فٹ چوڑا اور ۹۶ فٹ اونچا مندر بنایا گیا۔ یہ پورا پورا مندر بت تراشی کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں بیلوں، شیروں اور ہاتھیوں کی

مورتیاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ حرکت کرنے ہی والی ہیں۔ ایک جگہ سوریہ کو رتھ پر سوار دکھایا گیا ہے جسے گھوڑے کھینچ رہے ہیں۔ برہما رتھ بان ہے اور سوریہ تیر چلا رہا ہے ایک دوسری جگہ پر مہا بھارت اور رامائن کے قصّے کہانیوں اور ان جنگوں کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ صرف چھینی ہتھوڑے کی مدد سے پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں کو کاٹنے اور پھر ان کو مندروں، مجسموں اور بڑے بڑے جانوروں کی شکل دینے میں کتنا وقت لگتا ہوگا۔ لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کھٹ کھٹ کیے جاؤ تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

کیلاش مندر کے علاوہ ایلورا میں بدھ متی اور جینی مندر بھی ہیں، جن میں ان دھرموں کے مطابق مورتیاں بنائی گئی ہیں۔ ان مندروں کو دیکھنے کا صحیح وقت شام کا ہے جبکہ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ان غاروں کے اندر پہنچ کر ایک عجیب سماں پیدا کر دیتی ہیں۔ چٹانوں پر سرخ رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ بدھ کی قدآدم مورتیاں مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ کیلاش کا دھواج ستمبھ آکاش سے باتیں کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور دیکھنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ یہ سب کام ہمارے ہی پُرکھوں نے صرف چھینی ہتھوڑے کی مدد سے دھرم کی سچی لگن کے سہارے انجام دیا ہے۔

حضرت ساحر بھوپالی

بڑے ہو کر یہ آخر کیا بنیں گے؟

یہ آوارہ، غریب اور خوار بچّے
یہ ننگے، بھوکے اور بیمار بچّے

یہ بے وارث ہیں ماں اور باپ ہوتے
یہ پھرتے ہیں سر بازار روتے

جو وارث ہیں وہی نظریں چُرائیں
یہ پھر ماتا پتا کس کو بنائیں

ہے فٹ پاتھوں کی رونق ان کے دم سے
مٹے جاتے ہیں یہ دنیا کے غم سے

نہ ان کی پرورش کا کوئی ساماں
نہ ان کو منہ لگائے کوئی انساں

سڑے پھل یہ کہیں کھاتے ملیں گے
کہیں یہ ہاتھ پھیلاتے ملیں گے

کسی دل میں نہیں ہے ان کی عزّت
ہر اک کو اِن کی صورت سے ہے نفرت

جہالت اِن کی گھٹّی میں پڑی ہے
شرافت دور اِن سے ہو چکی ہے

یہ دنیا بھر کی نظروں میں کمینے
مصیبت اِن پہ ہے بارہ مہینے

یونہی کب تک یہ ناکارہ رہیں گے
بڑے ہو کر یہ آخر کیا بنیں گے

اِنھیں اس حال میں کس نے کیا ہے؟
قصور اِن کا نہیں ہے قوم کا ہے

مفتوں کوٹوی

جن پکڑا گیا

رضیہ اشفاق کا انتظار کر رہی تھی اور جب وہ اسکول سے آیا تو وہ اس کے پیچھے پڑ گئی "بھائی جان! ہمیں اندھے کی کہانی سنائیے۔ جب بھیک دینے والے نے کہا کہ تیری ایک آنکھ ٹھیک معلوم ہوتی ہے تو اس نے کیا کہا؟"

اشفاق بولا "اس نے کہا کہ اگر میری ایک آنکھ ٹھیک معلوم ہوتی ہے تو آپ دو آنے کے بجائے ایک آنہ ہی دے دیجیے۔"

"اور وہ استری، استری کی کہانی؟"

اشفاق بولا "ایک ماسٹر نے دیہے کے لڑکوں سے پوچھا، ہندی میں بیوی کو کیا کہتے ہیں؟ رفیق نے جواب دیا، استری"

"پھر ماسٹر صاحب نے شفیق سے پوچھا، اچھا ہندی میں خاوند کو کیا کہا جاتا ہے؟"

شفیق بولا "اُسترا"

اس پر رضیہ بڑی خوش ہوئی۔ دادی اماں بھی سن کر ہنسنے لگیں۔ کچھ دنوں سے اشفاق بھیا رضیہ کو بڑے اچھے لگنے لگے تھے۔ وہ اسے عمدہ عمدہ کہانیاں سناتے۔ نہ معلوم انھیں یہ کہانیاں کہاں سے یاد ہو گئی تھیں۔ دادی اماں بھی حیرت میں تھیں۔ اشفاق اب ان سے کہانیاں سننے کے بجائے انھیں کہانیاں سنایا کرتا۔ عجیب عجیب

کہانیاں، پریوں کی بھوتوں کی، سونے کے گھوڑے اور چاندی کے ہاتھی کی۔ ایک سنہری مچھلی کی کہانی۔ پرسوں اس نے بڑی ہی دل چسپ کہانی سنائی تھی دادی اماں اس سے کہانیاں سنتیں اور خوش ہوتیں۔

اشفاق نے اپنے ساتھی کھلنڈروں پر بھی اپنی 'جنرل نالج' کا کافی رعب جما دیا تھا۔ جب اس نے سنایا کہ کیلی فورنیا میں ایک ماہی گیر نے مچھلی پکڑی تو اس کے دو منہ تھے۔ اور وہ ان دونوں سے کیڑے مکوڑے کھاتی تھی۔ اس کا ایک منہ بند کر دیا جائے تو وہ دوسرے منہ سے بھی زندہ رہ سکتی تھی ۔۔۔۔ تو صادق میاں کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اشفاق نے اور رعب جمایا ۔۔۔ "ڈبا سٹے نامی ایک ماہی گیر نے سمندر میں جال ڈالا تو اس میں تین فٹ کے قریب ایک لمبی مچھلی پکڑی گئی۔ اس مچھلی کی آنکھ پر عینک چڑھی ہوئی تھی۔ اور عینک کے سرے گلپھڑوں اٹکے ہوئے تھے"۔

اس نے چار آنکھوں والی ایک مچھلی کا حال سنایا۔ جس کی دو آنکھیں پانی کے اوپر والی چیزوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ اور دو آنکھیں پانی کے اندر کی چیزوں کو۔

اس کے سب ساتھی تعجب سے ایسی باتیں سنتے اور وہ اسے اب اپنے سے کچھ بڑا اور واقف کار سمجھنے لگے تھے۔

اس نے بتایا کہ دہلی کے ایک جانور پالنے والے شوقین نے ایک عجیب و غریب گلہری پکڑی جس کے جسم پر سیاہ و سفید دھاریوں کے بجائے سونے اور چاندی کے رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اور وہ عام گلہریوں کی طرح ہر چیز نہیں کھاتی تھی۔ بلکہ مخصوص پھل کھاتی تھی۔

اس نے کراچی کے دو سینگ والے ایک طوطے کا ذکر کیا۔ جس کی عمر دو سال ہے اور وہ طوطا بڑے مزے کی

باتیں کرتا ہے۔ اس کے سینگ ہڈی کی طرح سخت ہیں۔

اشفاق نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اس نے ایک جن تابع کر لیا ہے۔ اور وہ جن یہ سب باتیں اسے بتایا کرتا ہے۔ اس کے ساتھی بڑے دبدھے میں تھے کہ اس کی بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔ لیکن اشفاق کے جن کو دیکھنے کا شوق ضرور رکھتے تھے۔

ایک بار درجے کے ساتھیوں کو اس نے بتایا کہ مسولینی ایک لوہار کا بیٹا تھا۔ نادرشاہ۔ شہنشاہ ایران ــ ایک گڈریا تھا۔ سکتگین ایک معمولی غلام تھا۔ ایک ہرنی نے دعا دی اور وہ بادشاہ بن گیا۔ شیکسپیئر ایک لکڑی بیچنے والے کا بیٹا تھا۔ اسی طرح لارڈ کلایو ــ بنگال کا پہلا گورنر ــ ایک معمولی کلرک تھا۔ نپولین بونا پارٹ، فرانس کا معمولی سپاہی تھا۔ ہٹلر ایک معمولی مصور تھا۔ اور جارج واشنگٹن امریکہ کا پہلا صدر، ایک کسان کا لڑکا تھا۔

اس کے ہم جماعت اس کی یہ باتیں سنتے اور حیران ہو کر سوچے کہ اشفاق نے یہ سب باتیں آخر کہاں سے معلوم کیں؟ اشفاق اپنے فرماں بردار جن کے قصے سناتا اور کہتا، یہ سب باتیں مجھے وہی بتاتا ہے۔

آخر یار لوگوں نے بیڑا اٹھایا کہ اشفاق کے جن سے ملاقات کرنی چاہیے۔ انھیں یقین تھا کہ اشفاق بڑ ہانکتا ہے۔ لیکن اسے جھوٹا کیسے ثابت کیا جائے۔ اشفاق نے بتایا کہ ہر صبح جب وہ ٹہلنے جاتا ہے تو شہر کے کنارے ایک کھنڈر عمارت میں وہ جن اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے پہنچنے پر جن دنیا جہان کے نئے نئے تازہ بہ تازہ حالات بتاتا ہے۔

سراج ان میں بڑا جیالا لڑکا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اشفاق کے جن کا پتہ لگا کے چھوڑوں گا۔ ایک روز صبح تڑکے

اشفاق کے پیچھے لگ گیا۔ بہت
آہستہ آہستہ۔ اشفاق کو ذرا
پتہ نہ چلا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا
ہے۔ اشفاق کے ہاتھ میں ایک چیز
سفید رومال میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور
وہ اسے بڑی حفاظت کے ساتھ
لیے چلا جا رہا تھا۔ اس کھنڈر عمارت
میں اشفاق اوپر چڑھ کر ایک
جھروکے میں بیٹھ گیا۔ اس نے رومال
میں لپٹی ہوئی ایک کتاب جیسی چیز
نکالی۔ دور سے سراج کو ایسا ہی
نظر آیا۔

ادھر اُدھر دیکھ کر اشفاق نے
اسے کھولا۔ پہلے کچھ ورق الٹتا
پلٹتا رہا۔ پھر ایک جگہ سے پڑھنے
لگا۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ پڑھنے
میں اتنا منہمک ہو گیا کہ اسے یہ
خبر بھی نہ رہی کہ سراج اس کے
سر پر آگیا ہے۔ سراج نے فوراً
اس کے سامنے سے وہ کتاب
اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ارے
یہ تو ایک رسالہ ہے — "پیام تعلیم"
— اچھا یہ ہے آپ کا جن؟ جو
آپ کو عجیب عجیب قصے سناتا ہے۔
اور نئی نئی معلومات بتاتا ہے۔

اشفاق کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

اسی روز شام کو اسکول سے
نکلتے ہی اشفاق کے ہم جماعت
لڑکے سراج کو لیے ہوئے اپنے
شہر کی انوار بک ایجنسی پر کھڑے
تھے۔ اور "پیام تعلیم" خرید رہے
تھے۔ بہت خوش تھے۔ کہ اشفاق
کی طرح انھوں نے بھی معلومات
کے جن پر قبضہ کر لیا ہے —

نہرو پروجیکٹ

۲۷ اگست ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب ابتدائی جماعت کے طلبا، نہرو پروجیکٹ کے سلسلے میں پنڈت جی سے ملنے ان کی کوٹھی پر گئے تھے۔ پنڈت جی بچوں سے بڑی محبت سے پیش آئے اور دیر تک بچوں کے سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ بیچ بیچ میں مزے مزے کی باتیں بھی کرتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے ــ "کیا میں بھی اس پروجیکٹ کا حصہ ہوں؟" بچوں نے چاچا نہرو زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا ــ "آپ سے ملنے کا مقصد تو یہی تھا۔" اس پر پنڈت جی نے فرمایا ــ "اچھا اچھا اب تو آپ کا یہ مقصد پورا ہوگیا۔" یہ کہتے ہوئے بچوں کو چمکارتے اور پیار کرتے ہوئے دوسرے مہمانوں سے جو ان کی کوٹھی میں جمع تھے ملنے چلے گئے۔ آج بھی جب اس ملاقات کی یاد آتی ہے تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ بعد میں جب پنڈت جی جشن چہل سالہ کے موقع پر جامعہ تشریف لائے تو یہ پروجیکٹ بھی دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکراتے رہے۔ بچوں نے پروجیکٹ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سید منیر الحسن

(استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ)

بھولا لڑکا

جب پنڈت جی چھوٹے سے تھے، قریب قریب ۱۲ سال کی عمر ہوگی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ آپ ٹہلتے ٹہلتے اپنے باپ کے کمرے کی طرف چلے آئے وہاں انھوں نے دیکھا میز پر دو فاؤنٹین پن رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو قلم لگانے کا بہت شوق تھا۔ آپ نے سوچا کہ پتا جی ایک قلم سے کام کرتے ہوں گے۔ انھیں دو قلموں کی کیا ضرورت ہے۔ اس لیے ان میں سے ایک لے لینا چاہیے جسے لگا کر میں بھر ٹھاٹھ کے ساتھ چلوں گا۔

لیکن نتیجہ اس کا الٹا نکلا جب آپ کے پتا جی کمرے میں آئے میز پر ایک ہی قلم دیکھا تو نوکروں پر بہت بگڑے سب کی تلاشی لی گئی کسی کے پاس قلم نہیں نکلا ننھے جواہر کو بلایا ننھا جواہر پتا جی کی ڈانٹ سن کر ڈر گیا۔ جب ان کی جیب سے قلم نکلا تو ان کے والد کے غصہ کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اتنا مارا کہ سارا بدن نیلا پڑ گیا۔

آپ کی ماتا کو اس سے بہت دکھ ہوا ماتا نے پوچھا: "بیٹا تم نے قلم کیوں لیا تھا"۔ اس پر آپ نے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا: "ماں میں نے چوری نہیں کی تھی۔ لگانے کے لیے لیا تھا"۔ ماں نے جواب دیا: "کسی کی چیز بغیر اجازت لینے ہی کو چوری کہتے ہیں"۔

آپ نے اس دن سے کسی کی چیز بغیر اجازت کے نہیں لی۔

(فیروز احمد، پنجم ب)

گاندھی جی کے وارث

آزادی کے بعد مہاتما گاندھی جی کے شہید ہو جانے کی وجہ سے پنڈت جی کو بہت تکلیف ہوئی۔ ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو کہا کہ "آج ہماری زندگی کو روشنی دینے والا چلا گیا"۔

پارلیامنٹ میں کہا: "آج ہماری شان چلی گئی"۔ پھر بھی انھوں نے ہمت

نہیں ہاری۔ وہ گاندھی جی کے بہت سے اصولوں کو مانتے تھے اور زندگی بھر ان کی روشنی میں کام کرتے رہے۔

اس لیے گاندھی جی نے اپنی زندگی میں ہی ان کو اپنا وارث بنایا اور کہا کہ "جب میں نہیں رہوں گا تو اس وقت جواہر میری نمائندگی کرے گا"۔

سچ تو یہ ہے کہ پنڈت جی نے امن کے مسافر کی حیثیت سے گاندھی جی کا امن اور شانتی کا پیغام دنیا کو پہنچایا۔

انیق الرحمٰن انصاری

پنجم ب

پنڈت جی کے معمولات

پنڈت جی روزانہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتے تھے۔ ہاتھ منہ دھوکر ورزش کرتے تھے۔ شیشش آسن کرتے تھے۔ پھر ورزش کرکے نہاتے تھے۔ ان کے نہانے میں صرف پانچ منٹ لگتے تھے۔ اس کے بعد ناشتہ کرتے اور پھر آئے ہوئے خطوط کے جواب لکھواتے۔ پھر فائل دیکھتے۔ قریب دس بجے باغیچے میں پہنچ جاتے اور آئے ہوئے مہمانوں سے ملتے اور دوسرے لوگوں کا دکھ درد سنتے پھر اپنے دفتر چلے جاتے۔ پنڈت جی وقت کے پابند تھے، وقت پر ہر ایک کام کرتے تھے۔ پنڈت جی جب کسی جگہ پر جاتے تو اپنے ساتھ کتابیں ضرور لے جاتے۔ اور اپنے پڑھنے کا وقت نکال لیتے۔ دفتر میں وہ الگ الگ شعبوں کے آئے ہوئے ضروری کاغذات دیکھتے اور جواب لکھواتے پھر دوپہر کو کھانا کھاتے اور تیسرے پہر کو چائے کے ساتھ کچھ پھل اور نمکین چیز کھاتے۔ شام کو پھر مہمانوں کا تانتا لگ جاتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ فائل بھی دیکھتے جاتے تھے اور مہمانوں سے بھی بات چیت کرتے رہتے تھے، اس طرح رات کے بارہ یا ایک دو روزانہ بج جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو رات کے دو ڈھائی بجے تک جواب لکھواتے رہتے اور اس کے بعد وہ سو جاتے اور پھر صبح پانچ بجے اٹھ جاتے تھے، اس طرح ان کا روزانہ کا یہ معمول چلتا رہتا تھا۔

تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنی عمر میں ایسی سخت محنت کیسے کر لیتے تھے۔

ظفر اللہ خاں، ابتدائی پنجم ب

پنڈت جی کی ہمدردی

پنڈت جی کی یاد داشت بہت تیز تھی اور وہ دوسروں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ ملایا جا رہے تھے تو ایک ہندستانی نے ان کو لکھا کہ ان کا لڑکا بیمار ہے جس۔ دوا کی ضرورت ہے وہ ملایا میں ملتی ہے۔ آپ لیتے آیے گا۔ پنڈت جی نے ملایا پہنچ کر اس بات کو یاد رکھا۔

اگرچہ کام بہت تھا پھر بھی وہ اسے بھولے نہیں۔ دوا لے کر آئے اور اس بچے کے لیے بھجوائی۔

اسی طرح ایک مرتبہ جب پنڈت جی الہ آباد میں تھے تو ان سے ایک عورت ملنے کے لیے آئی اور کہنے لگی کہ "آپ تو ہمیں بھول گئے" پنڈت جی نے بڑی محبت سے جواب دیا اور کہا "بھولنے کی بات کیسے ہو سکتی ہے" اس کے بعد ان کی کچھ روپے پیسے سے مدد کی۔

اس کے علاوہ بھی وہ لوگوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

اعجاز احمد فاروقی پنجم ب

پنڈت جی کی محنت

پنڈت جی سچ مچ بہت محنت کرتے تھے وہ شاید ہی کبھی ایک بجے رات سے پہلے سوتے ہوں۔ کبھی کبھی تو دو بجے تک کام کرتے رہتے تھے۔ ایک بجے رات کو لوگوں کو ملنے کا وقت دیتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ پنڈت جی ۱۹۵۱ء میں جب کانگریس کے صدر تھے تو تھی دنوں انتخاب ہونے والے تھے۔ تب پنڈت جی آٹھ آٹھ گھنٹے کانگریس کے دفتر میں لگاتار کام کرتے تھے اس وقت ان کے ساتھی گھبرا اٹھتے تھے ان کے ایک دوست شری پرکاش جی نے کہا تھا "بابا جواہر تو کام کرنے میں بھوت ہیں بھوت۔ انھیں نہ نیند چاہیے نہ کھانا" لیکن ہم

لوگوں کو کھانا اور نیند دونوں چاہیے۔
(انوارالحق، پنجم ب)

امن کا مسافر

پنڈت جی ۱۳ر جولائی ۱۹۵۵ کو صبح کے سوا بارہ بجے پالم کے ہوائی اڈے پر اترے تھے اس دن شہر دہلی کے ہزاروں آدمی صبح کے ۴ بجے سے ہی ہوائی اڈے کی طرف چل پڑے تھے۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنتھ کے علاوہ دوسرے عہدے دار اور شہر دہلی کے معزز شہری وہاں پر موجود تھے۔ پنڈت جی روس اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگوں کے دلوں کو جیت کر آرہے تھے۔ یہ ان کا تاریخی دورہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دیکھنے اور ان کا استقبال کرنے کے لیے جنتا بہت بے چین تھی۔

جس وقت پنڈت جی ہوائی جہاز سے اترے تو ہوائی اڈے پر ہر طرف سے جواہر لال زندہ باد کی آواز آرہی تھی۔ پنڈت جی اس وقت مسکرا رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ پنڈت جی کو دیکھنے کے شوق میں بے قابو ہوچکی تھی اور سارا انتظام بگڑ گیا تھا۔ آج بھی اس تاریخی دورے کی یاد لوگوں کے دلوں میں اسی طرح تازہ ہے۔
(الٰہی نور، پنجم ب)

طاقت کا دریا

پنڈت جی ملک کو آزاد کرانے والے تھے ملک کے وزیر اعظم تھے، وزیر خارجہ تھے، منصوبہ کمیٹی کے صدر بھی تھے، جنتا کے لیڈر تھے، پارلیمنٹ کے ممبر تھے، اس کے کاموں میں مصروف رہتے تھے، ملک کا دورہ کرتے تھے۔ غیر ملکی سفیروں اور مہمانوں سے ملتے تھے۔ قومی اور دوسرے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ بچوں سے ملتے تھے۔ اتنا سب کچھ کرتے ہوئے دیکھ کر دوسرے ملکوں سے آنے والے مہمان حیران ہوکر سوچتے تھے کہ ایک آدمی میں یہ سب کام کرنے

کی طاقت کہاں سے آتی ہے ۔ اس کا جواب سیدھا سادھا ہے ۔ ان کی طاقت ہندستان کی جنتا کا پریم تھا ۔ جنتا کا پریم ہی ان کو کام کرتے رہنے کی ہمت دلاتا تھا ۔ اس کے علاوہ وہ بچوں سے بہت پریم کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا جنم دن بچوں کے لیے ایک خوشی کا موقع بن گیا تھا ۔ اور چچا نہرو اس دن بچوں کی آنکھوں میں آنے والے ہندوستان کی تصویر دیکھتے تھے وہ کتنے ہی کام میں کیوں نہ لگے ہوں بچوں کے آتے ہی بچے بن جاتے تھے ۔ وہ ہندستان کے نہیں دنیا بھر کے بچوں سے پیار کرتے تھے ۔ سیاست کے علاوہ پنڈت جی کو کتابیں پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا ۔ دنیا کی تاریخ پر انھوں نے بڑی اچھی کتاب لکھی ہے اتنے مصروف ہوتے ہوئے بھی وہ پڑھنے کے لیے تھوڑا بہت وقت نکال ہی لیتے تھے ۔ آج بھی ان کے لکھے ہوئے مضامین اور تقریروں کے کئی مجموعے بازار میں ملتے ہیں ۔ ان کی ایک کتاب میری کہانی ؛ دنیا کی مشہور کتابوں میں سے ہے ۔ سائنس اور آرٹ بھی انھیں پسند تھا ۔ کھیل ، تماشے ، گھوڑے کی سواری کرنا ۔ یہ سب کام بھی انھیں پسند تھے ۔

ان کی ان باتوں کو دیکھ کر ہی گاندھی جی نے کہا تھا کہ

"جواہر طاقت کا ایسا دریا ہیں جس سے ہندوستان ہمیشہ طاقت حاصل کرتا رہے گا ۔"

(عبدالنعیم ، پنجم ب)

چاچا نہرو

بچوں نے چاچا نہرو کے عنوان سے جو نظمیں اپنی پسند سے لکھیں ان کا ایک ایک شعر ان نظموں میں سے انتخاب کرکے درج کیا جا رہا ہے :۔

نہرو ہمارے لیڈر ہیں (۱) پیارے پیارے رہبر ہیں
(ابوبکر تبتی، عمر ۱۲ سال)

سر پر اس نے لاٹھی کھائی (۲) آزادی کی لڑی لڑائی
(مختار احمد، عمر ۱۱ سال)

سیدھی راہ دکھانے والے (۳) جنتا کا غم کھانے والے
(محمد عباس، عمر ۱۲ سال)

امن کا چرچا کرنے والے (۴) نہیں کسی سے ڈرنے والے
(عبدالحامد تبتی، عمر ۱۱ سال)

امن کی باتیں کر آتے ہیں (۵) دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں
(عبداللہ تبتی، عمر ۱۱ سال)

سب سے ہیں یہ کہہ کر آتے (۶) چین ہیں جاتے روس ہیں جاتے
(عبدالمجید تبتی، عمر ۱۱ سال)

سب کی آنکھ کے تارے ہیں (۷) جنتا کے وہ پیارے ہیں
(غلام حسین، عمر ۱۲ سال)

ساری ہی دنیا کے پیارے (۸) اندھیارے کے روشن تارے
(معین عباسی، عمر ۱۲ سال)

پیار سے پاس بلاتے ہیں (۹) جب بھی یہاں وہ آتے ہیں
(محمد اسلام، عمر ۱۱ سال)

عبدالرحیم نشتر، ربانی ہائی اسکول کامٹی

"تجھ سا کہاں سے لائیں"

(چاچا نہرو کی موت پر ایک بھتیجے کے تاثرات)

ہم کس کے پاس جائیں
زخمِ جگر...... دکھائیں
کیا حالِ دل... سنائیں ——— تجھ سا کہاں سے لائیں
ٹوٹا گگن سے تارا
پھوٹا ہے غم کا دھارا
کہتا ہے دل بے چارا ——— تجھ سا کہاں سے لائیں
کیسے یہ غم سہیں گے
کس طرح ہم رہیں گے
چاچا کسے کہیں گے ——— تجھ سا کہاں سے لائیں
افسردہ ہر کلی ہے
رنجیدہ ہر گلی ہے
ہر چیز کہہ رہی ہے ——— تجھ سا کہاں سے لائیں
روتی ہے آج دھرتی
گریاں ہے آسماں بھی
رنجیدہ ہے فضا بھی ——— تجھ سا کہاں سے لائیں

مدرسہ ابتدائی کے بچے

بچوں کی کوششیں

پنڈت جواہر لال نہرو

چاچا نہرو بچوں کے پیارے چاچا تھے۔
وہ بڑوں کے محبوب رہنما تھے۔ چاچا جی کی
عزت نہ صرف ہندوستان میں تھی بلکہ دنیا
کے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی ان سے
محبت کرتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔
چاچا کو گلاب بہت پسند تھا اور وہ خود
بھی ایک گلاب کے مانند تھے جو ساری
دنیا کو اپنی خوشبو سے مہکا رہا تھا۔ لیکن
یہ گلاب ایک دن مرجھا گیا اور ۲۷ مئی سنہ ۱۹۶۴ء
کو ریڈیو نے یہ خبر نشر کی کہ
ہندوستان کا عظیم رہنما چل بسا۔ یہ خبر
دنیا کے کونے کونے میں بجلی کی طرح پھیل
گئی اور ہندوستان پر رنج و غم کے بادل
چھا گئے۔ دنیا مغموم ہو گئی۔

پنڈت جی ۱۴ نومبر سنہ ۱۹۸۹ء کو
الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد
کا نام پنڈت موتی لال نہرو تھا۔ وہ الہ آباد
کے بڑے نامی وکیل تھے۔ چاچا کی ابتدائی
تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ جواہر لال جی جب
کچھ بڑے ہوئے تو ۱۹۰۵ء میں انگلستان
بیرسٹری پڑھنے پہنچ گئے۔ وہ وہاں سات
سال تک رہے اور بیرسٹری کی تعلیم ختم
کر کے ۱۹۱۲ء میں الہ آباد آگئے اور یہیں
بیرسٹری شروع کی۔ لیکن بیرسٹری شروع
کیے چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ آپ کی
ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی اور آپ

مہاتما جی کی تحریک سے بہت متاثر ہوئے اور بیرسٹری چھوڑ دی۔

جاوید لطیف عمر ۱۲ سال

ابتدا میں مہاتما جی کے طریقوں کو سمجھنے کے لیے وہ ان کے ساتھ رہے۔ ان کے مضامین کا مطالعہ بڑی دل چسپی سے کرتے تھے۔ آخر کار ۱۹۱۶ء سے آپ کا پورا خاندان ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شریک ہو گیا۔ اس سے پہلے آپ اور آپ کے خاندان کے تمام ممبران بڑے قیمتی کپڑے پہنتے تھے۔ ان کے کپڑے فرانس سے دھل کر آتے تھے۔ ہندوستان کے دھوبی اُن کی نفاست کے مطابق کپڑے نہیں دھوتے تھے۔ لیکن جب وہ سودیشی کی تحریک میں شریک ہوئے تو ۱۹۱۹ میں سارے بدیشی کپڑے جلا دیے اور بہت بڑی ہولی منائی اس کے بعد سے آپ کے خاندان کے تمام ممبروں نے ہاتھ کے بُنے ہوئے سوت کا بنا ہوا کپڑا پہننا شروع کر دیا جو بہت موٹا اور بہت بھدا ہوتا تھا۔ ۱۹۱۶ میں آپ کی شادی کملا کنول سے ہو گئی۔ اور شادی کے ایک سال بعد ۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو اندرا جی پیدا ہوئیں۔

محمد اقبال عثمانی عمر ۱۲ سال

آپ نے اور آپ کے پتا جی نے بیرسٹری کرنا چھوڑ دی اور گھر کے تمام ہی ممبر گاندھی جی کی چلائی ہوئی تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔ آپ نے ملک کا دورہ کر کے دیکھا کہ واقعی ہندوستان کی حالت بہت خراب ہے۔ انگریزی راج میں ہندوستانیوں کو بہت تکلیف دی جا رہی ہے اور ہندوستانی دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ آپ نے انگریزی حکومت کی خرابی اور اس سے پیدا ہونے والے مظالم کی داستانیں جگہ جگہ بیان کیں۔ انگریزوں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی اور انھوں نے پنڈت جی کو جیل بھیج دیا۔ مگر آپ جب جیل سے باہر آتے تو آپ پھر انگریزوں کی حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے اور انگریز پھر آپ کو جیل بھیج دیتے اس طرح آپ ہندوستان کی

آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں گیارہ بارہ بار جیل گئے۔

تمام ملکوں کے لوگ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے اس لیے کہ آپ دنیا کے ملکوں کے درمیان امن قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ وہ دنیا کے کسی گروپ اور دھڑے میں شامل نہ تھے اور اس ناطرف داری کی پالیسی کی وجہ سے دنیا کی سیاست میں ان کی بات کا وزن ہوتا تھا۔

پنڈت جی جو بات کہتے تھے اس کو ان کے ملک میں سب ہی لوگ مان لیتے تھے۔ انھیں ہندوستان کے لوگوں سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ ہر ایک سے محبت کرتے تھے

پنڈت جی نے ملک کی آزادی کے لیے بہت قربانیاں دیں۔ جیل کی سختیاں تو انھوں نے دوسرے رہنماؤں کی طرح برداشت ہی کیں یہاں تک کہ صحت بھی خراب ہو گئی لیکن تن اور من کی قربانی کے ساتھ ساتھ دھن کی قربانی بھی بہت زیادہ ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ لاکھوں روپے کا قیمتی کپڑا جلا دیا۔ اپنی کوٹھی جو اب سوراج بھون کے نام سے مشہور ہے کانگریس کو دے دی۔ ابتدا میں اپنی کار میں ہی آس پاس کے دیہاتوں میں پرچار کرتے جاتے اور اکثر ریل کا کرایہ خود ادا کرتے۔ بیرسٹری انھوں نے بھی چھوڑ دی اور ان کے والد صاحب نے بھی اور اس طرح لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی پر لات مار دی۔ یہ سب قربانیاں انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے کیں۔ یہ بات انھیں کے خاندان میں دیکھی کہ گھر کا ہر فرد آزادی کے کام میں لگ گیا اور حکومت کے خلاف کام کرنے کے الزام میں جیل گیا۔ اس میں ان کے ملازم بھی شامل ہوتے تھے۔

پنڈت جی جب جیل میں ہوتے تھے تو کتابیں لکھتے تھے یا باغبانی کرتے تھے۔ ان کی تصانیف "بیٹی کے نام خطوط" "دنیا کی تاریخ کی جھلک" اور "خود نوشت سوانح حیات" خاص طور پر قابل

ذکر ہیں

عبدالرحمٰن جامی عمر ۱۵ سال

پنڈت جی رات کو ایک بجے تک
کام کرتے تھے اور صبح چھ بجے اٹھ جاتے
تھے۔ ان کی معلومات بہت تھی اور ہر مسئلہ
پر بڑی بے تکلفی سے بات چیت کرتے تھے۔
گھوڑے کی سواری اور تیراکی کا بڑا شوق
تھا۔ کرکٹ بھی کھیل لیتے تھے۔ وہ چھوٹے
سے چھوٹے کسان سے بھی بات کر لیتے
تھے جو اس کے لیے باعث دل چسپی
ہوتی تھی اور دنیا کے بڑے سے بڑے
سیاست دان سے بھی گھنٹوں مسائل کے
کے سلجھانے کے بارے میں باتیں کرتے
تھے۔

افسر امین عمر ۱۰ سال

سوال یہ ہے کہ جب وہ اتنے
بڑے اور اتنی خوبیوں کے آدمی تھے
تو انھوں نے ہندوستان کو کیا دیا۔
اس ملک میں ان کے بہت سے کارنامے
ہیں اور بہت سی خوبیوں کی انھوں
نے داغ بیل ڈالدی ہے ہندوستان

بہت بڑا ملک ہے۔ اتنا بڑا جتنا کہ روس
کو نکالنے کے بعد یورپ کا برِّ اعظم
ہے۔ اتنے بڑے ملک کو پنڈت جی
نے ایک رکھا۔ اس ملک میں مختلف
زبانیں ہیں، مختلف مذہبوں کے ماننے
والے ہیں، مختلف تہذیبوں کو
برتنے والے ہیں اور کتنی ہی سیاسی
پارٹیاں ہیں۔ ذات پات کے مسائل
اپنی پوری شدّت کے ساتھ موجود ہیں
پھر بھی یہ ملک ایک ہے۔ ورنہ یورپ
کی طرح یہاں بھی سترہ ملک ہوتے۔
لیکن ایسا نہیں ہے تو یہ پنڈت جی
کی ہمہ گیر شخصیت کی وجہ سے ہے۔

غلامی کے زمانہ میں ہندوستان
سوئی اور پن تک کے لیے دوسرے
ملکوں کا محتاج تھا۔ سلے ہوئے کپڑے
جاپان سے آتے تھے یعنی ہماری محتاجی
کی انتہا ہوگئی تھی۔ اقبال مرحوم نے اسی
پر کہا تھا ؎

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

لیکن انھوں نے ان سترہ سالوں میں ملک کو اس قابل کر دیا کہ ہزاروں صنعتوں میں ہندوستان خود کفیل ہو گیا اور اپنے ملک میں تمام چیزیں تیار ہونے لگیں۔

پنڈت جی کسی گٹھ جوڑ کے قائل نہ تھے اور نہ ہی وہ کسی حال میں جنگ کے حامی تھے۔ وہ ہر مسئلہ کو خواہ وہ سرحدوں کا ہو، خواہ نہروں کا ہو اور کسی ملک میں لیڈر شپ کا ہو صلح اور بات چیت کے ذریعہ طے کرنے کے حامی تھے اس سے ہندوستان کا دنیا میں اونچا مقام رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو تمام دنیا نے چین کو الزام کے قابل سمجھا۔

یوسف حسین انصاری عمر ۱۱ سال

ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے پنڈت جی بعض مسئلوں کو اپنی زندگی میں حل نہ کر سکے ان میں کشمیر کا مسئلہ ہر سال اپنی پوری شدت سے آتا رہا اور ابھرتا رہا۔ یہی حال چین اور ہندوستان کے سرحدی جھگڑوں کا رہا۔ ان مسائل کی موجودگی سے بچاؤ کے محکمہ کا خرچ برابر بڑھتا رہا اور دوسری باتوں کی طرف پوری توجہ نہ دی جا سکی مثلاً خوراک کی پیداوار کا مسئلہ۔ ملک میں غذائی بدحالی نے ایک ایک فرد کو پریشان کر دیا ہے۔

سید وسیم احمد عمر ۱۲ سال

خلیق انجم اشرفی

حسابی جادوگر کے جادو

انگریزی میں بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب ہے بہت ہی دلچسپ "الائس ان ونڈرلینڈ"۔ اس کے مصنف لیوس کیرل مصنف بھی تھے۔ پادری بھی تھے اور بہت بڑے حساب داں بھی تھے۔ انھیں بچوں سے بڑی محبت تھی۔ بچے بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ لیوس انھیں کہانیاں سنانے کے علاوہ حساب کے دلچسپ اور حیرت انگیز کھیل بھی بتایا کرتے۔ بچوں میں وہ حسابی جادوگر کے نام سے مشہور تھے۔

ایک دن وہ بچوں کی ایک پارٹی میں مدعو تھے۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد بچے کوئی نئی کہانی سننے کے شوق میں ان کے گرد جمع ہو گئے۔ لیوس کیرل بولے: "بھئی تم لوگ اسکول میں جمع کے سوال تو کرتے ہی ہو گے؟"

"جی ہاں!" بچوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"جواب کیسے نکالتے ہو؟" لیوس نے عجیب سا سوال کیا۔

"دئے ہوئے عددوں کو جوڑ کر جواب نکال لیتے ہیں۔" ایک بچے نے حیران ہوکر جواب دیا۔

"تب میرا خیال ہے کہ تم لوگ کسی بہت ہی پھٹیچر اسکول میں پڑھتے ہو! میں تو جمع کے سوال کا جواب پہلے ہی لکھ دیتا ہوں۔

پنڈت جی جامعہ کے تعلیمی میلے میں
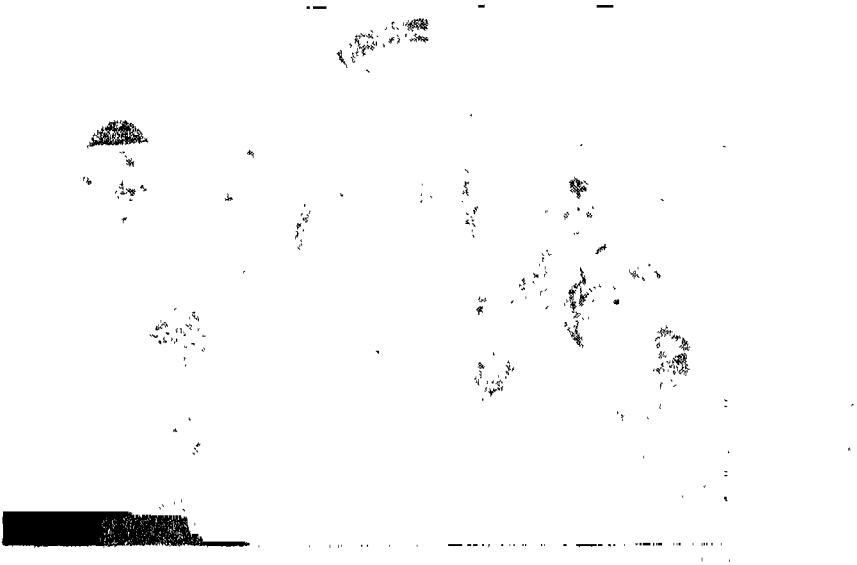
پنڈت جی مکتبہ جامعہ میں — جنرل منیجر استقبال کر رہے ہیں

جنرل منیجر پنڈت جی کو ان کی کتاب 'کچھ پرانے خط' پیش کر رہے ہیں

یہ کہہ کر انھوں نے ایک پرچے پر کوئی عدد لکھ کر اس بچہ کی ماں کو دے دیا جس کے گھر یہ پارٹی تھی اور پھر کاغذ پر ایک عدد ۱۰۶۶ لکھا پھر ایک چھوٹی بچی سے چار ہندسوں والا ایک عدد اس کے نیچے لکھنے کو کہا پھر انھوں نے ایک دوسرا چار ہندسوں والا عدد خود لکھا اور پھر ایک چھوٹے بچہ سے کوئی سا چار ہندسوں والا عدد لکھنے کو کہا، اور پھر پانچواں عدد خود لکھا اور جمع کا سوال اس طرح بن گیا۔

لیوس کیرل	۱۰۶۶
چھوٹی بچی	۳۴۷۸
لیوس کیرل	۶۵۲۱
چھوٹا بچہ	۷۱۵۰
لیوس کیرل	۲۸۴۹

لیوس کیرل نے ان عددوں کو ایک دوسرے لڑکے سے جوڑنے کو کہا جواب ۲۱۰۶۴ آیا اب انھوں نے اس بچہ کی ماں سے وہ پرچہ مانگا جس پر جواب پہلے سے لکھ دیا تھا، اور یہ دیکھ کر بچوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس پر وہی عدد لکھا ہوا تھا۔

پیامیوں کو یہ کھیل عجیب سا لگا ہوگا! لیکن اس کا بھید جان لینے کے بعد وہ بھی لیوس کی طرح اپنے دوستوں کو حیران کر سکتے ہیں۔ اس کا بھید یہ ہے کہ جو بھی عدد آپ پہلے لکھیں اس میں سے دائیں طرف سے دو کم کر کے وہی دو بائیں طرف لگا دیں جیسے کہ لیوس نے ۱۰۶۶ لکھا تھا۔ دائیں طرف سے دو کم کرنے پر عدد ۱۰۶۴ ہوگیا اور یہ دو بائیں طرف لگانے سے ۲۱۰۶۴ آگیا جو سوال کا جواب تھا۔ دوسری بات یہ کہ آپ کے بعد آپ کا دوست جو عدد لکھے اس کے نیچے ایسا عدد لکھیے کہ ہر دو ہندسوں کا جوڑ ۹ ہو جائے مثلاً اس نے آپ کے عدد کے نیچے ۳۱۲۲ لکھے تو آپ لکھ دیجیے ۶۸۷۷۔ اس طرح ہر دو ہندسوں کا جوڑ ۹ ہو جائے گا۔ کل عدد پانچ ہوں جن میں تین آپ لکھیں اور دو آپ کا دوست جس

...... اور اس بچے اور بچی نے لکھا یہی فارمولا چار سے زیادہ ہندسوں والے عدد میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ کل عدد پانچ ہوں۔

اس کھیل کے بعد لیوس نے ایک کھیل اور بتایا انھوں نے ایک لڑکے سے نیچے کے عدد لکھنے کو کہا

۱۲۳۴۵۶۷۹

جب اس نے لکھ لیے تو بولے "ارے بھئی! تمھاری لکھائی تو بہت خراب ہے بتاؤ تم نے کون سا عدد سب سے خراب لکھا ہے۔" "۵" لڑکے نے جواب دیا۔

"اچھا تو ذرا اسے "۴۵" سے ضرب کر کے تو دیکھو"۔ لیوس نے کہا۔ اور اس وقت لڑکے کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب حاصل ضرب کا ہر عدد ۵ آیا۔

یہ کھیل بھی بہت آسان ہے۔ "۱" سے لے کر "۹" تک کوئی بھی ہندسہ آپ حاصل ضرب میں لا کر اپنے دوستوں کو حیران کر سکتے ہیں۔ ترکیب یہ ہے کہ جو ہندسہ حاصل ضرب میں لانا ہو اس کا نو گنا کر کے اور جو عدد آئے اس سے اس عدد ۱۲۳۴۵۶۷۹ کو ضرب دیجیے حاصل ضرب میں وہی ہندسہ آئے گا۔ مثلاً آپ حاصل ضرب میں ۶ لانا چاہتے ہیں تو عدد کے نو گنا یعنی ۶ × ۹ = ۵۴ سے اس عدد کو ضرب دیجیے حاصل ضرب کا ہر ہندسہ ۶ آئے گا۔

امکانات شاندار ہیں!

انعامی مقابلے کے مضمون

(پہلا گروپ: ۶ سے ۱۲ سال)

آزادی کی خوشی (اول)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پنڈت جی آنند بھون کوٹھی کے سامنے باغ میں کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے ان کی نظر ایک پیڑ پر پڑی۔ وہاں چڑیا کا ایک گھونسلا تھا۔ اس گھونسلے میں چڑیا کے بچے تھے۔ پنڈت جی ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جلدی سے ایک ٹوکرا لائے اور ان میں سے ایک چڑیا کے بچے کو اس میں بند کر لائے جو چیں چیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے منشی جی کے پاس اسے لے گئے اور کہنے لگے دیکھیے یہ بچہ چیں چیں کرکے کیسا پھڑپھڑا رہا ہے۔ اور رو رہا ہے اسے اپنی ماں کی یاد آ رہی ہو گی۔

اس پر منشی جی نے ننھے جواہر کو سمجھایا کہ چڑیاں آزادی میں خوش رہتی ہیں۔ پیڑ کی ڈال پر پھدکنا اور ہوا میں اڑنا ان کو بھلا لگتا ہے۔ وہ پنجرے میں بند رہنا پسند نہیں کرتیں۔ سونے کا پنجرا بھی ان کو برا لگتا ہے۔ یہ سن کر ننھے جواہر نے چڑیا کے بچے کو چھوڑ دیا۔ بچہ پھر سے اڑ گیا۔ اور آزادی کی خوشی میں خوب چہچہایا۔

بچپن کی اسی چھوٹی سی بات نے ننھے جواہر کے دل اور دماغ پر

بڑا اثر ڈالا اور وہ جیسے جیسے بڑے
ہوتے گئے آزادی کی قیمت ان کی
نگاہ میں بڑھتی گئی اور وہ ہر قسم
کی غلامی کے خلاف ہو گئے، آخر
ہندوستان کی آزادی کے بعد تو وہ
دنیا کے آزادی چاہنے والوں کے
سچے دوست اور ہمدرد بن گئے اور
ان کے لیے ایک روشنی کا مینار ثابت
ہوئے یہی وجہ ہے کہ سب لوگ
ان کی عزت اور ان سے محبت کرتے
تھے۔

نسیمہ خاتون
ابتدائی پنجم جامعہ

چاچا نہرو (دوم)

چاچا نہرو بچوں کے پیارے چاچا
اور بڑوں کے محبوب رہنما تھے۔ ان
کی عزت صرف ہندوستان ہی میں
نہیں تھی بلکہ دنیا کے کونے کونے
میں تھی۔

چاچا نہرو کو گلاب کا پھول
بہت پسند تھا۔ اور چاچا جی بھی ایک
گلاب کے مانند تھے جو دوسروں کو
خوشبو پہنچا کر ان کے دماغ کو معطر کرتا
ہو۔ لیکن یہ گلاب بھی ایک دن مرجھا
گیا۔ اور ۲۷؍ مئی ۱۹۶۴ء کو یہ
افسوس ناک خبر ریڈیو سے نشر ہوئی
کہ ہندوستان کا عظیم رہنما چل بسا۔
یہ خبر لوگوں پر ایک بجلی کی طرح
گری اور پورے ملک پر رنج و غم
کا بادل چھا گیا۔

چاچا نہرو ۱۴؍ نومبر ۱۸۸۹ء
کو میرگنج الہ آباد میں ایک امیر خاندان
میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد
موتی لال نہرو بھی ہندوستان کے
بڑے رہنماؤں میں سے تھے۔

جب چاچا نہرو ۱۵ برس کے
ہوئے تو انگلینڈ بیرسٹری پڑھنے ۱۹۰۵
میں چلے گئے۔ اور ۱۹۱۲ء میں الہ آباد
واپس آکر وکالت شروع کی، لیکن
۱۹۱۳ء میں وکالت چھوڑ کر انڈین نیشنل
کانگریس میں شامل ہو گئے۔
۱۹۱۶ء میں چاچا کی شادی کملا کول

سے ہوگئی ۔ شادی کے ایک سال بعد ۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو اندرا پیدا ہوئیں (جو آج کل مرکزی حکومت میں ریڈیو اور محکمہ اطلاعات کی وزیر ہیں، اور جو اندرا گاندھی کہلاتی ہیں) اندراجی ابھی ۱۴ سال ہی کی تھیں کہ ۶ر فروری ۱۹۳۱ء کو پنڈت جی کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ ابھی یہ غم مٹا بھی نہ تھا کہ چاچا جی کی بیوی کملاجی بھی اس دنیا سے سدھار گئیں اور اس کے دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں پیارے چاچا کی والدہ سروپ رانی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور پورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو چاچا نہرو کو وزیر اعظم بنایا گیا، انھوں نے اپنے اس کام کو بڑی اچھی طرح انجام دیا۔ اور سترہ سال تک ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

۱۹۶۴ء کے شروع میں جے پور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تھا ۔ چاچا جی بھی جلسے میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے ۔ وہیں آپ پر فالج کا حملہ ہوا ۔ علاج سے بہتر ہوگئے ۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ لمبی چھٹی لے کر آرام کریں اور ٹھیک سے علاج کرائیں، کئی ملکوں نے اپنے یہاں آرام کے لئے بلایا بھی تھا مگر ان کو ملک کا کام اتنا پیارا تھا کہ انھوں نے نہ چھٹی لی نہ کہیں باہر گئے، بلکہ برابر کام کرتے رہے ۔ بالآخر ۲۷ر مئی کو صبح سویرے ان پر پھر فالج کا حملہ ہوا۔ اس مرتبہ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ ڈاکٹروں کی کوئی ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی اور وہ دو پہر تک اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئے۔

چاچا نہرو کی شخصیت میں جادو کا سا اثر تھا جو کوئی بھی ان سے ملتا تھا، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ۔ ان کا مخالف بھی ان

سے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔
ہندوستان کے لوگ تو اُن سے محبت
کرتے ہی تھے مگر دوسرے ملک
کے لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی
بڑی عزت تھی۔

چاچا نہرو کی شخصیت ہی کا
نتیجہ تھا کہ تمام دنیا کے لوگ ہمارے
ملک کی عزت کرتے تھے۔

چاچا نہرو کا سب سے بڑا کارنامہ
یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان کی
بڑی شاندار خدمت کی تھی۔ ۱۷ سال
تک وزیر اعظم رہے اور اس
عرصے میں ملک کو بہت اونچا
اٹھایا۔ آپس کے لڑائی جھگڑے
دور کیے، ملک کو ترقی کی راہ پر
لگایا۔ غرض ملک کی جس قدر خدمت
کرسکتے تھے وہ کی۔

جاوید لطیف
متعلم ششم (الف)
مدرسہ ابتدائی، جامعہ

دوسرا گروپ
(۱۳ سے ۱۷ سال)

پیارے پنڈت جی (اول)

جامعہ کی چالیسویں سال گرہ بڑی
دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔
جامعہ کی عمارت دلہن کی طرح سجی ہوئی
تھی۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی
تھی۔ ہر جگہ رنگ برنگی جھنڈیاں، غبارے
اور رنگین بلب لگے ہوئے تھے۔ رنگ برنگی
دکانیں۔ خوب صورت گیٹ اور طرح طرح کے
گملوں سے جامعہ میں ایک عجیب شان اور دلکشی
سی پیدا ہوگئی تھی۔ جامعہ کے طلبا، اور اساتذہ کا دل پھول
کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اور وہ بڑی امنگ اور جوش
کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔
باہر سے آنے والے مہمان ہر ہر چیز کو
بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہے
تھے۔ اور خوش ہو رہے تھے۔ ہر طرف
خوشی اور مسرت سے ایک عجیب سماں
بندھا تھا۔ شور وغل، ہنسی قہقہے،

ننھے بچوں کی معصوم آوازیں سب مل کر ایک عجیب سی دل کش آواز میں ڈھل گئی تھیں۔ جسے زبان سے ادا کرنا مشکل ہے۔

آج تو میلے کی چہل پہل میں کچھ زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ اور اس حسن و خوب صورتی میں کچھ زیادہ نکھار آگیا تھا۔ تمام اساتذہ اور طلباء کے چہرے روز سے زیادہ پرمسرت اور شگفتہ نظر آرہے تھے۔ اور جامعہ کی بلند عمارت کچھ اور زیادہ بلند نظر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کے استقبال کے لیے سنبھل کر کھڑی ہوگئی ہو۔ ہاں! آج اسے ایک بہت پیارے انسان کا استقبال کرنا تھا۔ جو ہمارے میلے میں آنے والا تھا۔ اس کی آمد سب کے لیے بڑی مسرت کا باعث تھی۔ کیونکہ وہ تھا ہی سب کا پیارا اور ہر دل عزیز۔ اور سب سے زیادہ تو بچے خوش تھے۔ اور اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ اپنے دل میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے۔ کہ اپنے پیارے لیڈر سے کیا کیا باتیں کریں گے۔ اور وہ ان سے کیا باتیں کرے گا۔ جی ہاں وہ آنے والا ہمارا ایک بہت بڑا لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ اس سے بڑھ کر کچھ اور تھا۔ وہ ہمارے پیارے چاچا نہرو تھے۔ جن کی آمد پر ہر دل خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ اور ان سے ملنے کے لیے ہر دل بے قرار تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے پنڈت جی ہم سے بات کریں گے بھی یا نہیں۔ انھیں شاید فرصت بھی نہ ملے۔ وہ تو تقریر کرنے آئیں گے۔ اور تقریر کرکے چلے جائیں گے۔ پھر وہ ضرورت بھی کیا سمجھیں گے، ہم سے بات کی۔ بڑے بڑے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے اور وہ بات کرنے کے لیے کافی ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ ہم سب بچے ان سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ اور اس وقت ان کے آنے کا کس بے چینی

سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ان سے ملنے اور بات کرنے کی کتنی بڑی آرزو چھپی ہوئی ہے۔ کبھی سوچتی کہ لوگ کہتے ہیں۔ پنڈت جی بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر پھر سوچتی کہ آخر وہ کس کس سے باتیں کریں گے۔ اتنے بہت سے بچے سب ہی ان سے بات کرنا چاہیں گے۔ بھلا ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوگا؟ اور پھر یہ بڑے لوگ کیا انھیں چھوڑیں گے؟ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ہم سب اتنا چاہتے ہوئے بھی پنڈت جی سے نہ مل سکیں گے۔ پھر بھی میرا دل چاہا کہ کاش! کسی طرح انھیں پتہ چل جائے کہ ہم سب انھیں کتنا چاہتے ہیں۔ اور ان سے ملنے کے کتنے خواہش مند ہیں۔

میں ان ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ایک شور سا بلند ہوا۔ "پنڈت جی آگئے، چاچا نہرو آگئے"۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تمام بچے باہری گیٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ میں بھی دوڑی، مگر گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں روک دیا گیا کہ ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور میں فوراً پلٹ پڑی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہم پنڈت جی سے نہیں مل سکتے۔ اور نہ ان سے بات کر سکتے ہیں۔ مجھے ایسا لگا۔ جیسے پنڈت جی نے خود ہی بچوں کو ادھر آنے سے روکا ہے۔ میں نے سوچا وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ ان کے چاروں طرف بھیڑ جمع ہو۔ اور وہ بھی بچوں کی بھیڑ جو کہ ایک منٹ بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ بہت شور مچاتے ہیں۔ اس سے یقیناً انھیں تکلیف ہوگی۔ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے آدمیوں کی باتیں! مجھے اس وقت پنڈت جی بہت بُرے لگے۔ اور میں ان کے خلاف نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ پھر میں نے سوچا، جب وہ بچوں سے

ملنا پسند نہیں کرتے تو ہمیں کیا ضرورت ہے ان سے ملنے کی اور باتیں کرنے کی۔ اس وقت مجھے لوگوں کی یہ بات کہ پنڈت جی بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بالکل غلط لگی مگر پھر بھی میں پنڈت جی کو دیکھنے کی خواہش کو دبا نہ سکی۔ اور غیر ارادی طور پر میرے قدم گیٹ کی طرف اٹھ گئے۔ پنڈت جی اندر آ چکے تھے۔ اور تمام والنیٹر بھی انھیں کی طرف متوجہ تھے۔ میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

میں نے دیکھا کہ ان کے اندر آتے ہی ہمارے شیخ الجامعہ صاحب اور کچھ دوسرے لوگ ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ پنڈت جی مسکرائے۔ بڑی ہی پرکشش اور پیاری مسکراہٹ! مگر مجھے پھر بھی یہ مسکراہٹ اچھی نہ لگی۔ وہ تو بڑوں کے لیے تھی۔ ہم بچوں سے تو وہ ملنا بھی نہ چاہتے تھے۔ مگر یہ کیا؟ اسٹور کی طرف سے ننھے منے بچوں کی ایک فوج اندر آ گئی۔ سب بچے پنڈت جی، پنڈت جی چلا رہے تھے۔ بچے پھٹے اور گندے کپڑوں میں تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ اور سر کے بال گندگی سے آپس میں چپک گئے تھے۔ بچوں کے پیچھے تین چار عورتیں تھیں جو شاید ان میں سے کچھ کی مائیں تھیں۔ بچے بڑے جوش کے ساتھ چلاتے ہوئے اندر آئے تھے۔ مگر باوردی سپاہیوں کو دیکھ کر کچھ سہم سے گئے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ مگر ان کی معصوم نگاہیں اپنے محبوب رہنما پر جمی تھیں۔ جیسے نہ جانتے ہوئے بھی وہ اس کی محبت اپنے ننھے دلوں میں محسوس کر رہے تھے۔ پنڈت جی نے بچوں کو دیکھا۔ ان کے پر شوق معصوم چہروں کو دیکھا۔ تو ان کی طرف بڑھے ابھی شیخ الجامعہ صاحب سے انھوں نے کوئی بات بھی نہیں کی تھی کہ میرے کانوں نے ان کا یہ

جملہ سنا "بھئی پہلے ذرا ہم ان سے تو مل لیں"۔ اور وہ پوری طرح بچوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بچے پہلے تو کچھ ڈرے جھجکے مگر جب انھوں نے اپنے سر پر ایک شفقت بھرا ہاتھ محسوس کیا۔ تو ان کا تمام ڈر جاتا رہا۔ اور وہ مسکرانے لگے۔ اور پنڈت جی بھی خوشی سے ایسے کھل گئے جیسے انھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو۔ انھوں نے کسی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کسی کو پیار کیا۔ اور کسی سے ایک آدھ بات کی۔ اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پھر بڑے لوگوں کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت بچوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ اور ان کی مائیں انھیں بڑے فخر کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔

میں نے دیکھا پنڈت جی وائسرائے، شیخ الجامعہ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بہت آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا بھی نہ تھا۔ مگر میں خوش تھی۔ اب میں سمجھ گئی کہ بچے جتنی محبت پنڈت جی سے کرتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ وہ بچوں سے کرتے ہیں تب ہی تو وہ بڑے لوگوں سے بات کیے بغیر بچوں کی طرف مڑ گئے۔ اب پنڈت جی بورڈنگوں کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ اوپر بورڈنگوں کے بچے انھیں نمستے اور سلام کر رہے تھے۔ اور پنڈت جی مسکرا مسکرا کر ان کا جواب دے رہے تھے۔ وہ یوں تو بڑے لوگوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ مگر ان کی نگاہیں بورڈنگس سے جھانکتے ہوئے بچوں کے چہروں پر تھیں۔ جن کے چہرے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ اور دل اپنے پیارے چاچا کی محبت سے سرشار تھے۔ پنڈت جی نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے بڑے لوگوں سے مشکل سے ایک آدھ بات کی ہوگی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی ہم بچوں سے ملنے کے لیے اتنے ہی بیتاب رہتے ہیں۔ جتنے ہم ان کے لیے، کتنے

پیارے ہیں، ہمارے پنڈت جی،
میں نے سوچا اور پھر اپنے پہلے
کے خیالات پر مجھے ندامت محسوس
ہونے لگی۔ جب میں نے دیکھا کہ
پنڈت جی ایک جگہ بہت سے بچوں
کے درمیان کھڑے ہیں۔ اور ان
سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں
تو بے انتہا خواہش کے بعد بھی
میں وہاں نہیں گئی۔ مجھے ایسا لگا
کہ جیسے وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔
جو میں نے ان کے بارے میں سوچا
ہے۔ پھر وہ کیا سوچیں گے؟ یہ خیال
کرکے میں جلدی سے پنڈال کی طرف
چلی گئی۔ جہاں ان کی تقریر ہونے
والی تھی۔

زاہدہ خاتون
ثانوی پنجم
مدرسہ ثانوی جامعہ

پنڈت جواہر لال نہرو (دوم)

اے اجل تجھ سے بڑی ہی سخت نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر کی ویرانی ہوئی

اس کا پیغامبر اٹھ گیا صرف ہندوستان
ہی نہیں دنیا کی فضا پر تیرگی چھا گئی۔
جنگ کی وحشتوں اور ہولناکیوں سے
خلاف جس شخص نے آواز بلند کی تھی
وہ نہیں رہا۔ وہ آواز جس نے دنیا بھر
کو متوجہ کیا تھا خاموش ہوگئی۔ شرافت
کا مجسمہ، محبت اور اخوت کا علمبردار
فرشتہ خصلت اور عالمی سیاست کا
ماہر ہم میں نہیں ہے۔

آزاد ہندوستان کا معمار اور باوقار
ملک کا عظیم ترین سپوت آج ہمارے
درمیان نہیں ہے۔ اور ہم اس کی
جدائی پر سوگوار اور مغموم ہیں۔

پنڈت نہرو نے بھرپور عمر پائی اور
طبعی موت مرے اور اگر وہ ایک سو
پانچ سال کی عمر میں فوت ہوتے۔ تب
بھی ہم آج کی طرح ماتم سرا ہوتے، اور
ہم یہی کہتے کہ ہائے موت کے ہاتھوں
نے ہمارے محبوب رہنما کو ہم سے چھین
لیا۔ کیا ہم چاہتے ہیں کہ بڑوں کو عمر
جاوداں ملے اور ان پر کبھی فنا طاری

نہ ہو؟

اگر ہمارا دل ان کی جدائی پر غمگین ہے تو ہمیں ان کی خواہش پوری کرنا چاہیے۔ کیا ان کی یہ خواہش نہ تھی کہ ہمارا سماج مہذب اور شائستہ ہو؟ عوام سخت کوش ہوں۔ ملازم دیانت دار ہوں۔ کارکن فرض شناس ہوں کوئی فرد رشوت نہ لے کوئی ملازم کام چور نہ ہو۔ خود غرضی سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔ غریبی دور ہو۔ جہالت کا خاتمہ ہو۔ ننگوں کو کپڑا اور بے گھر لوگوں کو گھر ملے۔ بیمار طبی امداد سے بہرہ اندوز ہوں۔ اونچ نیچ اور عدم مساوات کا خاتمہ ہو۔ اور ایک ایسا سماج جنم لے جو سوشلزم کی بنیاد پر ملک کو ترقی کی طرف لے جائے۔

ہندوستان اس عظیم شخصیت کے احسان نہیں بھول سکتا۔ آزادی کی جد و جہد میں اس نے جو قربانیاں کی ہیں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد ملک کو شاہراہ ترقی پر چلایا۔ ملک کی صنعتی اقتصادی اور زرعی ترقی کی سبیلیں نکالیں۔ دنیا کے ممالک میں ہندوستان کی قدر و منزلت بڑھائی۔

پنڈت نہرو عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی عظمت کو خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک انسان سمجھتے تھے وہ ہر جگہ ہر ماحول میں گھل مل جاتے تھے۔ یعنی ایک چاچا اور اس کے ہزار روپ وزرائے اعظم میں وزیر اعظم۔ مدبروں میں مدبر۔ سیاست دانوں میں سیاست داں بوڑھوں میں بوڑھے۔ جوانوں میں جوان بچوں میں بچے۔ کھلاڑیوں میں کھلاڑی مزدوروں میں مزدور، کارکنوں میں کارکن۔ رضا کاروں میں رضا کار۔ مردوں میں آئے ان کی سی کہی، عورتوں میں عورتوں کی بات کردی۔

"سب کو بہلانا ان کا کام
چاچا نہرو ان کا نام"

پنڈت نہرو نئے حالات میں خود کو ڈھال لیتے تھے اور کوئی شخص کبھی یہ نہیں محسوس کر پایا کہ وہ کسی کو اپنے سے بڑا یا خود کو بڑا سمجھتے تھے۔ وہ خود کو ہر ایک کے ساتھ برابر کی سطح پر رکھتے یہ ایک بڑی صفت تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو میں ایک اور بڑی بات یہ تھی کہ وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ وہ بہت معتبر اور ذمہ دار شخص تھے۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ میں فلاں کام کروں گا خواہ وہ کسی کو کتاب بھیجنے یا مدد کے لیے چند روپے بھیجنے کا ہو۔ یا کوئی بہت بڑا کام جس میں عظیم خطرات درپیش ہوں تو وہ ہمیشہ مخالف ہواؤں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح کھڑے رہتے۔ اور انھوں نے ہمیشہ اپنے وعدے کو نبھایا۔ پھر وہ غیر معمولی طور پر محنتی انسان تھے۔ وہ ایک دن میں اتنا کام کرتے تھے جتنا دوسروں کو کرنے میں کئی روز صرف ہوں۔ جو لوگ جانتے تھے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ وہ کتنا کام کر لیتے ہیں۔

عام لوگ تو یہ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ ہر وقت دنیا بھر کے حالات سے لگاتار کس طرح اپنا تعلق رکھتے تھے۔ اور کوئی اس بات کا ذکر چھیڑے تو وہ اسے کوئی خاص بات نہیں سمجھتے اور مسکرا دیتے تھے۔ جب وہ آرام کرتے تھے، یا بچوں یا جانوروں سے کھیلتے یا باغ میں ٹہلتے، یا دوستوں سے ہنسی مذاق کرتے تھے تو بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کام کا بوجھ یا چنتا ہے۔

انھوں نے بلا کی قوتِ فکر پائی تھی۔ اور وہ اپنے مختلف فرائض یکے بعد دیگرے نہایت باقاعدگی سے انجام دیتے تھے۔ اور کام کی زیادتی یا پیچیدگی

مسائل سے بالکل پریشان نہیں ہوتے تھے۔ نہرو جی نے اپنی زندگی کے پروگرام کو باندھ رکھا تھا۔ اور وہ ہر رات صرف چند گھنٹے سوتے تھے، وہ ورزش بھی کرتے تھے۔ اس سے انھیں اپنی نہایت اچھی صحت رکھنے میں مدد ملی۔ وہ اپنی خوراک کے بارے میں بھی بہت محتاط تھے۔ اور وہ اپنے کپڑوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ کسی نے کبھی انھیں بے احتیاطی سے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو عدیم المثال جرأت کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ وہ خوف سے قطعًا نا آشنا تھے۔ اخلاقی۔ مجلسی۔ جسمانی اور نفسیاتی طور پر وہ بالکل بے خوف نظر آتے تھے یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

ان کی فطرت میں غرور نام کو نہ تھا اور اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ انھوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ یا کسی کی دلآزاری کی ہے تو وہ فوراً اچھی طرح معافی مانگنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ہمارے ملک میں عام لوگ بھی ایسا کرنے میں تامل کرتے ہیں۔

جواہر لال نہرو اتحاد اور یک جہتی کی نشانی تھے۔ ان کی ذات میں پوری قوم جمع تھی۔ مرجعیت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مدبرینِ عالم کو ان کا لوہا ماننا پڑے۔ وہ نظریہ غیر جانب داری کے ستون تھے۔ سیکولرزم کے علمبردار تھے۔ اور جمہوریت ان پر ناز کرتی تھی۔

جواہر لال نہرو بہ حیثیت انسان کتنے بلند تھے۔ اس کا اندازہ چرچل کے ان الفاظ سے لگائیے جو انھوں نے ایک زمانہ ہوا ان کے بارے میں کہے تھے:

"خوف اور نفرت دو بہت بڑی انسانی کمزوریاں ہیں لیکن جواہر لال نے ان دونوں پر فتح پائی ہے"

واقعی وہ بے خوف انسان تھے۔ جنگ آزادی میں نہ وہ قید و بند سے

گھبرائے، اور نہ لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سے۔ اور وہ جانتے ہی نہیں کہ نفرت کسے کہتے ہیں۔ وہ عوام کے دلوں کے فاتح تھے۔ عوام کے دلوں کے محبوب تھے۔ وہ ایک ایسے باعظمت انسان تھے جو ہمارے لیے روشنی کا مینار بنے رہیں گے۔ ایسی بلند ہستی کو ہم نے اس زمین پر جیتے جاگتے دیکھا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس پر فخر کرے گا۔

وہ ایک کامیاب مصنف تھے ادب سے انھیں لگاؤ تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کے وہ قدرداں تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں صاحب جوہر کی وہ قدر کرتے تھے۔ وہ ہندوستانی شرافت اور کلچر کا ایک حسین نمونہ تھے۔ ان کے لہجہ کی مٹھاس۔ ان کے چہرے کی متانت، اور وجاہت، ان کی خوش بیانی کہاں دیکھنے میں آتی ہے۔

ان کی خوبیوں کی سب سے بڑی قدر ہم یہی کر سکتے ہیں کہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں اور ہندوستان کی بہبود اور ترقی کے لیے اس طرح کوشاں رہیں جیسے وہ خود تھے۔

سید حسیب الدین بید حبیب الدین
ڈھولی واڑہ
محلہ برہان پور

رحم کا دیوتا (سوم)

وہ شام کتنی اداس تھی۔ تمام عالم خاموش تھا۔ ہوا بند تھی۔ درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ آسمان دھیرے دھیرے رو رہا تھا۔ کبھی کبھی بادل ضبط نہ کر پاتے اور ایک دکھ بھری چیخ مارتے اس کو سن کر آسمان کا کلیجہ کانپ اٹھتا اور وہ زور زور سے رونے لگتا۔

میں بھی بہت اداس کھڑی تھی میرا ذہن آج کے حادثہ کے بارے میں

سوچ رہا تھا۔ آج ہمارے چاچا نہرو اس دنیا سے چل بسے تھے۔ میرے ذہن میں بار بار ان کا مسکراتا ہوا دل کش چہرہ ابھر آتا اور کبھی میں ان کی ان بند آنکھوں کا تصور کرتی جو اب کبھی کھلنے والی نہ تھیں۔

اتنے میں ایک ننھا منا چڑیا کا بچہ سامنے کے پیڑ پر سے گر پڑا میں نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ کبھی آنکھیں کھولتا کبھی بند کرتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس میں مجھے پنڈت جی کی شخصیت مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ میرے ذہن نے پلٹا کھایا میری آنکھوں کے سامنے ایک شام کا واقعہ ابھر آیا۔ جس سے پنڈت جی کی نرم دلی اور پیاری شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

وہ ایک سہانی شام تھی۔ پنڈت جی مسکراتے ہوئے گلاب کی طرح شگفتہ چہرہ کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ اسی وقت ایک چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر پڑا۔ پنڈت جی نے اسے بڑے پیار سے اٹھاکر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا۔

اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ پنڈت جی کا حساس دل بچہ کی اس تکلیف پر تڑپ اٹھا۔ وہ اپنا جانا وانا سب بھول گئے۔ اس کو منہ سے پیار کیا۔ اور گھر آکر اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ اس کی پیٹھ سہلائی۔ بوڑی گارڈ نے کہا کہ پنڈت جی دیر ہو رہی ہے۔ مگر اس رحم کے دیوتا نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس بچہ کو اس حالت میں چھوڑ کر چلا جائے وہ بار بار اس بچہ کو دیکھتے۔ اسے پانی پلاتے اور اسے چومتے تھے۔ وہ بے قرار تھے کہ کسی طرح یہ ننھا منا بچہ اپنی آنکھیں کھول دے۔ وہ اس ننھی سی جان کے لیے اس قدر بے چین تھے جیسے کوئی باپ اپنے بچے کی بیماری پر ہوتا۔

اس بچہ کی ماں ممتا کی ماری پنڈت جی کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ پنڈت جی کا حساس دل اس کی بے چینی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک باپ کا دل رکھتے تھے۔ وہ سارے بھارت کے باپ تھے۔ پھر بھلا وہ اس کی ممتا کو کیسے نہ سمجھتے۔ وہ بار بار چڑیا کو چمکارتے تھے۔

تھوڑی دیر میں بچہ نے اپنی گول گول معصوم آنکھیں کھولیں اور پنڈت جی کے دل کش چہرے پر گاڑ دیں۔ پنڈت جی کا چہرہ کھل اٹھا۔ انھوں نے بچہ کی مسکرانی ہوئی آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس معصوم کے ہنسنے پر پنڈت جی کو سارا سنسار ہنستا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ انھوں نے بچہ کو دھیرے سے اٹھاکر گھونسلے میں رکھ دیا۔ چڑیا نے ایک بار اپنے جگر کے ٹکڑے پر محبت آمیز نظریں ڈالیں اور پھر پنڈت جی کی طرف ایسی عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھا مانو پنڈت جی کوئی دیوتا ہیں۔

میٹنگ کا وقت آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ مگر پنڈت جی کی پیشانی پر ایک بل بھی نہ تھا۔ وہ اس بچہ کو آج کی میٹنگ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ واقعی دیوتا تھے۔ ایک پیارے سے خوب صورت دل کے مالک۔

میں نے چونک کر اس معصوم جان کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر چکا تھا۔ میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر اس کے بے جان جسم پر گر پڑے۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے پنڈت جی بادلوں سے جھانک کر مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تم اس کو بھی نہ بچا سکیں۔ اور میرا سر اس دیوتا کے قدموں پر ندامت سے جھک گیا۔

راقعہ خاتون
ثانوی چہارم، جامعہ

محمد حسین حسّان

انوکھا چناو

(۲۳)

اب ججوں نے دوست قبیلوں کے دو آدمیوں کو آواز دی :- "بڑ گھوڑے اور تن (ننھے) بادل اب ہمیں ان بہادروں کی اونچی کدائی کی جانچ کرنی ہے - تم دونوں چھڑ پکڑے رہوگے ؟"

دونوں راضی ہوگئے۔

تیسرے جج نے اطمینان کا سانس لیا کہنے لگا :- "یہ بہت اچھا ہوا" اس تیسرے مقابلے کی دیکھ بھال اس جج کو کرنا تھی۔ اس نے ان دونوں سے کہا: "تو یہ چھڑ ہاسے اپنے سینے کے برابر رکھو۔ اور اس طرح کھڑے ہو کہ سب دیکھ سکیں ۔"

اب اس نے بڑسنگے کو آواز دی "بڑسنگے بڑسنگے، اب کے تم پہلے آؤ۔"

بڑسنگا اپنا نام سنتے ہی آگے آیا۔

اس نے چھڑ کی اونچائی کو جانچا۔ پھر پیچھے کی طرف لوٹا۔ دوڑتا دوڑتا آیا اور چھڑ کے اوپر سے کود گیا۔

ہرن قدم تیار کھڑا تھا جج نے جونہی اسے پکارا فوراً چھڑ کے قریب پہنچا۔ اس کی اونچائی کا اندازہ لگایا - پھر پیچھے لوٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا آیا۔ وہ چھڑ سے بھی اونچا کودا اور بڑی خوب صورتی سے نیچے آیا۔

بوڑھے جج نے چھڑ تھامنے والوں سے کہا: "اب چھڑ کو اپنی ٹھوڑی تک اونچا کر دو۔"

یہ دونوں خوب لمبے تڑنگے جوان تھے۔ اسی لیے چھڑ اتنی اونچی ہو گئی کہ درمیانہ قد کے آدمی کے سر کو چھوئے۔

جج نے بڑ سنگے کی طرف اشارہ کیا۔ بڑ سنگا چھڑ کے اوپر سے کود گیا۔

اب ہرن قدم آگے آیا۔ وہ پہلے کی طرح دوڑا، جست لگائی اور چھڑ سے کہیں اونچا کودا۔

جج نے چھڑ تھامنے والوں کو حکم دیا: "اب اسے اپنی آنکھوں کے برابر اونچا کر دو۔"

اور اب یہ چھڑ قبیلے کے بہت سے بہادروں کے سروں سے کافی اونچی ہو گئی تھی۔

جج کے بلانے پر بڑ سنگا پھر آگے بڑھا۔ پر اب کے اس نے اونچائی کا زیادہ احتیاط سے اندازہ لگایا۔ دوڑنے کے لیے چھڑ سے بہت دور چلا گیا۔ وہاں اس نے جھک کر چھڑ پر ایک نگاہ ڈالی اور دوڑ پڑا۔ اس مرتبہ وہ بڑا دائرہ بناتا ہوا بہت اچھے انداز سے چھڑ سے ایک ہاتھ اونچا کودا۔

اب ہرن قدم کی باری تھی۔ اس نے بھی دوڑ کے لیے لمبا فاصلہ لیا اور بڑ سنگے سے بھی کچھ اونچا کودا۔ اس کے دوستوں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انھیں ہرن قدم کی کامیابی کی کچھ آس ہو چلی۔

جج نے بڑ گھوڑے اور نن بادل کو حکم دیا: "چھڑ کو اپنے سر سے ایک ہاتھ اونچا اٹھالو۔"

اب تو چھڑ بہت اونچی، بہت ہی اونچی ہو گئی۔ اور نیچے، ہرن قدم اور بڑ سنگے کے ساتھی اور بھی سیدھے کھڑے ہو گئے۔ جیسے اس سے ان کے امیدواروں کو زیادہ اونچا کودنے میں مدد ملے گی۔

دوسرے ہندیوں نے سر ہلائے۔ "اوں — ہونھ۔ اتنا اونچا کوئی بھی نہیں

کود سکتا۔"

"بڑسنگھ، کودنے کے لیے تیار ہوجاؤ" جج نے للکار لگائی۔ بڑسنگھا اب کے تو دوڑنے کے میدان سے بھی پیچھے نکل گیا۔ درختوں کے بیچ میں تو آہستہ آہستہ دوڑتا رہا۔ جوں جوں چھڑ قریب آتی جاتی اس کی دوڑ میں بھی چھڑ کے قریب تیزی آتی جاتی۔ تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کود کیسے پائے گا۔ پر چھڑ کے پاس پہنچتے ہی اس نے ایک جست لگائی۔ بہت بھدے پن سے۔ وہ بہت اونچا کودا خوب اونچا، خوب اونچا اور چھڑ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن چھڑ سے چھوتا ہوا گیا ہو، مگر چھڑ تو ذرا بھی نہ ہلی۔

"بڑسنگھا کود گیا" "بڑسنگھا کود گیا" اس کے کچھ ساتھی بے تحاشا چلا اٹھے، وہ اس وقت بڑے جوش میں تھے۔ بالکل بدحواس ہو رہے تھے۔ اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے:۔" ہم نے کسی کو اتنا اونچا کودتے نہیں دیکھا۔"

اب جج نے آواز دی "ہرن قدم" ہرن قدم تیار کھڑا تھا۔ پر وہ کچھ بجھا بجھا سا نظر آرہا تھا۔ ہر شخص کو ایسا لگ رہا تھا کہ ہرن قدم کو بہت کوشش کرنا پڑ رہی ہے۔ پر وہ کودا۔ اور ہوا میں بہت اونچا گیا۔ بہت اونچا! کودتے میں اس کے بدن اور چھڑ کے بیچ فاصلہ بھی نظر آتا تھا۔

(باقی)

رفیق شاستری

رام لیلا

برسات تو گذر گئی ۔ سردی کی آمد آمد ہے ۔ موسم کیسا خوشگوار ! نہ دن میں زیادہ گرمی نہ رات میں زیادہ ٹھنڈک ۔ ایسے میں دسہرہ کا تہوار !! بچے جوان بوڑھے سبھی خوش ۔ کوئی بچہ ہنومان کا چہرہ لگائے گھوم رہا ہے ۔ تو کوئی تیر کمان لیے رام اور لچھمن کی طرح تیر اندازی کر رہا ہے ۔ رات کو رام لیلا کی بہار ۔ ریوڑیوں اور گنّوں کی ریل پیل، کھیل بتاشوں کے ڈھیر ۔ ہر طرف باجے اور غبارے ، کھلونے اور مٹھائی ، کھیل تماشے ، چرخ چوں ، ہا ہلڑ ہو ، ہو ۔ بھیڑ بھاڑ اور گھر گھر میں رامائن کا مدھر پاٹھ ۔ ہر سال اسی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ دسہرہ آتا ہے ۔ شہر کے کونے کونے میں رام لیلا ہوتی ہے ۔ کیا شہر کیا گاؤں ہر جگہ کیسی رونق ، کیسی چہل پہل رہتی ہے ۔

بڑے سے میدان میں بیچوں بیچ ایک اونچا سا چبوترہ بنا ہوا ہے ۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورت اور مرد سب کی نگاہیں اسٹیج کی طرف لگی ہوئی ہیں ۔ چاروں طرف بھیڑ ہی بھیڑ ہے ۔ اس بھیڑ میں چھوٹا موہن ، اس کی بہن شیلا ، ماتا جی اور پتا جی بیٹھے ہیں ۔ رام لیلا قریب سے دیکھنے کے شوق میں ذرا پہلے سے آکر جگہ گھیر لی ہے ۔ دیر کرتے تو جانے کہاں جگہ ملتی ۔ میدان کے اندر رام اور لچھمن کی لیلا دیکھنے والوں کی بھیڑ اور باہر میلے کی چہل پہل کئی چرخ چوں (جھولے) بھی لگے ہیں اور چرخی بھی ، جادو کا تماشا

بھی اور سرکس کا کھیل بھی، اور ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بھی ہے۔ ریوڑی گٹے والوں کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ چوڑے مٹھائی والے بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور یہ کھلونوں کی دکانیں ہیں۔ اپنی جگہ خود چھوٹے بڑے ہر طرح کے کھلونے سجے ہوئے ہیں۔ دکان کیا ہے ایک پورا میلا ہے۔ ہنومان کا چہرہ خوب دھڑتے سے بک رہا ہے۔ لڑکے چہرے خریدتے ہیں اور فوراً لگا کر ہنومان کی نقل اتارنے لگتے ہیں۔ تیر کمان بھی خوب بک رہے ہیں۔ بگل اور باجوں کی آواز سے میلے میں بہار آگئی ہے۔ اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

چھوٹا موہن اپنی جگہ سے کھڑا ہو ہو کر چرخی اور غباروں کی بہار دیکھ لیتا ہے۔ اُسے رام چندر جی کی لیلا دیکھنے سے جتنی دلچسپی ہے اتنی ہی میلے کے بازار سے بھی۔ پر کیا کرے یہاں بھیڑ میں آکر بیٹھ چکا ہے۔ میدان میں جلدی آکر بیٹھنے کی ضد بھی اسی نے کی تھی۔ مگر اب تو وہ کسمسا رہا تھا۔ بہت اُلجھن میں تھا۔ بھیڑ کے باہر بچے خوب اچھل کود رہے تھے۔ خوب تماشے کر رہے تھے۔ اور وہ یہاں بھیڑ میں پھنسا بیٹھا تھا۔ میلے میں گھومے بھی نہیں۔ اور یہاں اتنی دیر سے ابھی رام لیلا بھی نہیں شروع ہوئی۔

یہاں آئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی پر موہن بیٹھا بیٹھا اُکتا گیا۔ دُور چرخیاں اور غبارے دکھائی دے رہے تھے۔ بھلا یہاں بیٹھے بیٹھے اُسے کب چین آسکتا تھا۔ اپنے پتاجی سے بولا۔ چلیے اتنے رام لیلا شروع ہو اتنے ہم لوگ باہر میلا ہی گھوم آئیں۔

پتاجی بولے: "ہاں ہاں چلو۔ مگر سوچ لو۔ بھیڑ بہت ہے۔ یہاں واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔ آج رام لیلا کا آخری دن ہے۔ دیکھو کتنی بھیڑ ہے۔ پھر اس جگہ تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ باہر دور ہی سے راون کا پتلا جلتا ہوا دیکھنا پڑے گا۔"

یہ سُن کر چھوٹا موہن ٹھٹھک گیا۔ کتنے دنوں سے یہ ارمان اُس کے دل میں

تھا کہ رام چندر جی اور راون کی لڑائی کا منظر قریب سے دیکھے۔ آج یہ موقع وہ اپنے ہاتھ سے ہرگز نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں شہر کے کونے کونے سے جھانکیوں کے جلوس آنے لگے۔ رام لچھمن اور سیتا کی سواری۔ ہنومان جی قریب میں کھڑے دُم ہلا ہلا کر بھیڑ کو خوش کر رہے ہیں۔ یہ سپنکھا کے ناک کٹنے کی جھانکی ہے۔ یہ نارد مُنی ہیں، یہ وششٹھ جی ہیں۔ اے لو یہ ہنومان جی نے تو ایک پورا پہاڑ ہی ہاتھ پر اٹھا رکھا ہے۔ جھانکیوں کا یہ جلوس چبوترے کے پاس سے گذر کر قریب ہی جاکر رک گیا۔

اب رامائن کا پاٹھ شروع ہوا۔ تلسی کی رامائن لاؤڈ اسپیکر پر گائی جارہی تھی۔ اس کے بعد ہنومان جی تیز آندھی کی طرح اسٹیج پر آئے۔ لیجیے رام لیلا شروع ہوگئی۔ رام کہانی کا یہ آخری منظر تھا۔ رام لچھمن کی راون سے گھمسان لڑائی۔ بندروں کی فوج کا ایک جتھا چبوترے کے ایک طرف سے دوسری طرف کو گذر گیا۔ یہی تو وہ فوج ہے جس نے رام چندر جی کی مدد کی تھی۔ اب رام چندر جی اسٹیج پر آئے۔ "رام چندر جی کی جے" کے نعروں سے سارا میدان گونج اُٹھا۔ رام چندر جی نے مسکرا کر لوگوں کو اپنے درشن دیے۔ لوگ پھر چلّا اُٹھے۔ "رام چندر جی کی جے"

قریب ہی میں ایک طرف راون، اس کے بھائی کمبھ کرن اور لڑکے میگھ ناد کے پُتلے کھڑے ہوئے تھے۔ راون کے دس سر تھے اور نہ جانے کتنے ہاتھ۔ رام چندر جی نے تیر چلایا۔ یہ تیر کمبھ کرن کے سینے میں جا لگا۔ زور کا دھماکا ہوا۔ پتلے میں آگ لگ گئی۔ اس کے تن بدن سے طرح طرح کی آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔ اس کے بعد میگھ ناتھ کے پتلے پر وار ہوا۔ اب کی بار اُس سے بھی تیز دھماکا ہوا۔ آتش بازیاں آسمان کو چھونے لگیں۔ اُس کی آنکھوں سے لال رنگ کی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔ لوگ "رام چندر جی کی جے"

کا نعرہ لگاتے جاتے ۔ چھوٹا موہن بار بار کھڑا ہو کر آتش بازی کا تماشا دیکھتا اور رام چندر جی کی جے پکارتا ۔

اب راون کے پتلے کی باری تھی رام چندر جی نے اپنا رام بان چھوڑا ۔ یہ تیر راون کے بیچ والے سر پر لگا ۔ آتش بازی کا ایک بہت زور کا دھما کا ہوا ۔ اس بار " رام چندر جی کی جے " کی آواز میں بہت جان تھی ۔ راون کے پتلے سے جو آتشبازیاں چھوٹی ہیں ۔ اُن کا کیا کہنا ۔ کمال کر دیا تھا اس پتلے کو بنانے والوں نے !

" رام چندر جی کی جے " کی گونج میں آتش بازیوں کا یہ پتلا جل کر راکھ ہو گیا ۔

اب چبوترے پر سیتا جی آئیں ۔ ہنومان جی بھی خوشی خوشی آئے ۔ سیتا کا رام سے ملاپ ہو گیا ۔ رام لیلا کا یہی وہ آخری منظر تھا ۔ جس کے درشن کے لیے لوگ یہاں آ کر جمع ہوئے تھے ۔ سیتا کا رام سے ملاپ اور راون کی شکست ۔

رام چندر جی کی یہ کہانی صدیوں سے اس ملک میں رائج ہے ۔ یہ کہانی مثالی زندگی کے نمونوں سے بھری پڑی ہے ۔ بھائی کی بھائی سے محبت ، چھوٹے کی بڑے سے عقیدت ، اپنی بات کو پورا کرنے کے لیے ہنستے ہوئے بڑی سے بڑی قربانی دے دینا ۔ باپ کا حکم بجا لانے کے لیے راج پاٹ چھوڑ کر چودہ سال تک جنگل جنگل گھومنا ۔

اور پھر دُنیا کی بُرائیوں کے خلاف جنگ کرنا ۔ راون دُنیا میں برائیاں پھیلانے کی یادگار ہے ۔ رام نے اس راون کے خلاف جنگ لڑی دُنیا سے بُرائی دُور کرنے کے لیے ۔ کتنی مشکلیں پیش آئیں ۔ مگر آخر میں نیکی کی فتح ہوئی ۔ راون ہار گیا رام چندر جی جیت گئے ۔

آخری فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے ۔ سچائی کی ہوتی ہے ۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے ۔ ورنہ تعمیل یا جواب میں دیر ہونے کا امکان ہے ۔

منیجر

ان دنوں اخباروں کے ذریعے اور ریڈیو کی زبانی آپ اولمپک کھیلوں کا حال ضرور سنتے رہے ہوں گے۔ آپ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کا دھیان برابر ٹوکیو کی طرف لگا رہا۔ لیکن اس مرتبہ ہم لوگوں کو زیادہ دلچسپی تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ مقابلے ایشیا میں پہلی بار ٹوکیو (جاپان کی راجدھانی) میں ہو رہے تھے۔

جاپانیوں کی خوشی کا تو کیا کہنا انھوں نے تو بہت بڑا قومی اعزاز اور فخر سمجھ کر ان کھیلوں کا انتظام کیا۔ ہر شخص نے پوری تیاری کی اور اپنی بساط کے مطابق اچھے اسپورٹس مین ہونے کا ثبوت دیا۔ دنیا کے کونے کونے سے جو نامور کھلاڑی آئے تھے انھیں کسی بات کی تکلیف نہ ہونے دی اور ایمانداری، بھائی چارہ، میل ملاپ اور دلی دوستی کا سکہ بٹھا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

جاپان نے مہمان کھلاڑیوں کے ٹھہرنے کے لیے ایک پوری بستی بسائی تھی جسے اولمپک نگر کا نام دیا گیا اور اسے ایسا سجایا گیا جیسے لوگ دیوالی میں اپنے گھروں کو سجاتے ہیں۔ کاش ہم آپ بھی یہ رونق دیکھنے چل سکتے۔

کھیلوں کے مقابلوں میں جانچ کے لیے جدید بجلی کے آلوں کا استعمال کیا گیا اور افتتاح کے وقت الیکٹرونک موسیقی کا استعمال کیا گیا۔ جب ہم اخباروں میں سارا حال پڑھتے تھے تو آنکھوں کے سامنے سارا منظر گھومنے لگتا۔

ان کھیلوں کا افتتاح شہنشاہ ہیروہیٹو نے ٹوکیو کے نیشنل اسٹیڈیم میں کیا۔ ۹۴ ملکوں کے تقریباً ...، کھلاڑیوں نے بڑے پُرجوش

اور ولولہ انگیز انداز میں مارچ پاسٹ کیا۔ یہ کھلاڑی رنگ برنگے لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنے اپنے قومی جھنڈے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ایک ڈرامائی انداز میں اولمپک مشعل لیے ہوئے اس دوڑ کا آخری کھلاڑی جاپان کے نیشنل اسٹیڈیم میں داخل ہوا۔ دوڑ کے میدان کا ایک چکّر لگایا اور چبوترے پر چڑھا جہاں اس نے مقدس آگ جلانے کی رسم ادا کی۔ یہ مشعل یونان سے چلی، ہوائی جہاز اور دوڑنے والے ۵۰ کھلاڑیوں کے ذریعے مختلف ملکوں سے گزرتی ہوئی ٹوکیو پہنچی۔ یہاں اولمپک کی آگ روشن کی گئی۔ یہ آگ اولمپک کھیلوں کے مقابلوں کے ختم ہونے تک جلتی رہی۔

ان کھیلوں میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کے نام اور نتائج کا تھوڑا بہت حال تو آپ کو معلوم ہوتا رہا ہوگا لیکن آپ کے ذہن میں یہ سوال برابر اُٹھ رہے ہوں گے کہ اولمپک آخر ہے کیا چیز؟ اسے کس نے شروع کیا؟ اس کی اہمیت اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

تو آئیے اولمپک کھیلوں کی تاریخ کی کہانی پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔ اس کہانی کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا:

(۱) پُرانا دور اور (۲) نیا دور۔

پُرانا دور

اولمپک کھیلوں کی بنیاد یونانیوں نے ڈالی۔ بہت پُرانے زمانے سے یونانیوں کو اسپورٹس اور کھیل کود کا بہت شوق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر انسان کو جسمانی، دماغی اور روحانی اعتبار سے بہتر سے بہتر ہونا چاہیے۔ ایک اچھی سماج اسی وقت بن سکتی ہے جب اس کے افراد اچھے ہوں۔ یونانیوں کے نزدیک کھیل کود نہ صرف اچھا اور مضبوط جسم بناتے ہیں بلکہ اسپورٹس کے میدان میں ان کی بدولت اخلاق سنوارنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ یہ لوگ جسمانی تعلیم اور کھیل کود کے میدان کو اچھے انسان کی پرکھ کے لیے سب سے بڑی کسوٹی سمجھتے تھے۔ اسی لیے جسمانی تعلیم اور کھیل کود کو انھوں نے اپنی روزمرّہ زندگی کا معمول بنالیا تھا۔ اور کھیل کود کے مقابلوں میں بہت اہتمام اور بڑے جوش

کے ساتھ حصّہ لیتے تھے۔

یونان میں چار قومی تیوہار منائے جاتے تھے ان میں اولمپک کا تیوہار سب سے بڑا تیوہار سمجھا جاتا تھا اور پورے اہتمام اور شان شوکت سے منایا جاتا تھا۔

اولمپک کھیل حضرت عیسیٰ کے جنم یا پیدائش سے ۷۷۶ سال پہلے شروع ہوئے۔ یونان کی ایک ریاست تھی اِکس اور اس ریاست میں ایک پہاڑی مقام تھا اولمپیا۔ اسی اولمپیا میں پہلے پہل کھیلوں اور ورزشوں کا مقابلہ ہوا۔ اسی لیے ان مقابلوں کا نام اولمپک پڑ گیا۔ یہ اولمپک مقابلے ہر چوتھے سال ہوتے تھے اور یونانی ان مقابلوں میں بڑے شوق سے حصّہ لیتے۔ دوڑ کے سب سے پہلے مقابلے میں جیتنے والے چمپین کا نام کوردلس تھا۔

کھیلوں کے یہ مقابلے شروع شروع میں تو ایک ہی دن میں ختم ہو جاتے تھے۔ یہ اس لیے کہ کھلاڑی مقامی ہوتے تھے لیکن دھیرے دھیرے اولمپیا کے ورزش اور کھیلوں کے یہ مقابلے مشہور ہوتے گئے۔ یونان کی دوسری ریاستیں بھی اس میں شامل ہونے لگیں۔ علاوہ اس کے نئے نئے کھیل بھی ان میں شامل کیے جانے لگے۔ ہوتے ہوتے ان مقابلوں کی مدت پانچ دن تک بڑھ گئی۔

شروع شروع میں تو اولمپیا میں بس دوڑ ہی کا مقابلہ ہوتا تھا اور فاصلہ ۶۰۶ ½ فٹ ہوتا تھا۔ بعد میں تین میل لمبی دوڑ شامل کی گئی۔ اور پھر تو کشتی، گھونسا بازی، لمبی کود، ڈسکس پھینکنا، نیزہ پھینکنا، گھوڑوں کے رتھ کی دوڑ، گھوڑ دوڑ، بھاری وزن اٹھانا غرض بہت سی چیزوں کے مقابلے ہونے لگے۔

اس زمانے میں حصّہ لینے والے کھلاڑیوں کے لیے قاعدے قانون بہت سخت تھے جسمانی مضبوطی خاص طور پر دیکھی جاتی تھی۔ مجرموں کو حصّہ لینے کی ممانعت تھی۔ حصّہ لینے والے کھلاڑیوں کو ایک مہینے کی ٹریننگ کے لیے آنا لازمی تھا۔ اور اس سے پہلے اپنی ریاست میں دس مہینے کی ٹریننگ لینا ضروری تھا۔

جیتنے کے لیے کوئی بے جا طریقہ نہیں استعمال کرنے دیا جاتا تھا۔ گھونسا بازی کے قاعدوں میں تھا کہ ایک دوسرے کو خوب

مارتے یہاں تک کہ ایک خوب پٹ کر زمین پر گر پڑتا اور اُٹھ جاتا یا اپنی شکست کا اعتراف ہاتھ اُٹھا کر کرتا۔

ابتدائی دور میں اناج یا جانور انعام میں دیے جاتے تھے لیکن بعد میں روپے پیسے کے انعامات بند کر دیے گئے۔ اور صرف تبرک یا رسمی طور پر زیتون کے مقدس پتوں کا ہار یا پتوں کا تاج انعام میں پیش کیا جاتا تھا۔

ان مقابلوں میں حصّہ لینے والے کھلاڑی محض کھیل کی خاطر حصّہ لیتے تھے۔ ان کھیلوں میں حصّہ لینا اور جیتنا بہت بڑا قومی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ جیتے ہوئے کھلاڑیوں کی بہت قدر ہوتی تھی۔ چھوٹے بڑے سب ان کی عزت کرتے تھے اور شاعر ان کی شان میں قصیدے لکھتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے مجسمے بنا کر لگائے جاتے تھے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ایک قصّے سے ہوگا۔

ایک مرتبہ ایک پُرانا کھلاڑی جو بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور اولمپک میں جیت گیا تھا کھیل دیکھنے آیا۔ ان مقابلوں میں اس بوڑھے کھلاڑی کے دو بیٹے بھی حصّہ لے رہے تھے۔ جو باپ ہی کے نقشِ قدم پر چلے اور کامیاب ہوئے۔ جب ان دونوں بیٹوں کو جیت کا ہار پہنایا جا رہا تھا تو تماشائی، حکمران، افسران وغیرہ بہت خوش تھے اور ان کے اس بوڑھے باپ کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اس وقت اس بوڑھے کے ایک لڑکے نے پکار کر کہا کہ "ابا جان آپ کو اس دُنیا میں اس سے بڑا اعزاز اور رُتبہ اور کیا نصیب ہوگا، کہ آپ نے اپنے بیٹوں کو بھی اپنی طرح اولمپک میں جیتتے دیکھ لیا۔ اب آپ چاہیں تو اس دُنیا کو خیر باد کہہ سکتے ہیں"۔ اس قصّے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یونانیوں کے نزدیک اولمپک میں جیتنا کس قدر فخر کی بات تھی۔

یہ مقابلے ۱۲۰۰ سال تک چلتے رہے اور تقریباً ۲۹۲ بار ہوئے۔ اس کے بعد روم کے عیسائی شہنشاہ نے انھیں ختم کر دیا۔

اولمپک کھیلوں کا نیا دور

ان کھیلوں کو دوبارہ شروع کرنے کا نیک خیال فرانس کے ایک شہری کو آیا۔ جس کا نام بیرن ڈی کوبرٹن تھا (۱۸۶۳ء—۱۹۳۷ء)

انھوں نے انگلستان اور امریکہ کا دورہ کیا اور اولمپک کھیلوں کو دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لوگوں کو یہ خیال بہت پسند آیا۔ پھر کیا تھا بیرن ڈی کوبرٹن نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اس نیک خیال کو پھیلانے میں لگا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں کی بین الاقوامی کھیلوں کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور کھیل کود کے قاعدوں کی بھی کوئی منظم شکل نہیں تھی۔ بیرن ڈی کوبرٹن کے پیش نظر بہت اعلیٰ مقاصد تھے۔ صرف یہی نہیں کہ مقابلے میں حصّہ لینے والے تمغے جیتیں اور ریکارڈ توڑیں اور پبلک کو خوش کریں۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ یہ مقابلے (۱) دُنیا کو اس طرف توجہ دلائیں کہ قومی جسمانی تعلیم و تربیت کا پروگرام نہ صرف لڑکے اور لڑکیاں تیار کرتا ہے بلکہ ان مقابلوں کے ذریعے اچھے اخلاق پیدا کرنے اور اچھا شہری بننے میں مدد ملتی ہے۔

(۲) کھیل میں ایمانداری اور اسپورٹس مین شپ کی تربیت ہوتی ہے، جو زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے۔ (۳) فنون لطیفہ میں اچھے مظاہروں اور نمائش کے ذریعے دلچسپی اور شوق پیدا کریں جو متوازن زندگی بنانے میں مددگار ثابت ہو۔ (۴) یہ سکھانا کہ اسپورٹس کھیل تفریح اور لطف حاصل کرنے کے لیے ہیں پیشے کمانے کے لیے نہیں ہیں۔ جو کام کیا جائے عبادت سمجھ کر کیا جائے۔ (۵) بین الاقوامی بھائی چارہ پیدا کرنا۔ تاکہ ایسی دُنیا بنے جس میں امن و شانتی اور خوشی میسر ہو۔

دُنیا کے بہت سے ملکوں کے نمائندے ان اعلیٰ مقاصد کے ہم خیال ہو گئے۔ اور اولمپک کھیل پھر سے ۱۸۹۶ء میں اتھنز (یونان) میں شروع ہوئے۔ اس وقت صرف ۱۳ دیس شریک ہوئے۔ اور ۲۸۹ مردوں نے مقابلوں میں حصّہ لیا۔ ۱۹۰۰ء میں پیرس کے مقابلوں میں ۶ عورتیں بھی شریک ہوئیں اور ۲۰ ممالک کے ۱۰۶۶ کھلاڑیوں نے حصّہ لیا۔

پھر تو اولمپک کے یہ کھیل کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے گئے۔ مختلف شہروں میں ہر چار سال بعد ہوتے رہے۔ اس عرصے میں صرف تین بار نہیں ہو پائے۔ یعنی ۱۹۱۶ء میں (چھٹے) اولمپک کھیل جو برلن میں ہونے والے تھے پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے نہ ہو پائے اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں

اولمپک (۱۹۴۰ء) ٹوکیو اور اولمپک (۱۹۴۴ء) لندن میں ہونے والے تھے، یہ بھی نہیں ہو پائے۔ لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

۱۹۶۰ء کے اولمپک کھیلوں میں ۸۴ ملک شریک ہوئے اور ۴۰۰۰ کھلاڑیوں نے حصّہ لیا۔ اور آپ نے دیکھا کہ اس سال کے ٹوکیو اولمپک میں ملکوں کی تعداد ۹۴ تک پہنچ گئی اور کھلاڑی تو روم کے مقابلے میں تقریباً دگنے ہو گئے یعنی ...، ۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دنیا کے زیادہ تر ملک ان کھیلوں میں حصّہ لیتے ہیں اور کھلاڑی کی حیثیت سے ملکوں کے آپسی بھید بھاؤ اور لڑائی جھگڑے بھول جاتے ہیں، دل کھول کر مقابلہ کرتے ہیں اور دوستی کا ہاتھ ملاتے ہیں۔

پروگرام

پروگرام میں وہ کھیل رکھے جاتے ہیں جو کم از کم ۲۰ ملکوں میں کھیلے جاتے ہوں۔ عموماً مندرجہ ذیل کھیل رکھے جاتے ہیں ایتھلیٹکس (جس میں مختلف قسم کی دوڑیں، لمبی کود، اونچی کود، ڈسکس پھینکنا، گولا پھینکنا وغیرہ شامل ہیں) جمناسٹک (گھونسا بازی، کشتی، جوڑو، نشانہ بازی، کشتی چلانا، تیراکی، سائیکل چلانا، وزن اٹھانا، بادبانی کشتی کی دوڑ) فنون لطیفہ (جس میں لٹریچر، موسیقی، پینٹنگ، فوٹوگرافی، اور نقاشی شامل ہیں) کھیلوں میں ہاکی، فٹ بال باسکٹ بال، ہنڈبال، واٹر پولو، ڈونگی دوڑ، والی بال وغیرہ۔

عورتوں کے لیے

عورتوں کے پروگرام میں۔ ایتھلیٹکس (دوڑیں اونچی کود، لمبی کود وغیرہ) جمناسٹک (تیراکی، ڈونگی دوڑ، بادبانی کشتی دوڑ ہاکیٹنگ فیگر اسکیٹنگ) اور فنون لطیفہ (فائن آرٹس)۔

اولمپک انعام

آج کل زیتون کے پتّوں کے ہار تو انعام نہیں دیے جاتے لیکن رقم کی شکل میں بھی نہیں دیے جاتے ہیں۔ ہاں تمغے اور ڈپلوما یادگار کے طور پر رکھنے کے لیے دیے جاتے ہیں انفرادی انعام پانے والوں میں اوّل کو سونے

تمغہ، دوم کو چاندی کا اور سوم آنے والے کو کانسے کا تمغہ دیا جاتا ہے۔ اِن تمغوں کے ساتھ ہر ایک کو ایک چھپا ہوا ڈپلوما بھی دیا جاتا ہے۔ جس پر اس کا نام، مقابلے کا نام وغیرہ لکھا ہوا ہوتا ہے اور چوتھی اور پانچویں جگہ پانے والوں کو صرف ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ ٹیم کے کھیلوں کے مقابلوں میں اوّل، دوم اور سوم آنے والی ٹیموں کے ہر ایک کھلاڑی کو اُسی ترتیب سے سونے، چاندی اور کانسے کے تمغے اور ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ اور چوتھی، پانچویں اور چھٹی نمبر پر آنے والی ٹیم کے ہر ایک کھلاڑی کو صرف ڈپلوما دیا جاتا ہے۔

اِن کھیلوں کے مقابلوں میں مختلف ملکوں کے کھلاڑی تمغے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اولمپک کے قاعدوں میں یہ بات نہیں رکھی گئی ہے کہ کس ملک نے کتنے تمغے جیتے اور کون سا ملک مجموعی طور پر اوّل آیا۔ یہ تو صرف اخبار والے یہ حساب لگا کر بتاتے رہتے ہیں کہ کس ملک نے کتنے تمغے جیتے۔ ان مقابلوں کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ انعامات حاصل کرے بلکہ اِن مقابلوں کی صحیح اسپرٹ اس کے بانی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اولمپک کھیلوں میں جیتنا کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ زیادہ اہم بات ان کھیلوں میں حصّہ لینا ہے۔ زندگی میں خالی فتح حاصل کرنا کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اہم چیز ہے جی کھول کر مقابلہ کرنا۔"

اولمپک کے قاعدوں کے مطابق وہی شخص ان مقابلوں میں حصّہ لے سکتا ہے، جو شوقین ہو یعنی کھیل کود میں شوق اور تفریح کی خاطر حصّہ لیتا ہو۔ پیشہ ور کھلاڑی نہ ہو یعنی کھیل کے ذریعے روزی نہ کماتا ہو۔

اولمپک جھنڈا

پُرانے زمانے میں اولمپک کا کوئی جھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ اولمپک کا جھنڈا، بیرن ڈی کوبرٹن کے خیال کے مطابق ۱۹۱۴ء میں بنایا گیا۔ یہ سفید کپڑے کا ہوتا ہے جس پر پانچ چکر سیاہ، ہرے، لال، پیلے اور نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔

یہ چکر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ خیال ہے کہ یہ پانچ دائرے پانچ براعظموں کو ظاہر کرتے ہیں: یورپ، امریکہ، ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا۔ اس جھنڈے پر اولمپک کا موٹو (اصول عمل) بھی ہوتا ہے۔ جس کے صرف تین لفظ لکھے ہوتے ہیں یہ یونانی زبان میں ہوتے ہیں جن کے معنی ہیں زیادہ تیز، زیادہ اونچا، زیادہ مضبوط۔

(باقی)

ہندوستان جیت گیا

ہمیشہ کی طرح اس سال بھی اولمپک میں ہندوستانیوں کی توجہ سب سے زیادہ ہاکی پر تھی۔ ہاکی میں ہندوستان ۱۹۲۸ء سے چیمپین رہا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ اعزاز پاکستان کو مل گیا تھا۔ پاکستان کی قدرتی طور پر یہ خواہش تھی کہ یہ اعزاز اسی کے قبضہ میں رہے اور ہندوستانی کھلاڑی اپنا کھویا ہوا افتخار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۳ راکتوبر کو لاکھوں ہاکی کے شوقین ریڈیو پر بڑی دلچسپی سے کمنٹری سن رہے تھے۔ انٹرول کے بعد انھیں یہ مژدہ سنائی دیا کہ ہندوستانی ٹیم نے پالا مارلیا۔ یہ گول ہمارے ایک کھلاڑی مہندر لال نے کیا اور ہندوستان اپنا کھویا ہوا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹوکیو اولمپک کی زیادہ تفصیل اگلے شمارے میں دیکھیے یہ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہوگی۔

صحافی

اِدھر اُدھر سے

ہندوستانی بچّوں کا وفد نیپال کو

نیپال ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ ہمالہ کی گود میں کھیلنے والا یہ ملک ہمارا اچھا دوست ہے۔ اس ملک کے بچّے سارے ہندوستان کے بچّوں کے دوست ہیں۔ ان بچّوں سے دوستی بڑھانے کے لیے ہندوستانی بچّوں کا ایک وفد ابھی حال میں نیپال کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ یہ بچّے نیپال میں چند دن مہمان رہیں گے۔ وہاں کے اونچے اونچے پہاڑوں اور چشموں کی سیر کریں گے۔

دہلی میں بچّوں کی ایک انجمن "بالکن جی باڑی" ہے۔ اس سفر کا انتظام اسی بالکن جی باڑی اور نیپال کے سفارت خانے نے مل کر کیا ہے۔ اس وفد میں ۲۵ بچّے شامل ہیں۔

یہ بچّے ہندوستان واپس آکر وہاں کے بچّوں کا حال اپنے ملک کے بچّوں کو سنائیں گے۔ اس طرح ہندوستان اور نیپال میں بچپن کی دوستی کا تعلق قائم ہو جائے گا۔

اولمپک گاؤں میں

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اولمپک کھیلوں کا مقابلہ ہر چوتھے سال ہوتا ہے۔ آج کل یہ مقابلہ جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو میں ہو رہا ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں کے کھلاڑی اس مقابلے میں حصّہ لے رہے ہیں۔

ٹوکیو کے قریب دنیا کے مہمان کھلاڑیوں کے ٹھہرنے کے خاص انتظامات کیے گئے ہیں۔ جس جگہ یہ مہمان کھلاڑی ٹھہرے ہوئے ہیں اس جگہ کا نام "اولمپک گاؤں" رکھ دیا گیا ہے۔ اس گاؤں میں ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کی ہر وقت بھیڑ رہتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک کے لوگ، مختلف رنگ اور نسل کے لوگ یہاں آئے ہوئے ہیں کالے بھی گورے بھی لمبے بھی ٹھگنے بھی۔ یہاں

خوب چہل پہل رہتی ہے۔ اولمپک کے کھیلوں کے بارے میں باتیں تو آپ کو "کھلاڑی" صاحب بتائیں گے۔ آئیے ہم آپ کو اس گاؤں کا ایک واقعہ سنائیں دیکھیے جاپان کے لوگ کس قدر ایماندار ہوتے ہیں۔

ایک کھلاڑی صاحب ٹوکیو شہر کی سیر کرنے نکلے۔ دن بھر مختلف ٹیکسیوں اور دوسری گاڑیوں میں گھومتے رہے۔ کچھ خریداری بھی کی اور شام کو اولمپک گاؤں واپس آگئے واپس آنے پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ ہیرے کا ایک بہت ہی قیمتی نکلس کہیں بھول آئے ہیں۔ آج ہی یہ قیمتی نکلس خریدا تھا ۔ اور آج ہی کہیں گم ہوگیا۔ دل مسوس کر رہ گئے۔ کیا کرتے یہ بھی یاد نہیں آتا تھا کہ کہاں بھول آئے۔ کسی ٹیکسی میں یا کسی بس میں اسی ادھیڑ بن میں رات گذر گئی دوسرے دن یہ کھلاڑی صاحب حسب معمول اولمپک گاؤں سے نکلکر باہر جانے لگے۔ ابھی پھاٹک سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ کسی نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک ڈبہ ان کی طرف بڑھا رہا ہے۔ یہ ان کے ہیرے کے قیمتی ہار کا ڈبہ تھا۔

ذرا غور فرمائیے چند سو روپے کی چیز واپس کرکے اس ڈرائیور نے اپنے ملک کی عزت کو کتنا اونچا اٹھا دیا۔

پتنگ کے ذریعہ آدمی کی اڑان

جی ہاں پتنگ کے ذریعہ اڑان۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ پتنگ آسمان میں اڑاتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک بہت بڑی پتنگ کے سہارے ایک آدمی نے سمندر پار کر لیا۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ جب ہوائی جہاز کی ایجاد نہیں ہوئی تھی لوگ چڑیوں کی طرح پر اور ڈینے لگا کر اڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر غباروں کے سہارے بھی اڑان کرنے لگے تھے۔ اور ہوا میں اڑان کے اسی شوق میں ہوائی جہاز بنا لیا۔

پتنگ کے ذریعہ جس اڑان کا ذکر میں آپ سے کر رہا ہوں وہ ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے کی بات نہیں ہے۔ وہ تو اس مہینے (اکتوبر ۱۹۶۴ء) کا واقعہ ہے۔ فرانس کے برنرڈ ڈانس نامی ایک شخص نے خاص طرح کی پتنگ کے سہارے فرانس

اور انگلینڈ کے درمیان جو سمندر ہے، اسے
پار کیا۔ لوہے کے فریم پر نائلون کے مضبوط کپڑوں
اور ڈوروں کی مدد سے یہ پتنگ بنائی گئی تھی۔
اڑان کرنے والا شخص ربڑ کے کپڑے پہن کر
اس پتنگ سے لٹک گیا اور ایک
گھنٹہ اکتالیس منٹ اڑان کرتا رہا۔
اس پتنگ کی ڈور ایک دو خانی کشتی سے باندھ
دی گئی تھی جس نے سمندر پار کرنے پر اس
ہوا باز کو نیچے اتار لیا۔

مہنگی سواری

افریقہ کے مختلف ملکوں میں ہندوستان
کے بہت سے لوگ جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ عبداللہ
میاں بھی ان میں سے ایک ہیں۔ جانسبرگ
شہر کے قریب ان کی گوشت کی دکان ہے
ایک دن وہ اپنی دکان بڑھا کر ایک سنسان سڑک
سے گذر رہے تھے۔ ان کے پاس دو سو پونڈ تھے اور
وہ اسے ایک بینک میں جمع کرانے جا رہے
تھے کہ اچانک کسی نے ان کے اوپر وار کیا اور چاقو
دکھاکر وہ رقم اینٹھ لی۔
یہ تماشا کار میں بیٹھے ایک صاحب
دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے
بھاگتے ہوئے ڈاکو سے چلا کر کہا، سنو اگر
تم اس رقم میں سے آدھی مجھے دو تو میں
تمہیں کار میں بٹھا کر لے چل سکتا ہوں۔ گھبرایا
ہوا ڈاکو فوراً دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ
گیا۔ ڈاکو کار میں بیٹھ کر چمپت ہو گیا اور عبداللہ
میاں یہ سارا تماشا دیکھتے رہے۔ کار زناٹے
بھرتی ہوئی آگے بڑھی مگر ڈاکو کے کہنے
پر بھی کہیں نہ رکی۔ کار والا اسے سیدھے
پولیس اسٹیشن لے گیا۔ ڈاکو کو یہ سواری
کتنی مہنگی پڑی!

تین آدمی خصوصی سفر پر

اے لیجیے اب کے روس نے ایک اور
کارنامہ انجام دیا۔ بہت بڑا بہت اہم۔ اس
مرتبہ ایک نہ دو اکٹھے تین آدمی اسپتنک
میں بٹھا کر خلا میں بھیجے۔ ان میں ایک ڈاکٹر
تھا، ایک سائنس داں تھا، ایک انجنیر تھا۔ یہ
تینوں حضرات لگ بھگ ۲۴ گھنٹے خلا کا
سفر کرکے سلامتی کے ساتھ زمین پر آ گئے
روس کے اس کارنامے کی ساری دنیا میں

دعوم ہے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ روس نے اتنی بڑی تیاری کرلی ہے کہ تین سال کے اندر غالباً وہ اپنے اسٹینک میں آدمیوں کو بٹھا کر چاند تک پہنچا سکے گا

لڑکیوں نے پالا مارلیا

گرلز گائیڈز کی سات ممبروں کی ایک ٹولی مغربی ہمالیہ کی ۲۲۴۰۰ فٹ اونچی چوٹی "مرگ نفونی" پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ ۱۰ اکتوبر کی بات ہے۔

ٹولی کی تمام لڑکیاں خیریت سے واپس آگئی ہیں اور صحیح سلامت اور تندرست ہیں۔

November 1964 | Regd. No. D. 145

Payam -i- Taleem

NEW DELHI - 25

بچوں کے لئے

آفسٹ میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

کتاب		صفحات		قیمت	
چوزہ	صفحات	١٦	قیمت	١٩	پیسے
دستانہ	〃	٢٠	〃	٢٥	〃
دو کہانیاں	〃	٢٠	〃	٣١	〃
گیہوں کی بالی	〃	١٦	〃	٣١	〃
تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں	〃	٥٢	〃	٧٥	〃
رودی اور ششی	〃	٦٨	〃	٧٩	〃
تین بھالو	〃	١٦	〃	٣٧	〃
نیلا پیالہ	〃	٦٤	〃	١٢٥	〃
بیشکا	〃	١٦	〃	٣١	〃

ان میں سے چوزہ ½ ١٠ × ٢٢ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
½٢٢ × ٢٩ سنٹی میٹر کے سائز پر ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

پیام تعلیم

مدرسہ ثانوی کا بیت بازی کا مقابلہ ـــــ جج فیصلہ کر رہے ہیں
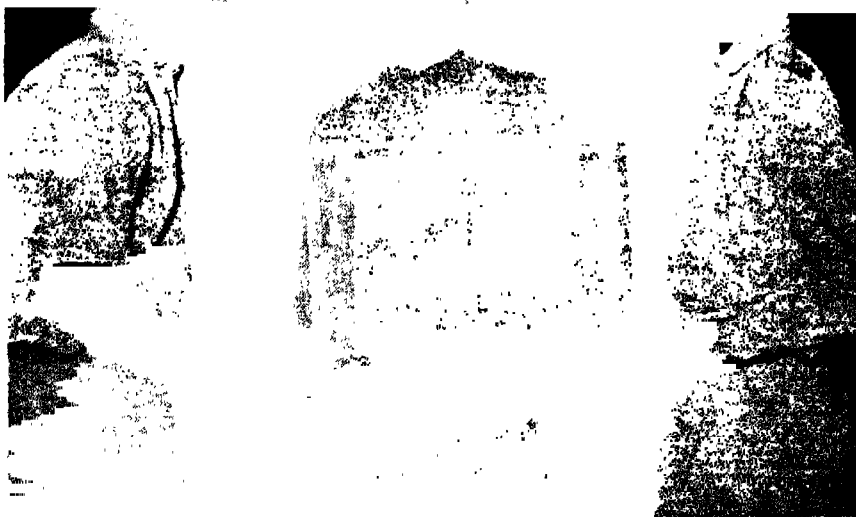
پیامِ تعلیم دہلی

جلد (۱) دسمبر ۱۹۶۴ء شمارہ (۵)

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

سالانہ چندہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

فہرست مضامین

بچّوں سے باتیں

کہیے جناب نومبر کا پرچہ آپ کو کیسا لگا۔ ہمارے پاس تو چاروں طرف سے اس کی تعریف ہی کے خط آرہے ہیں۔ جامعہ کے حلقہ میں بھی (اور یہ حلقہ ماشاء اللہ اب بہت بڑا ہوگیا ہے) اور باہر بھی اسے بہت پسند کیا گیا۔

ہماری اس بات کو لوگوں نے بہت سراہا ہے کہ چاچا نہرو کے بارے میں زیادہ تر مضمون انہی کے شامل کئے گئے ہیں جنھیں چاچا نہرو دل سے چاہتے تھے۔ جنھیں وہ گلاب کا پھول کہتے تھے مستقبل کے ہندوستان کی کشتی کا کھیون ہار بتاتے تھے۔

خیال تھا کہ معمول کے مطابق ۱۶ صفحوں میں سب مضمون آجائیں گے۔ مگر ہوتے ہوتے اٹھاسی صفحے ہوگئے ۲۴ صفحے اور بڑھانا پڑے۔

مینجر صاحب مکتبہ جامعہ اور مینجر پیام تعلیم نے باوجود اس کے پرچے کی قیمت وہی آٹھ آنے رکھی۔

چاچا نہرو کے سلسلے کے کئی اچھے اچھے مضمون باقی رہ گئے ہیں کئی اچھے

مضمون بعد میں آئے ہیں۔ یہ سب وقتاً فوقتاً پرچے میں چھپتے رہیں گے۔

عام مضمونوں میں "جن پکڑا گیا"۔ جادوگر والا مضمون "مصر کے تہوار" خاص طور پر پسند کیے گئے۔ بھارت درشن زیادہ تر بڑے لڑکوں کے کام کی چیز ہے انھیں بہت پسند آیا۔

آپ اولمپک والے مضمون کے سلسلے بے چینی سے منتظر ہوں گے۔ افسوس ہے کہ کھلاڑی صاحب، کچھ اپنی بیماری کچھ غیر معمولی مصروفیتوں کی وجہ سے اسے پورا نہیں کر پائے۔ یہ اب جنوری کے پرچے میں چھپے گا۔

ہم نے پچھلے پرچے میں دوسرے مدرسوں کے پیامیوں اور استادوں کو توجہ دلائی تھی کہ وہ بھی اپنے یہاں کی سرگرمیوں سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔ اس سلسلے میں محمدیہ ہائی اسکول بمبئی سے ایک مضمون ملا ہے، لیکن آخر وقت میں ملا ہے۔ اس لیے اگلے پرچے میں چھپ سکے گا۔

اس پرچے میں آپ دو بہت ہی مزے مزے کے مضمون پڑھیے ان میں سے ایک تو ہمارے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) پروفیسر محمد مجیب کا ہے دوسرا محترمہ آصفہ مجیب کا۔ مجیب صاحب کے مضمون میں تو خود آپ ہی چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ محترمہ آصفہ مجیب کا مضمون بہت سادہ اور بول چال کی زبان میں ہے۔ اس لیے آپ کو خاص طور پر اچھا لگے گا۔

دیکھیے اپنے پرچے کے بارے میں ہمیں اپنی اپنی رائے ضرور بتاتے رہیے۔ مقامی طور پر تو ہم ہر مہینے ایک خاص جلسہ کرتے ہیں، اس میں ابتدائی اور ثانوی کے بچوں کو اور استادوں کو بلا کر ان کی رائے پوچھتے ہیں اور مشورے لیتے ہیں اور ہمیں اس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

اور ہاں بھئی۔ آخر میں ایک خوش خبری اور سُن لیجیے کہ آپ کا اگلا پرچہ آفسٹ پر چھپے گا۔

وقار خلیل صاحب
(حیدرآباد)

اُٹھّو

مُرغا بولا چڑیا چہکی   باغ کی ہر اک کیاری مہکی
ہر پتّے پر شبنم دمکی   لہک لہک کر کوئل گائی

اُٹھّو، دھوپ صحن تک آئی

رات کا اندھیارا بھی بھاگا   ٹوٹ چکا ہے نیند کا دھاگا
بول رہا ہے شاخ پہ کاگا   صُبح کی دیوی تحفے لائی

اُٹھّو، دھوپ صحن تک آئی

چمکا سورج، ڈوبے تارے   جاگ بھی جاؤ بالک پیارے
رُک نہ سکیں گے وقت کے دھارے   جاگو جاگو میرے بھائی

اُٹھّو، دھوپ صحن تک آئی

پروفیسر محمد مجیب

یہ جرمنی کے ایک مشہور معلم کرشٹائنل کا قصہ ہے۔ کرشٹائنل کسی زمانے میں انسپکٹر تھے اور انھیں ایک کلاس کے حساب اور جغرافیہ کی پڑھائی کا معائنہ کرنا تھا۔

لڑکوں کو ان کے آنے کی خبر مل گئی تھی اور وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ انسپکٹر صاحب ہیں کیسے آدمی۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک پروفیسر قسم کا آدمی آیا، ان کے استاد کی کرسی پر بیٹھ گیا اور پورے کلاس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے کچھ بولی (ہم یہاں کچھ بولی کا ترجمہ نہیں کرسکتے مگر اس نے جس انداز سے باتیں کیں انھیں ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے) میں باتیں شروع کیں۔

کلاس پر نظر دوڑا کر انسپکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا: "بھئی مجھے اس وقت آپ لوگوں کا امتحان لینا چاہیے، مگر میرا جی نہیں چاہتا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات دوڑ رہے ہیں۔ اور کسی کام پر طبیعت نہیں جمتی۔ بات یہ ہے کہ مجھے اپنے لیے گھر بنوانا ہے، اور مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

بچوں کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ایسا آدمی ہے تو ہمارا امتحان کیا لے گا۔ ہمیں تو اُلٹی اس کی مدد کرنا ہے۔

ایک لڑکے نے ایک طرف سے پوچھا:

"انسپکٹر صاحب آپ نے مکان کے
لیے زمین بھی حاصل کرلی ہے ؟"
انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا: "نہیں۔"
ایک اور لڑکے نے کہا: "بھلا یہ
کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ زمین کے بغیر
مکان بنالیں۔" ایک اور لڑکے نے
ہمدردی کے لہجے میں پوچھا: "اچھا یہ
تو بتایئے آپ بنانا کہاں چاہتے ہیں؟"
انسپکٹر نے کچھ سوچ کر کہا: "بھئی
اس شہر کا جو حصّہ کیا نام ہے اس کا
بوگن ہاؤزن۔ وہاں بنوانا چاہتا ہوں"
"ارے وہاں تو زمین بہت مہنگی
ہے۔"
"اچھا؟ مگر مجھے یہ بھی تو نہیں معلوم
ہے کہ ایک مکان کے لیے کتنی مربع
فٹ زمین چاہیے۔"
ایک اور لڑکے نے ہاتھ اٹھایا،
اور کہا: "میرے والد ٹھیکے داری کرتے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ اچھے مکان کے لیے کم
ازکم ایک ہزار فٹ مربع زمین ہونا
چاہیے۔"

انسپکٹر نے پوچھا: "ایک ہزار مربع فٹ
کی قیمت کتنی ہوگی؟"
لڑکے نے جواب دیا: "میرے والد
کہتے ہیں، پانچ مربع فٹ کی قیمت
ایک مارک ہے۔"
انسپکٹر نے اپنا سر کھجایا: "بھئی یہ تو
میں بھول ہی گیا کہ مجھے چوتھائی ایکڑ زمین
باغ کے لیے بھی چاہیے۔ اسے شامل
کرلیں تو پھر کیا دینا ہوگا؟"
میزوں اور کرسیوں کے کھسکنے کی آواز
آنے لگی اور سب لڑکے حساب لگانے میں
جُٹ گئے۔ پھر اک بارگی شور مچا: "دو ہزار
دو سو مارک دینے ہوں گے۔"
"ہونھ" انسپکٹر نے کہا: "بھئی اتنا تو
میرے پاس نہیں نکلے گا۔ معلوم ہوتا ہے
مکان اور زمین سب کو آدھا کرنا ہوگا
تب کیا خرچ ہوگا؟"
لڑکوں نے جلدی سے تقسیم کرکے
جواب بتادیا پھر ایک لڑکے نے پوچھا:
"اتنا تو آپ خرچ کرسکیں گے؟"
انسپکٹر نے جواب دیا: "ہاں اتنا تو

شاید نکل آئے مگر مکان بنانے کے لیے سیمنٹ بھی تو چاہیے۔ سیمنٹ کتنے میں آئے گا؟" ٹھیکے دار کے لڑکے نے ہاتھ اٹھایا: "آپ کو کم سے کم تین سو بوریوں کی ضرورت ہوگی۔ میرے والد کہتے ہیں کہ ایک بوری کی قیمت ڈھائی مارک ہوتی ہے۔"

تمام لڑکوں نے بغیر کہے ہوئے حساب لگانا شروع کر دیا ہر ایک کی کوشش تھی کہ انسپکٹر صاحب کی مدد کے لیے سب سے پہلے وہی صحیح جواب نکال دے۔

انسپکٹر صاحب بھولے بن کر ایسے ہی سوال پوچھتے رہے جن میں حساب لگانے کی ضرورت ہوتی تھی اور آخر میں انسپکٹر صاحب کو معلوم ہوگیا کہ لڑکوں کی حساب کی معلومات کیسی ہیں۔

جغرافیے کا امتحان لینا باقی تھا۔ انھوں نے کہا: "بھئی اب ہم سب تھک گئے ہیں ذرا سستا لیں۔"

سب لڑکے چلا اٹھے: "جی نہیں جی نہیں ہم تھکے نہیں ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا: "اچھا آپ تھکے نہیں ہیں تو میری کچھ اور مدد کر دیجیے۔ مجھے کہیں جانا ہے مگر طے نہیں کر پاتا کہ کہاں جاؤں؟"

ایک لڑکے نے کہا: "میں آپ کی جگہ ہوتا تو چین کا سفر کرتا۔"

"چین کا؟ لیکن وہاں جاتے کیسے ہیں؟"

"وہاں آپ جہاز پر جا سکتے ہیں اور ریل سے بھی ہمارے استاد نے بتایا ہے کہ جہاز سے جانے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔"

ایک لڑکے نے کہا: "میں تو جہاز سے جاتا۔"

دوسرے نے کہا: "اور میں ریل کو جاتا۔ ریل سے جاتے ہوئے ایک بہت بڑی جھیل ملتی ہے یہ ہماری سب سے بڑی جھیل بوڈن زے سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ ہمارے استاد نے بتایا ہے کہ اس کا نام بائکال ہے۔"

انسپکٹر صاحب بیچ میں بول اٹھے:

کبھی میرے لیے چین تو بہت دور ہے۔ میں تو یہیں کہیں جرمنی میں جانا چاہتا ہوں"۔

"جرمنی میں کہیں جانا ہو تو برلن جاؤں وہ ہمارے ملک کی راجدھانی ہے"۔

"ارے واہ برلن بھی کوئی جگہ ہے! میں تو بحر شمالی جاؤں۔ ہمارے استاد نے بتایا ہے کہ وہاں بہت سے اچھے اچھے پتھر ملتے ہیں"۔

جس لڑکے نے چین کے سفر کا مشورہ دیا تھا، اس نے کہا: میں چین نہ جا سکتا تو کشتی پر دریائے رہائن کی سیر کرتا۔

اس بات سے انسپکٹر صاحب کو دریائے رہائن کے بارے میں سب کچھ دریافت کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے پوچھا کہ رہائن کہاں سے نکلتا ہے۔ اور کس سمندر میں جا کر گرتا ہے، اس کے کنارے کون کون سے شہر ہیں۔ ان شہروں کی کون کون سی باتیں مشہور ہیں۔ رہائن کے کنارے کس کس قسم کے انگور ہوتے ہیں۔ رہائن میں کون کون سی مچھلیاں ملتی ہیں۔

لڑکے دیر تک جو کچھ معلوم تھا بتاتے رہے، اس لیے کہ انسپکٹر صاحب کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود کچھ جانتے نہیں ہیں اور یہ سب باتیں ان کے لیے نئی ہیں۔ آخر میں چپراسی نے کلاس کا دروازہ کھولا اور کہا: "انسپکٹر صاحب ساڑھے بارہ بج گئے ہیں"۔ انسپکٹر صاحب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے: "ارے اتنی دیر ہوگئی۔ مجھے تو بارہ بجے معائنہ ختم کر دینا چاہیے تھا۔ اچھا بچو۔ تم نے اپنے سبق خوب یاد کئے ہیں۔ اور بڑے اچھے جواب دیے ہیں۔ اب گھر جاؤ اور امی سے کہو کہ کوئی مزے کی چیز پکا کر کھلائیں۔"

سید منیر الحسن صاحب استاد مدرسہ ابتدائی

بچوں کی حکومت کا الیکشن

اچھا صاحب اتنا تو آپ کو معلوم ہے کہ بچوں کی یہ حکومت مدرسہ ابتدائی جامعہ میں قائم ہے۔ اس کا ایک دستور ہے۔ اس دستور کے مطابق چناؤ تعلیمی سال کے شروع میں ہر سال ہوتے ہیں۔ اس چناؤ میں مدرسے کے تمام لڑکے حصہ لیتے ہیں۔ حکومت میں صدر اور چیف جسٹس کے علاوہ نو وزیر اور ہوتے ہیں۔ البتہ صدر کا چناؤ مدرسے کے تمام لڑکے کرتے ہیں اور وزیران ممبروں میں سے چنے جاتے ہیں جو درجوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔

مگر اب یہ بتایئے کہ صدر کا الیکشن کیسے ہوتا ہے۔ تو جناب اس کا طریقہ یہ ہے کہ چناؤ افسر ترانے میں صدر کے چناؤ کی مناسب تاریخ کا اعلان کرتا ہے اور تیاری کے لیے کچھ وقت کی مہلت دیتا ہے۔ اس طرح چناؤ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جیسے ہی ترانے میں چناؤ کی تاریخ (۷ار ستمبر ۱۹۶۴ء) کا اعلان کیا گیا بچوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ زوردار تالیوں سے اس اعلان کا استقبال کیا گیا۔ اور اسی دن سے انتخابات کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ ووٹروں کی فہرستیں تیار ہونے لگیں۔ صدارت کے لیے امیدوار تلاش کیے جانے لگے۔ ان کے نام پیش کرنے اور واپس لینے کی تاریخیں مقرر

کی گئیں۔ آخر چناؤ افسر رفیق احمد خاں
ابتدائی پنجم نے اعلان کیا کہ صدارت
کے لیے جو لوگ امیدوار تھے ان میں
سے تین کے علاوہ باقی نے اپنے نام
واپس لے لیے ہیں۔ اب جو تین
امیدوار میدان میں رہ گئے ہیں ان
کے نام یہ ہیں۔ افسرامین۔
شوکت علی ۔ جاوید علی۔ مقابلہ
انھی کے درمیان ہوگا۔ ان حضرات
نے اپنے لیے جو نشان تجویز کیے ہیں
وہ یہ ہیں:-

(۱) افسرامین .... راکٹ
(۲) شوکت علی .... سورج
(۳) جاوید علی .... چاند تارہ

اس خبر سے تینوں امیدواروں کے
ہمدردوں، ساتھیوں اور دوستوں میں
ایک جوش پیدا ہوا اور وہ "بچوں کی حکومت
زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ مدرسے
میں چھٹی کے بعد اور وقفے میں اپنے
اپنے امیدواروں کے حق میں نعرے
لگانے لگے۔ جلوس نکالنے لگے۔ پوسٹر
اور چارٹس تیار کرنے لگے۔ ووٹروں کے پاس
جاکر امیدواروں کے حق میں نظمیں اور
مضامین پڑھنے لگے۔ اگر ان سب مضامین
اور نظموں کا ذکر یہاں کیا جائے تو بات
بہت بڑھ جائے گی اس لیے ان کو
نظرانداز کرتا ہوں۔

اب آپ چناؤ والے دن کا حال
سنیے اس دن مدرسہ ابتدائی کے
مشرقی صدر دروازے کے تینوں حصوں
کو امیدواروں نے اپنے اپنے چارٹوں
اور پوسٹروں سے خوب سجایا تھا۔ جن
پر امیدواروں کے نشان چاند تارا،
سورج اور راکٹ کے علاوہ لیڈروں،
جانوروں، پرندوں، جنوں اور پریوں کی
اچھی اچھی تصویریں اور کارٹون بنے
ہوئے تھے اور ہم اپنے اپنے امیدواروں
کے حق میں ووٹ ڈالنے جا رہے تھے۔
بڑا ہی پرلطف سماں تھا۔ دیکھنے سے
تعلق رکھتا تھا۔ کپڑے کی چادریں
جو جھنڈوں کی طرح لہرا رہی تھیں
ان پر اچھے اچھے فقرے لکھے ہوئے تھے۔

مثلاً شوکت صدر ہمارا ، افسر امین زندہ باد۔ جاوید علی کو ووٹ دو۔

ابھی ترانہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ چنانچہ کچھ بچے مدرسے کی تیسری منزل پر چڑھے ہوئے ترانے کے بعد اپنے اپنے امیدواروں کی حمایت میں پرچیاں لٹانے کے لیے صدر دروازے کی طرف رخ کیے ہوئے تیار کھڑے تھے۔ جیسے ہی ترانہ ختم ہوا۔ ٹڈی دل کی طرح پرچیاں اوپر سے نیچے گرنے لگیں اور "بچوں کی حکومت زندہ باد" کے نعروں کے ساتھ لوٹی جانے لگیں۔ ہر طرف خوشی، قہقہے اور نعرے بکھر گئے۔ جب یہ دلکش منظر گذر گیا تو اعلان ہوا کہ اب محمد علی ہال میں جو مدرسے کے مغرب کی طرف واقع ہے انتخابی جلسہ ہوگا وہاں تشریف لے چلیے۔ چنانچہ سب محمد علی ہال پہنچ گئے اور جس کو جہاں جگہ ملی سلیقے سے بیٹھ گیا۔ استاد بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔ دوسرے اسکولوں کے آئے ہوئے مہمان بھی خصوصی جگہ پر بیٹھ گئے۔

امیدواروں کے ہمدرد، دوست اور ساتھی بڑی تیاری کے ساتھ آئے تھے اس لیے کہ آج ہی ان کے امیدواروں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ کانا پھوسی اور مشوروں کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اتنے میں جلسے کی کارروائی شروع کیے جانے کا اعلان ہوا اور سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ لاؤڈ اسپیکر لگ چکا تھا۔ دیکھا تو جاوید علی کی حمایت میں ان کے ایک ساتھی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا — حضرات! (جاوید علی کی طرف دیکھتے اور اشارہ کرتے ہوئے) ان کا نشان چاند اور تارا ہے۔ یہ چودھویں رات کے چاند کی طرح بچوں کی حکومت کو ترقی دیں گے اور جس طرح چاہے دنیا کے کونے میں رہو لیکن چاند تارا ہر وقت ہمارے ساتھ رہتا ہے اسی

طرح یہ بھی بچوں کی حکومت کے کاموں کو اور اس کے مقاصد کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں گے۔ امید ہے کہ آپ اپنے ووٹ کا استعمال سوچ سمجھ کر کریں گے۔ اب آپ سب مل کر میرے ساتھ یہ نعرے لگائیے

جاوید علی...... زندہ باد ؎

چاند کی طرح چمکتا ہے
سب کے دل کو یہی لبھاتا ہے
چاند تارے کا ہے نظارا
جاوید علی صدر ہمارا

اس کے بعد امیدوار جاوید علی کو پکارا گیا۔ انھوں نے آتے ہی کہا۔ ساتھیو! آپ جانتے ہیں ایسے مواقع پر امیدوار بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ طرح طرح کے راگ الاپتے ہیں مگر ایسی بات کرنے سے کیا فائدہ جو پوری نہ ہو۔ اس لیے میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ — میں محمد علی ہال، خوانچہ مطبخ، کھیل کے میدان، غسل خانے پاخانے اور پینے کے پانی کو بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ ہوگا کیسے اس کا فیصلہ مجھے نہیں آپ کو کرنا ہے۔ یہ کہہ کر جاوید علی بیٹھ گئے۔ تالیاں بجتی رہیں۔ اب نظم کی باری تھی۔ اس کے چند شعر یہ تھے ؎

آج جاوید کی قسمت کا ستارا چمکا
آسماں پر پھرا در ہمارا چمکا
یہ الیکشن کی خبر کیسی مبارک ہے کہ آج
جامعہ کے در و دیوار پہ تارا چمکا

اب دوسرے امیدوار شوکت علی کے نمائندے کی باری تھی۔ ان صاحب نے آتے ہی پہلے تو نعرے لگوائے۔

گلی گلی میں نعرہ ہے
شوکت صدر ہمارا ہے
کھیلو کودو شور مچاؤ
شوکت کو تم صدر بناؤ
ہوا ساری دنیا میں ایسی چلی
صدارت کے قابل ہے شوکت علی

سارا محمد علی ہال گونج اٹھا۔ اس کے بعد ان کے حق میں بولنے کے لیے دوسرے صاحب آئے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ان کا امتیازی نشان سورج ہے۔ جو ہر روز چمکتا ہے۔ اندھیرا دور کرتا ہے روشنی پہنچاتا ہے۔ اگر آپ نے ان کو کام کرنے کا موقع دیا تو یہ بھی بچوں کی حکومت کو چمکانے اور اس کے نام کو روشن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔

نظم میں کہا گیا ؎

اندھیارا بھگاتا ہے
سورج کو بناتا ہے
نقشہ یہ جماتا ہے
شوکت کو بناتا ہے
صدر اپنی حکومت کا

اب خود شوکت علی اپنا پروگرام بتانے تشریف لائے اور اپنی تقریر اس طرح شروع کی ـــ آپ اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کریں۔ اندھیرے اور روشنی کے فرق کو سمجھیں۔ کچھ لوگ آپ سے اس طرح کے وعدے کریں گے کہ اگر مجھے صدر بنایا تو میں مطبخ میں ہر روز بریانی پکواؤں گا۔ پڑھائی

بالکل نہیں ہوگی۔ بس کھیل ہی کھیل ہوں گے۔ بورڈنگ میں معمولات کے بجائے پکنک ہوا کرے گی۔ آپ خود سمجھ دار ہیں اس طرح کی باتیں کرنے سے فائدہ! ـــ البتہ میں مدرسے کی آرائش، کہانیوں کی نئی کتابیں، کھیل کا نیا سامان، بورڈنگ میں تفریحی مشاغل، مطبخ میں صفائی کا انتظام، وغیرہ کے سلسلے میں کوشش کروں گا۔ جہاں تک ووٹ کا تعلق ہے وہ آپ اس کو دیں جس سے آپ کو صحیح روشنی ملے یہ کہہ کر شوکت صاحب چلے گئے اور زندہ باد کے نعرے لگتے رہے۔

اسی بیچ میں افسرامین کے نمائندے کو موقع دیا گیا۔ انھوں نے آتے ہی بتانا شروع کیا۔ ان کا نشان راکٹ ہے۔ یہ بچوں کی حکومت کو راکٹ کی سی تیزی کے ساتھ ترقی کی منزل پر لے جائیں گے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکے گا جب آپ اپنا قیمتی ووٹ

ان کے حق میں استعمال کریں۔ یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ یہ دوم سے برابر اول نمبر کامیاب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ مدرسے کے ذمے دار طالب علم ہیں۔ اس لیے اس عہدے کے لیے ان سے بہتر امیدوار اور کون ہو سکتا ہے۔ اب آپ میرے ساتھ ان کے حق میں کچھ نعرے لگائیے:-

افسر صدر ہمارا
راکٹ ہے جس کا نیارا
پانی پیو چھان کے
ووٹ دو پہچان کے
افسر ہے دیکھا بھالا
صورت کا بھولا بھالا

سب بچوں نے دل کھول کر نعرے لگائے۔ اس کے بعد اب خود افسر امین کو اپنا پروگرام پیش کرنا تھا۔

یہ نام پکارنے پر اپنی جگہ سے اٹھے اور تقریر کرنے پہنچ گئے ـــ کہنے لگے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں جمنازیم کے میدان کو بہتر بنانے، کلاسوں میں پنکھے لگوانے، کھیل کے میدان تیار کرانے بچوں کے پارک کو اچھا بنانے اور منطبخ کے ناشتے کو بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔ یوں تو اور بھی بہت کہا جا سکتا ہے لیکن میں ایسی کوئی بات اپنے منہ سے نہیں نکالنا چاہتا جو پوری نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ان کے حق میں ایک اچھی سی نظم پڑھی گئی۔ یہ دو شعر آپ کو بھی سناتا ہوں یقیناً پسند آئیں گے۔

افسر نے اپنا راکٹ کیا خوب ہے اڑایا
جس نے سنا اسی نے بس اس کا گیت گایا
سب اس کو جانتے ہیں یہ سب کا دیکھا بھالا
اور مدرسہ کا اس نے اب تک نہ کام ٹالا

جلسہ بہت کامیاب رہا، سب نے اس کی تعریف کی۔

اب ووٹنگ کا وقت قریب آرہا تھا۔ اس لیے جلسہ کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا اور جلوس نکالنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ ادھر لڑکے جلوس نکالتے رہے، ادھر ووٹ

ڈالنے کے لیے انتظامات ٹھیک ٹھاک کیے جانے لگے۔ لڑکے زور دار جلوس نکال رہے تھے۔ آخر خدا خدا کرکے ووٹنگ کا وقت آیا اور لڑکے اپنے اپنے درجے کی لائن میں شریک ہونے لگے۔ ووٹنگ کیمپ صدر دروازے کے قریب تھا۔ اور بچے قطار در قطار سامنے پارک میں تیار کھڑے ہوئے تھے۔

ووٹنگ کیمپ میں ووٹ ڈالنے کے لیے ڈبے رکھے تھے جن پر امیدواروں کے نشان تھے۔ چناؤ افسر کے علاوہ تینوں امیدواروں کا ایک ایک نمائندہ بھی یہاں آگیا۔ نگرانی کے لیے کچھ اور ذمے دار حضرات بھی آگئے اور ووٹنگ شروع ہوگئی۔ چناؤ کا یہ سین بھی بڑا ہی بھلا معلوم ہورہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اس طرح سے شہریت کی عملی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ایک اچھے شہری ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ تینوں امیدوار بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ بڑی چہل پہل تھی۔ ووٹ ڈالنے کا کام بڑی اچھی طرح ہورہا تھا۔

ووٹنگ کے بعد نتیجہ ۳ بجے سنانے کا اعلان کیا گیا۔ اب تو ہر ایک سوچ رہا تھا کہ دیکھو کیا ہوتا ہے، ہم نے تو اپنی سی کوشش کرلی۔ امیدوار اور ان کے ہمدرد بھی بے چینی سے تاک جھانک کرتے رہے اور پتہ لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

چنانچہ تین بجے چناؤ افسر صاحب نتیجہ لے کر محمد علی ہال پہنچے وہاں پر نتیجہ کا اعلان کیا گیا۔ افسر امین جیت گئے تھے اسی وقت ان کے ساتھی ان کو لے کر آئے۔ باقی دونوں امیدوار شوکت علی اور جاوید علی نے ان کا استقبال کیا اور ان کو کامیاب ہونے پر مبارک باد دی اور ہار پہنائے۔ اس وقت بڑا ہی

جوش وخروش تھا۔ سب ایک ہوگئے تھے اور افسر امین صاحب کو کندھے پر اٹھائے مدرسے کے چاروں طرف زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس کی شکل میں لے جا رہے تھے۔

اس کے کچھ دن بعد ممبران بھی منتخب ہوکر آگئے تھے۔ جن میں سے حکومت کے دوسرے عہدے دار چنے جانے والے تھے۔ جب یہ کام بھی ہوگیا تو ایک دن ترانے میں بچوں کی حکومت کے نئے عہدے داروں کو سامنے لایا گیا۔ آپ بھی ان سے مل لیجیے۔

صدر بچوں کی حکومت۔ افسر امین

چیف جسٹس : جاوید علی
وزیر داخلہ : رفیق احمد خاں
وزیر اطلاعات : اقبال عثمانی
وزیر صحت : مجیب الحق
وزیر کھیل : ظفر احمد کشمیری
وزیر اعظم : شوکت علی
وزیر آرائش : شبنم مجیب
وزیر تعلیم : جاوید لطیف
وزیر خوراک : وکیل احمد
وزیر مالیات : ندیم قریشی

اگر ان وزراء کے کاموں اور حکومت کی ذمہ داریوں کا ذکر بھی آپ سے کیا جائے تو بہت وقت صرف ہوگا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ یہ حکومت ہندوستان میں اپنی مثال آپ ہے۔

ایجنٹ حضرات!

پیامِ تعلیم یہاں سے ۲۵ تاریخ کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے آرڈر میں کمی بیشی کرانی ہو تو براہ کرم ہمیں ایسے وقت خط لکھیے کہ ۲۴ تاریخ کو ہمیں ضرور مل جایا کرے۔

'منیجر'

ہم ووٹ دینے جائیں گے

اکتوبر کے پرچے میں "مدرسہ ثانوی کی مجلس طلبا" کے انتخاب پر ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ ۷ ستمبر کو ہمارے مدرسہ ابتدائی میں بھی انتخابات ہو گئے۔ بڑی دھوم سے ہوئے۔ لڑکوں میں بہت جوش تھا۔ اسی جوش سے فائدہ اٹھا کر سید احمد علی صاحب نے ایک مشاعرہ بھی کرا دیا۔ دیکھیے آپ کے ننھے ساتھیوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ (ایڈیٹر)

فیروز اختر، ۱۳ سال	ووٹ دینے آج ہم سب جائیں گے	آج ہم دنیا کو یہ دکھلائیں گے
" " "	مل کے ہوتا ہے الکشن کس طرح	آج عملاً اس کو ہم سمجھائیں گے
احسن علی، ۱۲ "	ہو گئیں تقریریں سب گرما گرم	آج جوہر اپنے ہم دکھلائیں گے
شبنم مجیب، ۱۱ "	ووٹ دے کر اچھے امیدوار کو	ہم سمجھ کا امتحاں دے آئیں گے
" " "	پڑھنے، لکھنے، کھیل میں ممتاز ہو	ووٹ دے کر اس کو ہم آ جائیں گے
افسر امین، ۱۰ "	جس میں ہوں گی ہر طرح کی خوبیاں	ووٹ اس کے واسطے آزمائیں گے
" " "	سوچیے پھر ووٹ اپنا دیجیے	آپ کیا پھسلانے میں آ جائیں گے
رخشندہ خاتون، ۱۰ "	تین ہیں میدان میں امیدوار	ووٹ دینے کس کے حق میں جائیں گے
مصطفےٰ علی، ۱۱ "	حضرت جاوید، شوکت اور امین	تین میں سے کس کے حق میں جائیں گے
مجیب الحق، ۱۱ "	صدر کے قابل وہی ہوگا ضرور	جس میں اچھی خوبیاں بھر پائیں گے
شکیب اختر، ۱۲ "	چاند، تارا، راکٹ و خورشید ہیں	اب کمرے میں نشاں سب پائیں گے
ضمیر حسن زیدی ۱۱ "	پہنچیں گے راکٹ زمیں سے دور دور	چاند اور سورج سے بھی مل آئیں گے
مصطفےٰ "	نظم اور تقریر تو ہم نے سنیں	اب سمجھ کر ووٹ دینے جائیں گے
شمامہ خاتون، ۱۰ "	ان میں سے جو بھی صدر بن جائے گا	ایک کرسی پر انھیں بٹھلائیں گے
شان الحق، ۱۰ "	یہ ارادہ کر لیا ہم سب نے آج	جو بھی جیتا ہار ہم پہنائیں گے
افسر امین،	تو بچے کا نعرہ ہمارا۔ زندہ باد	کامیابی کی خبر جب پائیں گے

محترمہ آصف مجیب

چارہ گر بھی کیا کرے؟
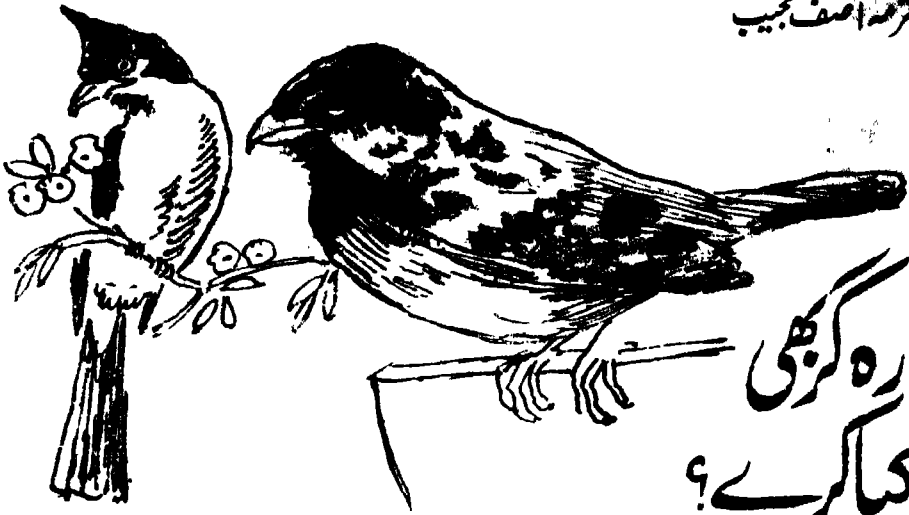
"چوں چوں چوں۔ چیوں، چیوں" گوریوں نے کیا شور مچا رکھا ہے! ان کی بھی عجیب ذات ہے۔ ظاہر میں تو آدمی سے بھاگتی ہیں۔ کھنچی کھنچی رہتی ہیں جیسے کچھ مطلب کچھ واسطہ ہی نہیں۔ اور دل میں بڑی انسیت ہے۔ ہمیشہ اردگرد اڑتی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں یہ ذات شریف نہ ہوں۔ بلکہ اکثر تو جا و بے جا عمل دخل رہتا ہے۔ دیوار کا کوئی کونا ہو۔ روشن دان ہو، الماری ہو، غرض جہاں دیکھیے موجود۔ ابھی بھگاؤ، ابھی پھر وارد۔ بھولی بھولی موہنی صورت، نازک نازک سی۔ مگر اپنے کام کاج میں بڑی ہوشیار چست چالاک۔ باتیں خوب بگھارنا آتی ہیں۔ چیخ چیخ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر نہ جانے کیا کچھ اڑاتی رہتی ہیں۔ ذرا غور کرے انسان تو کچھ پلے پڑ ہی جاتا ہے کہ آخر چاہتی کیا ہیں۔

سلمہ بی کے کمرے میں گھس آئیں،

آفت اٹھا دی۔ انھوں نے دوپٹہ کا پلو ہلا کر
بھگایا تو پھر سے ایک اِدھر سے اڑ کر
اُدھر جا بیٹھی۔ دوسری اڑی تو اُدھر
سے اِدھر، یہ یہاں سے چیخی دوسری
نے وہاں سے پٹ سے جواب دیا،
آئے دن ان کے یہاں کچھ نہ کچھ ہوتا
ہی رہتا ہے۔ گھر بنانا۔ انڈے سینا۔
بچوں کی پیدائش، ان کی سیوا ہزاروں
دھندے ہیں۔

جانو اب انڈے دینے کے دن
آگئے ہیں۔ گھونسلے کی فکر سوار ہے۔
جگہ کا انتخاب ہو رہا ہے۔ مگر یہ کوئی
مناسب جگہ نہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں۔
سلمہ بی نے احتیاطاً چقیں چھڑوا دیں کہ
کمرہ تو محفوظ رہے۔ مگر توبہ۔ وہ چق
پر اچک رہی ہیں۔ دروازوں سے
اندر جھانک رہی ہیں، کہیں ذرا سی
جگہ مل گئی گھس آئیں، ستلی، دھجی،
تاگے، تنکے، کوڑا کرکٹ جانے کیا
کیا الابلا چونچوں میں سمیٹے اور لاکر
چپکے سے کہیں ٹھونس گئیں۔ اب کوئی
کیسے سمجھائے کہ بھئی یہاں چار بھلے مانس
بیٹھے ہیں۔ کیا سروں
پر تنکے وغیرہ گراؤگی؟ میز تخت فرش
پلنگ سب گندہ کروگی۔ کہیں اور یہ
کام کرو۔ باہر اتنے پیڑ پڑے ہیں
وہاں جاؤ۔ بس گھر ہی سوجھتا ہے
تمھیں۔ پر وہ تو دیوانی ہوئی جا رہی
ہیں۔ دروازے کا کوئی سرا ہو۔ کوئی
کونہ ہو جہاں بس تنکا ذرا ٹک جائے
ماشاء اللہ گھونسلا تیار۔ اور پھر ہوا کا
ایک جھونکا جو آیا تو بنایا بنایا محل
پل بھر میں اڑا اڑا دھم۔ زمین پر آ رہا۔
کہیں کسی نے جھاڑو مار دی، یا جھاڑن
لے کر بیخ دیا۔ ساری محنت اکارت
روز یہی تماشا۔

ایک دن سلمہ بی زینہ کی طرف
جا رہی تھیں انھوں نے دیکھا زمین
پر کئی انڈے چور چور پڑے ہیں۔
کہیں اوپر سے گر پڑے ہیں۔ دو
چڑیاں جو یقیناً ماں باپ ہیں فرطِ غم
سے سر نیوڑھائے دروازے پر بیٹھی

ہیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی ہے جنھیں تو معلوم ہوا کہ آسمان لرز اٹھا۔ جھونجھ جو بڑی محنت مشقت سے بنا تھا الگ ٹوٹا پڑا ہے۔ بکھرا ہوا ہے یہ دردناک نظارہ دیکھ کر اور ان کی فریاد سن کر سلمہ بی کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ بھی ان کے رنج و غم میں شریک ہو گئیں۔ کبھی چڑیوں کو دیکھتیں جن کے معصوم چہروں پر حسرت برس رہی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوئے انڈوں کو۔ انھوں نے سر پکڑ لیا۔ اف ـــــ!

"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

آج کم بختوں کے ارمانوں کا خون ہو گیا۔ اتنا شعور نہیں کہ ڈھنگ سے اچھی جگہ دیکھ بھال کے گھونسلا بنایا کریں۔ کیسے گرا کیا ہوا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ قسمت نے چرکا دیا۔ بنا بنایا کھیل پلک مارتے میں بگڑ گیا۔

انھوں نے گھر میں سب آدمیوں اور سب بچوں کو منع کیا کہ "دیکھو اگر جھونجھ میں چڑیوں نے انڈے، دے دیے ہوں تو خبردار کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ اور کسی طرح سے گر جائیں تو مجبوری ہے۔"

اب کیا تھا۔ کمرے کے پاس کہیں جھونجھ لگالیا۔ انڈے دیے۔ بچے نکل آئے۔ ایک ساتھ سب بولتے تو معلوم ہوتا۔ گھنگھرو بج رہے ہیں یا ساز کی سُریلی جھنکار ہو۔ آنکھوں میں خاک بچے ایک ایک پل میں بڑھ رہے تھے۔ پر نکلے، اللہ نے اڑنے کی طاقت دی۔ ذرا اڑے پھر دھم سے گرے۔ پھر جست لگائی۔ گھونسلے کو خیرباد کہا۔ روزی کی تلاش میں نکلے۔ مگر ماں باپ جگر گوشوں سے غافل نہیں تھے۔ ہر قدم پر مدد کرتے۔ سلمہ بی روٹی توڑ توڑ کر ڈالتیں۔ تو دیکھتیں کچھ بچے بھی ماں باپ کے ساتھ ہیں۔ پر پھڑ پھڑا کر منہ کھول دیتے ہیں چڑیاں چونچ میں لے کر نوالہ کھلا دیتی ہیں۔ ایک آدھ خود بھی کھاتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر بچے بھی

ایک آدھ نوالہ اٹھا لیتے۔ یوں ہی
تعلیم اور پرورش ساتھ ساتھ ہو رہی
تھی۔

اب سلمہ بی سے چڑیوں کی اچھی
خاصی دوستی ہو گئی۔ چڑیاں ان کی
پیار کی نظروں کو پہچانتی تھیں۔ جب
وہ روٹی مہین مہین توڑ کر ڈالتیں
تو پہلے ذرا فاصلے سے چڑیاں
کن انکھیوں سے انھیں دیکھتیں۔
پھر گردن دوسری طرف موڑ لیتیں۔
جھجک کر ذرا آگے بڑھتیں۔
بے نیازی سے تھوڑی دیر اِدھر اُدھر
ٹہلنے لگتیں۔ مُڑ مُڑ کر دیکھے جاتیں
ایک دم اچک کر روٹی چگ لیتیں۔
کچھ کھٹکا ہوتا تو وحشت سے اڑ جاتیں
اور ذرا ہی میں سلمہ بی کا پرخلوص اشارہ
پا کر لوٹ آتیں۔ روٹی کھا کر کورے
سکورے میں ٹھنڈا پانی پیتیں اور
تازہ دم ہو کر اڑ جاتیں۔ اب روز
یہی معمول ہو گیا۔ دوستی کے پینگ
بڑھنے لگے۔ اس کے ساتھ چڑیوں کی

تعداد بھی۔ کھانا ملنے کے صحیح وقت کا
خوب اندازہ ہو گیا۔ ذرا پہلے ہی سے
دو چار آکر ٹہلنے لگتیں۔ چکر لگا جاتیں
سلمہ بی کی آہٹ پر کان لگے رہتے۔
دروازہ ذرا سا کھٹ سے ہوا اور
شاخوں منڈیروں پر سے فراٹے
بھرتی حاضر۔ کبھی بے وقت آکر گھیر
لیتیں۔ کہیں سلمہ بی بیٹھی ہوں یہ بھی
پٹی کے پاس آکر کھڑی ہو جائیں،
اور منہ دیکھنے لگیں۔ وہ مسکرا پڑتیں
کہیں سے روٹی کے ٹکڑے یا دو
چار دانے دال چاول جو ان کی
محبوب غذا ہے، لاکر بکھیر دیتیں۔
یہ ناشتہ ہو گیا۔ احسان مند نگاہوں
سے دیکھتیں اور چلی جاتیں۔ سب جمع
ہوتیں تو آپس میں شائد ہی کسی
میں دو دو چونچیں ہو جاتیں، ورنہ
جس کو جتنا حصہ ملتا خوشی سے لے
لیتا۔

مگر دنیا بھلا کسے چین سے رہنے
دیتی ہے۔ بھولی بھالی چڑیوں کا سکھ

سے دو نوالے کھانا کسی کو نہیں بھایا۔
ننھی منی گوریوں کی یہ خاطر تواضع
دیکھ کر میناؤں کو بھی حوصلہ ہوا،
ٹھک ٹھک کر بڑی شان سے آدھمکیں
زرد زرد بڑی بڑی چونچوں میں موٹے موٹے
نوالے بھر، ہڑپ کر گئیں۔ اوپر سے
ٹھونگیں الگ ماریں۔ چڑیوں کا ناک
میں دم کر دیا۔ چخ چخ بھی ہوئی، لیکن
سچ تو یہ ہے چڑیوں نے بڑا صبر کیا۔
الگ ہٹ گئیں۔ لال گلدم اور دوسری
چڑیاں بھی حصہ بٹانے آ کھڑی ہوئیں
خیر کچھ بھائی چارہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔
فاختائیں کبھی کبھی بہ حیثیت مہمان کے

ایک خرام ناز سے آئیں۔ کیسا بھرا بھرا
سڈول خوب صورت بدن ہے۔ انھیں

تو یہی ڈر رہتا ہے کہ کہیں ان کو دیکھ کر
انسان کے منہ میں پانی نہ بھر آئے۔
جو گولی کا نشانہ بنائے۔ دو چار
نوالے کھائے اور شکریہ ادا کر کے
چمپت ہو گئیں۔
ایک گلہری درخت پر چڑھ کر
روز یہ تماشا دیکھا کرتی۔ آخر ایک

دن دھاوا ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی
دو ایک ہم سائیاں (پڑوسنیں)، سکھی
سہیلیاں بھی ساتھ لگ گئیں۔ الٰہی توبہ!
انھوں نے تو تختہ ہی پلٹ دیا۔ موئی چھل سی

دم ہلا ہلا کر چڑیوں کو ہشکار، قبضہ مخالفانہ
کر بیٹھیں۔ مینائیں ابھی تک ڈٹی
تھیں ان کی ٹانگ پکڑنے دوڑیں۔
وہ کہاں ماننے والی تھیں۔ روٹی دونوں
ہاتھوں میں دبا، اکڑوں بیٹھ کر مزے
میں کڑکڑ کھانے لگیں۔ یہ صحبت
ناجنس کا معاملہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ اتنے
مضبوط ہاتھ پیر۔ پھل پھلاری، سب
ہی کچھ کھا سکتی ہیں پھر چار دانوں
پر کیوں ٹوٹی پڑتی ہیں، کمزور کا
حصہ ہڑپ کر رہی ہیں یہ کہاں کا
انصاف ہے۔ چڑیاں اور مینائیں۔
سب بہت خفا تھیں۔ کچھ زور نہیں
چلا، مگر حق سے دست بردار ہونا
گوارا نہیں ہوا۔

چھین جھپٹ ہوا کرتی۔ لڑائیاں،
نوچ کھسوٹ۔ مینائیں میناؤں کو
جھڑکیں۔ گلہریاں ایک دوسرے کو
کاٹنے دوڑیں کشتیاں ہوں۔ ایک
افراتفری پڑی رہتی۔

اب ایک اور مصیبت سر پر
منڈلاتی نظر آرہی ہے۔ کوؤں کو خبر لگ گئی
یہ تر نوالہ کیسے چھوڑتے۔ کالے کالے
پر پھڑپھڑاتے کائیں کائیں کی خوفناک

کرخت آوازوں کے ساتھ زن سے پھاند
پڑے۔ جیسے بم کے گولے پھٹ پڑے۔
یہ حملہ بہت سخت تھا۔ حشر کا عالم
تھا۔ غریب ننھی ننھی چڑیاں تاب نہ
لا سکیں۔ ایسا فراٹا مارا کہ پیچھے پھر کر
دیکھا بھی نہیں۔ گلہریوں کو تاؤ جو آیا
پیچھے سے دوڑ کر ٹانگ میں کاٹ کاٹ
کھایا۔ وہ اچھل اچھل پڑے۔ مگر
بے حیا کی بلا دور۔ میناؤں نے گلے
پھاڑ پھاڑ کر خوب کوسنے دئے۔ کون
سنتا۔ وہ اچک اچک کر سب
ہڑپ کر گئے۔ ایک منہ میں دس دس

نوالے۔ منٹ بھر میں سب صاف۔

یہ بلا غور ذلیل کوے جنھیں غلیظ چیزیں کھانے میں بھی عار نہیں جن کی کوئی کمی نہیں ہر جگہ پڑی مل جاتی ہیں۔ ناحق چڑیوں کا یہ مختصر سا حصہ ہڑپ کرنے آگئے ہوس کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ سب کچھ اپنے پاس ہوتے کسی نادار۔ کمزور کی کوئی چیز جبر سے قوت کے زعم میں ہضم کر جانا کتنی رکیک اور قابل نفرت بات تھی۔

یہ رنگ دیکھ کر سلمہ بی بڑی پریشان ہوئیں۔ کیا اندھیر مچا ہوا ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہو۔ کوؤں کو بھگائیں۔ اور ایسی تدبیریں سوچتیں کہ چڑیوں کو چار دانوں سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔ ان کے پیٹ میں بھی کچھ نہ کچھ پڑ جائے جب وہ سہم کر شاخوں اور پتوں میں چھپی ہوتیں تو دیکھتیں کہ سلمہ بی مٹھی میں کچھ لائیں اور چپکے سے ان کے سامنے کونے میں بکھیر دیا۔ انھیں یہ بڑی تسلی تھی کہ سلمہ بی کی ساری ہمدردیاں ان ہی کے ساتھ ہیں۔

ایک دن تو بس جان ہی جاتے جاتے رہی۔ جان کے دشمن بھی روٹی کی بدولت پیدا ہوگئے۔ خاصہ کا وقت تھا، خوان یغما پر جوق در جوق آکر جمع ہوئیں خوب جمگھٹا لگا تھا۔ ابھی نوالہ منہ تک گیا بھی نہیں کہ جھاڑی کے پیچھے دو گول گول آنکھیں تیز ٹارچ کی طرح چمکتی نظر آئیں۔ الاماں الحفیظ۔ گوریاں۔ مینائیں گلدم سب ایک ساتھ ہوا میں معلق ہوکر زور شور سے خطرے کا اعلان کرنے لگیں۔ آج یہ نئی مصیبت کیا آگئی سلمہ بی نے اٹھ کر جھانکا، یہ غوغا کبھی نہیں سنا تھا۔ ضرور کوئی جانی دشمن ہوگا۔ جھاڑی کے پیچھے سرسراہٹ ہوئی۔ بلی خالہ بگٹٹ سر پر پیر رکھ کر بھاگیں۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ یہ روٹی کے لیے تھوڑے ہی آئی تھیں۔ یہ تو بے چاری چڑیوں کی جان عزیز ہی کی پیاسی تھیں۔ داڑھ گرم کرنا چاہتی تھیں۔

اتنی چڑیاں ایک میدان میں ایک ساتھ کیا سنہری موقع تھا۔

چڑیوں نے اللہ کا ہزار ہزار شکر بھیجا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

کسی زمانے میں چتوڑ گڑھ ریاست میواڑ کی راجدھانی تھی اور آج کل سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ ریاست میواڑ میں صدیوں تک گہلوٹ راجپوت خاندان کی حکومت قائم رہی۔ یہ راجپوت راجہ اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے۔ ڈھال تلوار ان کا تکیہ اور گھوڑے کی پیٹھ ان کا بستر تھا۔ بہت کم راجپوت ایسے تھے جو جنگ کے میدان میں مرنے کی بجائے بستر پر جان دینا پسند کرتے تھے۔ یہ دھن کے پکے ہوتے تھے ان کا کہنا تھا "جان جائے پر آن نہ جائے"۔ چتوڑ گڑھ ایسے ہی دلیر اور سورما راجپوت راجاؤں نے بنایا تھا اسی لیے ہمارے دیش کے چوٹی کے جو چند قلعے ہیں ان میں چتوڑ گڑھ کا نام بھی لیا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگوں نے تو چتوڑ گڑھ اور بھوپال کے تال کی تعریف یہاں تک کی ہے کہ

"گڑھ میں گڑھ چتوڑ کا باقی سب گڑھیاں
تال میں تال بھوپال کا باقی سب تلیاں"

بھوپال کا تال تو ہم آپ کو کبھی پھر دکھائیں گے اس وقت چتوڑ گڑھ کی سیر کیجیے۔

چتوڑ گڑھ راجستھان میں پانچ سو فٹ اونچی ایک پہاڑی پر بنایا گیا ہے۔ قلعہ کے چاروں طرف بہت دشوار گزار اور ڈھلوان چٹانیں ہیں۔ یہ قلعہ شمالاً جنوباً کوئی ۳ ½ میل لمبا اور شرقاً غرباً آدھا میل چوڑا ہے۔ قلعہ کے چاروں طرف بہت مضبوط فصیل ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے شمال، مشرق اور مغرب میں تین دروازے ہیں نیچے سے اوپر تک پہنچنے کا جو

راستہ ہے وہ بہت کٹھن ہے اس میں جگہ جگہ پر موڑ ہیں اور ان موڑوں پر بڑے بڑے مضبوط دروازے بنائے گئے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت دشمن کو روکا جا سکے۔ اس قلعہ کو فتح کرنے کی بہت سے حکمرانوں نے کوششیں کیں۔ ۱۳۰۳ء میں دہلی کے بادشاہ علاؤالدین خلجی نے بڑی مشکل سے اس کو فتح کیا مگر دس سال کے بعد پھر راجپوتوں کا اس پر قبضہ ہوگیا۔ ۱۵۳۵ء میں گجرات کے سلطان نے چتوڑ گڑھ کا محاصرہ کیا اور جب تک ایک ایک راجپوت نہ کٹ گیا حملہ آوروں کا قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔ ۱۵۶۷ء میں اکبر اعظم نے بھی چتوڑ گڑھ کا گھیرا ڈالا۔ اس موقع پر دو راجپوت سرداروں جے مل اور پتّہ نے مغل فوجوں کا مرتے دم تک بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر میں فتح اکبر کو حاصل ہوئی۔ اکبر جے مل اور پتّہ کی بہادری سے ایسا خوش ہوا کہ اس نے قلعہ کے دروازے پر ان دونوں بہادروں کی مورتیاں بنوا کر لگوا دیں۔

چتوڑ گڑھ میں داخل ہونے کے لیے کئی دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن ان میں رام پول سب سے زیادہ خوب صورت اور مضبوط دروازہ ہے اس دروازہ میں بڑے بڑے تراشے ہوئے پتھر لگے ہیں اور اس پر اعلیٰ درجہ کا آرائشی کام ہے۔ یہ دروازہ کوئی ۲۶ فٹ اونچا اور ۱۳ فٹ چوڑا ہے۔ اس دروازے کے بالکل سامنے قلعہ کے چوکی داروں کے رہنے کے لیے ایک بہت خوب صورت ہال ہے جس کے ستونوں اور چھتریوں پر بہت خوبصورت کام ہے۔

قلعہ کی فصیل کے اندر بہت سے محلّات مندر اور مینار ہیں۔ محلات تو زمانہ کے ہاتھوں کھنڈروں میں تبدیل ہوگئے البتہ کیرتی ستمبھ اور وجے ستمبھ اچھی حالت میں باقی ہیں۔ کیرتی ستمبھ کو ایک جین تاجر نے شاید تیرھویں صدی عیسوی میں بنوایا تھا اور اس کو پہلے جینی تیرتھانکر آدی ناتھ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کیرتی ستمبھ ۷۵ فٹ اونچا، نیچے سے

۳۰ فٹ چوڑا اور اوپر پہنچتے پہنچتے ۱۵ فٹ رہ گیا ہے۔ اس ستمبھ کی پانچ منزلیں ہیں دوسری اور تیسری منزل کے چاروں طرف شہ نشین بنے ہوئے ہیں۔ پانچویں منزل کے اوپر ایک کھلا ہوا شہ نشین ہے۔ کیرتی ستمبھ پر نیچے سے اوپر تک جینی بزرگوں کی مورتیاں بنی ہیں۔

وجے ستمبھ کو رانا کمبھ نے مالوہ کے سلطان محمود خلجی پر فتح حاصل ہونے کی خوشی میں ۱۴۴۰ء میں بنوایا تھا۔ وجے ستمبھ ۴۷ فٹ مربع چوکے پر بنا ہوا ہے۔ یہ ۱۲۲ فٹ اونچا اور نیچے سے ۳۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس ستمبھ میں ۹ منزلیں ہیں اور ہر منزل پر ستونوں پر ٹھہرائے ہوئے شہ نشین بنے ہیں۔ نیچے سے اوپر چڑھنے کے لیے ستمبھ کے اندر سیڑھیاں ہیں۔ اوپر کی دو منزلوں کے شہ نشین کھلے ہیں۔ پورا وجے ستمبھ ہندو دیومالا کی مورتیوں سے مزین ہے۔ اور جگہ جگہ پر فن تعمیر کے نئے نئے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ ان سب کو اس سلیقہ اور خوب صورتی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وجے ستمبھ کی شان بڑھ گئی ہے۔

اس عظیم الشان مینار کے قریب ہی رانا کمبھ کی بنوائی ہوئی کچھ اور عمارتیں بھی ہیں۔ جیسے کرشن کے مندر، جھیل کما ساگر اور مہادیو کا مندر۔ ان میں سے کرشن مندر رانا کمبھ کی پتنی میرابائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کرشن کی بھگت تھیں اور انھوں نے بہت سے اچھے اچھے بھجن لکھے جو آج بھی پورے دیش میں گائے جاتے ہیں۔

چتوڑ گڑھ میں پانی حاصل کرنے کے لیے کئی تالاب اور چشمے ہیں ان میں سے ایک مشہور چشمہ گئو مکھ ہے جو کیرتی ستمبھ کے قریب جنوب مغرب میں ایک پہاڑی سے نکلتا ہے۔

چتوڑ گڑھ کے بنانے والے تو ختم ہوگئے مگر ان کی بہادری کے کارنامے آج بھی لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ اب بھی لوگ رانا کمبھ اور چتوڑ کا نام آتے ہی کہہ اٹھتے ہیں:

گڑھ میں گڑھ چتوڑ کا باقی سب گڑھیا

پروفیسر امانت (واڈیا کالج پونا)

آ گیا لوٹ کے بچپن میرا

میرے مکتب! تری عظمت کی قسم
یاد ہے آج بھی عہدِ طفلی
پڑھنے لکھنے ہی میں جو صرف ہوا
مجھ پہ جو شفقتِ اُستاد رہی
تیز میں اپنے رفیقوں سے رہا
دلِ معصوم کی ننھی سی کلی
میرے محسن! تیرے دامن میں کھلی
اب جو دیکھا تجھے پھر یاد آئی
عہدِ ماضی کی وہ دلکش سی فضا
پھر مرے دل کو یہ محسوس ہوا

آ گیا لوٹ کے بچپن میرا
گونج اٹھی کانوں میں گھنٹی کی صدا
پھر کتابیں لیے مکتب کو چلا
جیسے لڑکوں کی قطاروں میں کھڑا
پڑھ رہا ہوں وہی بچے کی دعا[1]
خواب تھا خواب وہ بچپن میرا
چھن گیا ہائے وہ گلشن میرا
زندگی شمع کی صورت ہی رہی
دل میں باقی مرے حسرت ہی رہی
میرے مکتب! تری عظمت کی قسم

[1] ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم جو ترانے کے طور پر مدرسوں میں گائی جاتی ہے۔

برقعے والی

اے، ایف۔ ملا بھیونڈی

میں اپنے کمرے میں بیٹھا، اسکول کا کام کر رہا تھا۔ اچانک میری چھوٹی بہن صفیہ نے آکر کہا، "بھیا بھیا، آپ نے کچھ سُنا۔ اپنے شہر میں ایک برقعے والی آئی ہے لوگوں کے ناک کان کاٹ لیتی ہے۔"

میں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور صفیہ کا مذاق اڑانے لگا۔ صفیہ نے منھ بنایا اور بھاگ گئی۔ میں پھر سوالات حل کرنے لگا لیکن نہ جانے کیوں میرے دماغ میں اس ناک کاٹنے والی، برقعہ پوش عورت کا خیال بار بار آنے لگا۔ ہاں یاد آیا، میرے دوست سلیم نے بھی کل اسی طرح کی ایک عورت کا ذکر کیا تھا، وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک امی جان کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے مجھے بلاکر کہا: "بیٹا مہمان آگئے ہیں کیلے اور دوسرے پھل ذرا جلدی سے لا دو۔"

میں نے پیسے لیے اور بازار کی طرف روانہ ہوگیا۔

واپس لوٹ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک برقع پوش عورت سامنے سے آرہی ہے، مجھے ہاتھ سے اشارہ کرکے رُکنے کے لیے کہہ رہی ہے۔ میرے ذہن میں صفیہ کی برقعے والی

آگئی۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹا اور سامنے والی گلی میں گھس پڑا۔ مجھے جاتا دیکھ کر برقعے والی بھی گلی میں آگئی اور مجھے آوازیں دینے لگی۔ اب تو مارے ڈر کے میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ عورت برابر میرا پیچھا کر رہی تھی۔ میں نے اپنی چال تیز کر دی۔ اس عورت نے بھی تیزی سے میرے پیچھے آنا شروع کیا۔ میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دو تین کیلے چھوٹ کر نیچے گر پڑے۔ پر میں رُکا نہیں، انھیں اٹھائے بغیر بھاگ پڑا۔ میں برابر گلیوں گلیوں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمّت نہیں تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے میں پسینے میں تر اور ہو گیا۔ درجن بھر کیلے راستہ بھر میں گر چکے تھے۔ دروازے میں داخل ہو کر میں چلایا۔ "امّی مجھے بچائیے۔" سب دوڑ کر آئے۔ مجھ سے حال پوچھا۔ آپا اور بھائی جان ہنسنے لگے جنھیں مجھے چڑانے تھی لیکن امّی جان نے

مجھے دلاسا دیا۔ ابھی میں ان سے چمٹا ہوا تھا کہ وہی برقعے والی دروازے میں نظر آئی۔ اس نے نقاب الٹ رکھی تھی اور اس کے ہاتھوں میں کیلے تھے۔ میں ڈر کر چلانے ہی والا تھا کہ امّی نے اس عورت کو مخاطب کر کے پوچھا "او ہو بُوا نفیسن! آؤ آؤ۔ بہت دنوں بعد آئی ہو؟"

"کیا بتاؤں بیوی۔ اپنے امجد میاں کو میں نے راستے میں سینکڑوں آوازیں دیں پر یہ تو جیسے بھوت دیکھ کر بھاگے ہوں۔ سارے کیلے بھی راستے میں گرا دئے۔ یہ دیکھئے۔"

یہ سن کر آپا اور بھائی جان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور جب نفیسن کو یہ کہانی سنائی گئی تو وہ بھی خوب ہنسی۔ میں بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کم بخت: ابھی تک جوتے نہیں لایا؟

جناب معین الدین ام، اے

ایک تھا کتا، بہت بوڑھا۔ دُبلا پتلا ڈھیلا ڈھالا، ہڈیوں کی مالا۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہ تھا۔ گھر میں جاتا تو مالکن ڈنڈا لے کر دوڑتیں۔ باہر آتا تو محلّے کے لڑکے پتھر مارتے۔ دوسرے محلّے میں جاتا تو کتّے غرّاتے۔ لال پیلی آنکھیں دکھاتے۔ بے چارے کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ بس دُم دبائے، سر نہوڑائے کسی کونے میں دبکا بیٹھا رہتا اور اپنے بیتے دنوں کی یاد کرتا رہتا۔ کبھی اپنا بھی زمانہ تھا۔ جسم میں کس بل تھا۔ گھر میں عزّت تھی۔ محلّے میں دھاک تھی۔ گھر میں جاتا تو مالکن پیار سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتیں۔ باہر نکلتا تو محلّے کے کتّے دُم دبائے پیچھے پیچھے گھومتے منہ چومتے اور خوشامدیں کرتے۔ رات برات مالکن کے گھر کی طرف کوئی نکلنے کی ہمت نہ کرتا۔ ذرا آہٹ ہوئی اور میں گرجا۔ دور دور تک سناٹا چھا جاتا۔ مگر جوانی تو سدا نہیں رہتی۔ جوں جوں دن گزرتے گئے میرا دم خم بھی کم ہوتا گیا۔ رعب داب بھی گھٹتا گیا، مالکن کی توجہ بھی کم ہوگئی، اب وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ پہلے تو کبھی کبھار کھانا گول کر دیا۔ کچھ دن کے بعد کھانا آدھے پیٹ کا رہ گیا، اور اب تو سرے سے غائب، دس دس صلواتیں اوپر سے اور اب تو نوبت لاتوں تک آ پہنچی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے بوڑھے کتے کا دل بھر آیا، اس نے سوچا ایسی رسوائی سے تو یہی اچھا ہے کہ گھربار چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ اور ایک دن شام کے وقت اس نے سچ مچ بستی چھوڑ دی، اور جنگل کی راہ لی۔

جنگل میں اس کو ایک بھیڑیا ملا۔ بھیڑیے کو دیکھ کر پہلے تو بوڑھا کتا سٹ پٹایا، بہت گھبرایا، لیکن پھر اس نے سوچا، ایسی زندگی سے تو مرجانا ہی اچھا ہے، اتنے میں بھیڑیا اور قریب آگیا۔ اور کتے سے پوچھنے لگا "کیوں بھئی کیا بات ہے؟ بہت دکھی لگتے ہو"

بوڑھا کتا تو تھا ہی غموں سے نڈھال، ہمدردی پاکر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اپنی پوری بپتا سنا ڈالی۔ بھیڑیے کو اس پر بہت رحم آیا، وہ کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر کہنے لگا "ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔ اگر تم کہنا مانو تو تمھارا دکھ دور ہو جائے اور تمھاری مالکن پھر تمھیں ماننے لگے"

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے لپک کر پوچھا "وہ کیسے؟"

بھیڑیے نے کہا، تم میرے ساتھ چلو۔ ہم دونوں مکان کے پیچھے چھپے کھڑے رہیں گے، جیسے ہی مالکن اپنے بچے کو صحن میں لٹاکر کام کاج کے لیے اندر جائے۔ میں دوڑ کر بچے کو اٹھا لوں گا اور جنگل کی راہ لوں گا۔ تم زور زور سے بھونکتے ہوئے میرے پیچھے دوڑنا۔ تھوڑی دور چل کر میں جنگل میں بچے کو چھوڑ دوں گا، تم اٹھا لینا اور مالکن کے پاس لے جانا۔ مالکن بہت خوش ہوگی وہ تمھیں پھر گھر میں رکھ لے گی، اور پھر پہلے جیسی آؤ بھگت کرنے لگے گی"

بوڑھے کتے کو یہ تجویز پسند آئی وہ بھیڑیے کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔ آگے آگے بھیڑیا، پیچھے پیچھے کتا۔ جنگل سے چلتے چلتے بستی میں آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں مالکن کے مکان کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی مالکن بچے کو صحن میں لٹا کر کسی کام سے گھر کے اندر گئی۔ بھیڑیا جھپٹا۔ اس نے دانتوں سے اس کپڑے کو اٹھایا جس میں بچہ لپٹا ہوا تھا۔ بچے کو اٹھا کر وہ جنگل کی سمت بھاگا۔ پیچھے پیچھے بوڑھا کتا بھی زور زور سے بھونکتا ہوا دوڑا، مالکن نے جیسے ہی کتے کے بھونکنے کی آواز سنی صحن کی طرف دوڑی۔ پلنگ خالی دیکھ کر اس کے ہوش گم ہو گئے۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ ابھی مالکن چیخ پکار میں مصروف تھی کہ اتنے میں بوڑھا کتا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے جبڑوں میں بہت احتیاط سے وہ کپڑا دبا ہوا تھا جس میں بچہ لپٹا ہوا تھا مالکن بے اختیار ہو کر دوڑی۔ کتے نے بچے کو پلنگ پر رکھ دیا۔ مالکن نے لپک کر اٹھا لیا۔ بچہ سسکیاں لینے لگا۔ ماں نے بچے کو خوب چوما چاٹا، بچے کو گود میں چپٹا کر مالکن نے بوڑھے کتے کی طرف نظر اٹھائی۔ بے چارہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھوک کی شدت سے اس کا پیٹ اندر کو دھنس گیا تھا۔ پیاس سے زبان باہر نکلی ہوئی تھی، مالکن کو بہت رحم آیا۔ اس نے چمکارا، بلا کر پاس بٹھایا، اور پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ پھر بوڑھے کتے کے دن پھر گئے اور وہ پہلے کی طرح مالکن کے پاس رہنے سہنے لگا۔

جناب جوش ادیب (ملیگ)

غنچۂ آرزو

اے مرے لال اے میرے نورِ نظر
اے مرے چاند اے مرے لختِ جگر

لوریاں دے کے تجھ کو سلاتی ہوں میں
گیت گا گا کے تجھ کو مناتی ہوں میں

دل تیرا توڑ دوں یہ گوارا نہیں
تجھ سے بڑھ کر کوئی مجھ کو پیارا نہیں

شکر کرتی ہوں ہر وقت اللہ کا
تجھ سا لختِ جگر جس نے مجھ کو دیا

تو جو روتا ہے دل ٹوٹتا ہے مرا
میرے دل کا ہے مرہم تبسم ترا

اے مرے لال اے میرے نورِ نظر
مسکراتی ہوں میں تیری ہر بات پر

گو سمجھ میں تیری بات آتی نہیں
پھر بھی ننھا سا دل میں دکھاتی نہیں

کیا کہوں میری آنکھوں کا تارا ہے تو
گھر کی رونق ہے دل کا سہارا ہے تو

تو جو آئے گا ننھے ذرا ہوش میں
علم سیکھے گا تو میری آغوش میں

ایک دن وہ بھی آئے گا میرے پسر
تجھ پہ حیرت سے ڈالے گی دنیا نظر

کام اپنوں کے، غیروں کے، آئے گا تو
تیرگی اس جہاں سے مٹائے گا تو

نام اپنے بڑوں کا چلائے گا تو
ساری دنیا پہ سکّہ جمائے گا تو

آرزو میری جس وقت بر آئے گی
میرے دل کی کلی جیسے کھل جائے گی

میں یہ سمجھوں گی مجھ کو ملا ہے صِلا
دودھ کا میرے تو نے کیا حق ادا کیا

ابتدائی ششم جامعہ کے طالب علموں نے کوہ پیمائی یا پہاڑوں پر چڑھائی کے سلسلے میں دو پروجکٹ چلائے۔

(۱) ہمالیہ کی مہمیں اور (۲) ہمالیہ کی ہندوستانی مہمیں ایورسٹ کے ٹو (K 2) ننگا پربت، نندا دیوی، کن چن جنگا وغیرہ ہمالیہ کی مشہور چوٹیاں ہیں۔ انگلستان جرمنی، فرانس، سوئزرلینڈ یا سوئستان اور امریکہ کے کوہ پیما مدتوں سے ان پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی مسلسل کوششوں کی بدولت قریب قریب سبھی چوٹیاں سر ہو چکی ہیں۔

ہمارے طالب علموں نے ان کوہ پیماؤں کی مسلسل اور لگاتار کوششوں کا حال بہت غور اور توجہ سے پڑھا اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں میں جمع کیا۔ یہ پروجکٹ بہت کامیاب رہا۔ بہت پسند کیا گیا۔ ہمارے دیس کی حکومت نے اسے جاپان اٹلی اور ہالینڈ کی تعلیمی نمائشوں میں بھیجا اور کوئی ڈیڑھ سال بعد یہ واپس آیا۔

طلبا نے پھر دوسرا پروجکٹ "ہمالیہ کی ہندوستانی مہمیں" چلایا۔ اب کے بھی طلبا نے ہندوستانی کوہ پیماؤں کے حالات اور ان کی کوششوں سے واقفیت حاصل کی۔ اور ہمالیہ کی جن جن چوٹیوں کو انھوں نے فتح کیا ان کے بارے میں

پڑھا اور پھر کتابچے لکھے۔

پہلے پروجکٹ پر کام کرتے وقت بھی وہ دارجلنگ گئے اور اس مرتبہ بھی انھیں وہاں جانے کا موقع ملا۔ پہلے سفر کا حال آپ اکتوبر کے پرچے میں پڑھ چکے ہیں۔ دوسرے سفر کا حال اس پرچے میں پڑھیے، اور سفر کے تاثرات انھی کی زبانی سنیے۔ (سید احمد علی آزاد)

ٹائگر ہل

دارجلنگ طلوع آفتاب کے لیے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے پہاڑ اتر سے دکن کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ سورج پورب سے جب نکلتا ہے تو اس کی شعاعیں ان برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑتی ہیں۔ بڑی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اس چمک اور روشنی میں طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔ یہ نظارہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا جھاڑ یا فانوس کے پہل دار شیشوں پر موم بتی کی روشنی پڑنے سے منعکس ہوتا ہے۔

سورج نکلنے سے پہلے برف پوش پہاڑوں کے پیچھے مختلف رنگوں کے مناظر قابلِ دید ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ افق پر قدرت نے مختلف رنگ بڑی ترتیب سے بکھیر دیے ہیں یا افق پر شفق پھولنے کا منظر دیکھنے والوں کو محو کیے ہوئے ہے۔ سورج آہستہ آہستہ برف پوش پہاڑوں کی لائن پر نمودار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی لعل افقِ مشرق پر نمودار ہو کر آس پاس کے پہاڑوں کو رنگین اور منور بنا رہا ہے یا قیمتی لعل فضا میں معلق ہو گیا ہے۔

لیکن یہ منظر دیکھنا ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ لوگ روپے خرچ کر کے وہاں جاتے ہیں (یہ جگہ دارجلنگ سے سات میل پر ہے) اور مایوس ہو کر

چلے آتے ہیں۔ یہ نظارہ اس وقت ہوتا ہے جب آسمان صاف ہو اور دور تک بادل نہ ہوں۔ بادل موجود ہونے سے سورج نظر نہیں آتا اور نظارہ، جو چند منٹ کا ہوتا ہے، نظر نہیں آتا۔ (عثمان حسن خاں)

عمر ۱۲ سال

گھوڑے کی سواری

یہ بات ہم لوگوں کو معلوم تھی کہ دارجلنگ میں کرایہ پر گھوڑے ملتے ہیں۔ جن پر بیٹھ کر آس پاس کی سیر کی جاتی ہے۔ یہ گھوڑے دارجلنگ کے بازار "چورستہ" میں ملتے ہیں۔ دو روپے فی گھنٹہ کرایہ ہوتا ہے۔ ہم میں سے کئی لڑکوں نے کرایہ پر گھوڑے لیے۔ جس گھوڑے پر میں تھا وہ تھوڑی دیر تک تو قاعدے میں چلا۔ پھر اس نے کمالات دکھلانا شروع کر دیے۔ چلتے چلتے رک جاتا۔ چابک لگاتے یا لگام کھینچتے تو دولتیاں جھاڑتا ایک بار تو اس نے ایسی دولتی جھاڑی کہ میں گرتے گرتے بچا۔ آخر کار وہ ٹھیک ہو گیا۔ اور سرپٹ چلنے لگا۔

صدرالدین کے گھوڑے کی نعل نکل گئی اس لیے انھوں نے گھوڑا چھوڑ دیا۔ اور میرے گھوڑے کے پیچھے بھاگنے لگے کہ شاید میں بٹھا لوں۔ مجھے ترس آ گیا۔ لیکن کیا کرتا، وہاں کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

جناب راحت ولی صاحب کے ساتھ عجیب تجربہ ہوا۔ انھوں نے اپنے گھوڑے کو بہت تیز دوڑایا اور وہ خوب تیزی سے جا رہا تھا کہ انھوں نے سنٹی لگائی یہ بات غالباً اس کو ناگوار معلوم ہوئی اور اس نے بھاگتے بھاگتے ایسی دولتی جھاڑی کہ راحت صاحب پہاڑی ڈھلان پر گر کر لڑھکتے چلے گئے۔ بہت چوٹ آئی۔ توبہ کی کہ گھوڑے پر سواری نہیں کریں گے۔

(عبدالمجید)

عمر ۱۴ سال

تین سنگھ کا مکان

آج ہم تونگ سونگ بستی دیکھنے گئے چورستہ سے ایک سڑک اس بستی کو جاتی ہے۔ یہاں شیرپا قلی رہتے ہیں جو کوہ پیمائی کی تاریخ میں اہم رول ادا کرتے رہے ہیں۔ یہیں تین سنگھ کا پرانا مکان بھی ہے۔ یہ مکان ٹین کی چادروں سے بنا ہوا ہے جو جگہ جگہ سے گل گئی ہیں۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں چار چار پائیاں برابر بچھ سکتی ہیں۔ چھت بھی ٹین کی چادر کی ہے۔ اس میں تین سنگھ رہتا تھا اور دودھ بیچتا تھا۔ اس کی بیوی آیاگیری کرتی تھی۔

دوسرے دن ہم لوگوں نے تین سنگھ کا وہ مکان دیکھا جس میں وہ اب رہتے ہیں۔ یہ مکان نہیں کوٹھی ہے اور ایک پہاڑی پر بنی ہوئی ہے جس میں کئی کمرے اور کئی منزلیں ہیں۔ آس پاس خوشنما کیاریاں بنی ہوئی ہیں۔ بیس پچیس کتے پلے ہوئے ہیں۔ جب ہم لوگ کوٹھی کے قریب پہنچے تو ان کتوں نے ہمارا پُرجوش سواگت کیا۔ تین سنگھ آج کل فیلڈ ورک پر گئے ہوئے تھے اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہاں ایک دیوار پر ایورسٹ کا ماڈل بنا ہوا ہے۔ جس میں ایورسٹ کی چوٹی پر جانے کا راستہ بنایا گیا ہے۔ راستے میں ۹ خیمے لگے ہوئے ہیں اور چوٹی پر برطانیہ، نیپال اقوام متحدہ اور ہندوستان کا جھنڈا لگا ہوا ہے۔ ماڈل کے نیچے ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء لکھا ہوا ہے۔ اس تاریخ کو تین سنگھ نے ایورسٹ کی چوٹی پر پیر رکھا تھا اور وہ اس سے بھی بلند ہو گیا تھا۔

(سید سرفراز احمد)
عمر ۱۲ سال

وکٹوریا فال

انجمن اسلامیہ اسکول کے جو استاد صاحب ہیں بوٹانیکل گارڈن دکھلانے لے گئے

تھے انھوں نے ہم کو تبلایا کہ یہاں ایک آبشار ہے جس کا نام وکٹوریا آبشار ہے ہمیں بہت خوشی ہوئی اور ہم طرح طرح کے منصوبے اپنے دل میں بنانے لگے اور ہمارے فیض سلمان صاحب تو نہانے کے لیے بھی تیار ہو گئے حالانکہ وہاں اس مئی میں بھی کافی سردی پڑ رہی تھی۔ کسی میں نہانے کی ہمت نہ تھی لیکن فیض سلمان، ظفر اقبال اور راحت ولی تولیے اور جانگیے سے لیس ہو کر جا رہے تھے۔

ماسٹر صاحب اور ہم چلے جا رہے تھے کہ ہماری نظر ایک نالے پر پڑی انجمن کے استاد صاحب بولے" وہ رہا آبشار"۔ اس آبشار کو دیکھ کر ہمارے وہ منصوبے جو ہم نے اپنے دماغوں میں بنا رکھے تھے ہوا ہو گئے۔ وہ آبشار نہیں بلکہ کوئی گندہ نالہ اوپر سے بہتا ہوا آرہا تھا۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" لیکن ہم زندہ دلانِ جامعہ ملیہ اتنی جلدی ہار ماننے والے نہ تھے۔ یکایک فیض سلمان کی نظر ایک پہاڑی پر پڑی اور انھوں نے ماسٹر صاحب سے چڑھائی کی اجازت مانگی۔ اس کی سب لڑکوں نے تائید کی۔ اجازت ملتے ہی لڑکے پہاڑ کی بلندی کی طرف روانہ ہو گئے چڑھائی کافی مشکل اور خطرناک تھی خاص کر وہ چڑھائی جو راحت ولی چڑھ رہے تھے اس لیے کہ وہ بہت مشکل راستہ سے گئے تھے۔ ایک ہزار فیٹ چڑھائی منٹوں میں طے ہو گئی۔ ہموار جگہ پہنچ کر سب کے سب ایک دو انچ کے معلوم ہو رہے تھے۔ واپسی بھی بڑی شاندار تھی۔ پہاڑ کی ڈھلان پر ایک پارٹی کی پارٹی لڑھک گئی۔ اس کے لیڈر شبیر احمد تھے۔ کچھ دور تک لڑھکتے اور پھسلتے رہے پھر ایک درخت نے ان کو سہارا دے دیا۔ ادھر ہم لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر ان کو داد دی۔ آبشار کی مایوسی زندہ دلی میں تبدیل ہو چکی تھی راستہ بھر اس چڑھائی

اور لڑھکنے کا چرچا رہا۔

(کشور سلیم)
عمر ۱۲ سال

ماؤنٹیرنگ انسٹیچوٹ

ہم لوگ ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء کو دس بجے رات کو دارجلنگ پہنچے۔ کھانا کھایا اور سو گئے، صبح اٹھے نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور گھومنے کے لیے تیار ہو گئے ماسٹر صاحب نے ہم سب کو اجازت دے دی کہ جہاں دل چاہے جائیں۔ کن چن جنگا کی برف پوش چوٹی دیکھیں، انسٹیچوٹ کا پتہ لگائیں یا بازار گھومیں۔ لڑکوں نے الگ الگ پارٹی بنائی اور گھومنے نکل گئے۔ ہماری پارٹی میں چھ لڑکے تھے یعنی کشور، قیصر (ماسٹر صاحب کی لڑکی)، شبیر احمد، آفتاب احمد اور وسیم احمد ہم نے ان کو بھی شامل کر لیا۔ اب ہم شاہت ہو گئے۔ چونکہ ہم کسی جگہ سے واقف نہ تھے اس لیے ہم پوچھتے ہوئے آگے بڑھے۔ سب سے پہلے ہمیں ایک صاحب ملے۔ ان سے پوچھا تو بولے آگے چلے جاؤ۔ آگے بہت سارے راستے ملنے لگے۔ اس میں جو سب سے بلند تھا اس پر چلے۔ ہم نے دو عورتوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ہم غلط راستہ پر جا رہے ہیں۔ وہ کچھ دور ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئیں اور کہا آگے چلے جاؤ۔ اب تک ہمارا واسطہ اردو جاننے والوں سے پڑا تھا لیکن اس کے بعد ایک نیپالی زبان بولنے والے سے واسطہ پڑا۔ ہم نے اس سے پوچھا تو اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دراصل وہ لوگ انسٹیچوٹ کو 'برچھل' کہتے ہیں یا تین سنگھ کا اسکول ایک آدمی نے ہمیں بتلایا کہ آگے اوپر جانے کے لیے ایک بورڈ لگا ہوگا، اور اس پر "ماؤنٹیرنگ انسٹیچوٹ" لکھا ہوگا آگے بڑھے راستہ میں ایک بورڈ لگا ہوا ملا۔ بلا تحقیق جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگے۔ نیچے سے ایک عورت نے کہا: "کیدھر جانا ہے؟" ہم لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی اور ہم پھر نیچے واپس

آگئے۔

آگے بڑھے تو ایک اور بورڈ ملا۔
اس پر رسی بنی ہوئی تھی۔ ہم اُس راستہ
سے چڑھنے لگے۔ آگے ایک آدمی ملا۔ اُس
سے پوچھا۔ 'برچھیل' کتنی دور ہے۔ اُس نے
کہا 'یا وُمھل' اور پھر زمین پر راستہ بنا کر
دکھلایا۔ اس کے نقشے نے ہم کو بہت
مدد دی۔ آگے بڑھے تو ہمالین ماؤنٹرنگ
انسٹیچوٹ کا بورڈ ملا۔ ہماری خوشی کی
انتہا نہ رہی۔ سامنے ایک چڑیا گھر
تھا اسے دیکھا بھالا اور آگے بڑھے
چلتے چلتے انسٹیچوٹ نظر آیا اور ہم
سب خوشی کے مارے چیخ اُٹھے، پالیا
ہم اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوئے
میوزیم اور اسکول ابھی بند تھا اس
لیے ہم ماسٹر صاحب کو اطلاع دینے
انجمن واپس آگئے اور دوبارہ ان
کے ساتھ دیکھنے گئے۔ (سلطان الرشید)
عمر ۱۲ سال

دارجلنگ سے واپسی

دارجلنگ کے سارے پروگرام
ہوگئے لیکن تین سنگھ سے ملاقات نہ ہوئی۔
وہ چڑھائی کی عملی تعلیم دینے کسی چوٹی
پر گئے ہوئے تھے۔ ۲۴؍ مئی کو واپسی
تھی لیکن نہ آسکے۔ ہم زیادہ رُک
نہیں سکتے تھے اس لیے کہ ۲۶؍ مئی کو ہم
کلکتہ میں عید کرنا چاہتے تھے۔ جس کے
لیے ۲۴؍ مئی کو دارجلنگ سے روانہ
ہونا ضروری تھا۔ گاڑی دو بجے دن
کو چھوٹتی تھی، دن کا کھانا کھاکر ہم
پیدل روانہ ہوگئے۔ چھوٹا موٹا سامان
لڑکوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا،
اور باقی سامان ٹھیلے پر آگیا۔ ریل کے
ایک ڈبے میں ہم سب بیٹھ گئے۔ تمام
بستر اور بکس سامان والے ڈبے میں
رکھ دیے گئے۔ ڈبے میں بیٹھے بیٹھے تین
بج گئے۔ فکر ہوئی کہ گاڑی کیوں نہیں
چھوٹتی۔ معلوم ہوا کہ راستہ میں ایک
پہاڑ گر گیا ہے جب وہ پٹری سے ہٹ
جائے گا تو ریل روانہ ہوگی۔

ماسٹر صاحب چائے پینے چلے گئے۔
لڑکوں نے تماشا شروع کردیا۔ ٹرین کی

کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں عثمان صاحب بولے کہ جس سلاخ میں سے میرا سر نکل جائے گا، اس میں سے خود بھی نکل جاؤں گا۔ وہ تو آسانی سے نکل گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی راحت ولی کو بھی جوش آگیا اور وہ نکلنے لگے۔ راحت ولی کا سر تو نکل گیا لیکن دھڑ پھنس گیا۔ موٹے جو تھے۔ بڑی بےبسی کا عالم تھا۔ ادھر ریل نے سیٹی دی۔ عثمان حسن خاں جو باہر سے انھیں اندر کر رہے تھے، ریل کی سیٹی سن کر ڈبہ میں آگئے۔ کہاں تو سب ہنس رہے تھے، لیکن ان کو اس حال میں دیکھ کر سب ہی فکرمند ہو گئے۔ عثمان نے اندر آکر مجید کی مدد سے انھیں کھینچا۔ تب وہ سلاخوں میں سے نکلے۔ سب کا پھر ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا۔

چار بج چکے تھے۔ ریل نے دوسری سیٹی دی اور چل دی۔ مناظر بہت خوب صورت تھے۔ جگہ جگہ آبشار مل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں گھوم کا اسٹیشن آگیا۔ یہ ۷۴۰۲ فٹ بلند ہے اور دنیا کا بلند ترین اسٹیشن ہے۔ گھوم سے ریل ڈھلان کی طرف لڑھکتی چلی جا رہی تھی۔ ہمارے سامنے اب یہ پریشانی تھی کہ ہماری گاڑی تین گھنٹے لیٹ تھی اور کلکتہ جانے والی گاڑی کے چھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن جب ہم سلیگوری پہنچے تو معلوم ہوا کہ جو گاڑی کلکتہ جانے والی ہے وہ ابھی آسام سے نہیں آئی ہے اور وہ بھی تین گھنٹے لیٹ ہے۔ یہ سن کر جان میں جان آئی۔　　　(رضوانہ خاتون)

پیام تعلیم کا پہلا شمارہ اکثر اصحاب پہلے پرچے سے خریداری کے خواہش مند ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ پہلا (اگست کا) شمارہ بالکل ختم ہوگیا ہے۔ اس لیے کوئی صاحب اس کے لیے اصرار کرکے ہمیں شرمندہ نہ کریں۔　　　(منیجر)

آیئے میلا ہمارا دیکھیے　　اک نئی دُنیا بسانا دیکھیے　　رعنا امین عمر ۱۱ سال

لڑکیاں ہنستی اُچھلتی آئیں گی　　آیئے اُن کا تماشا دیکھیے　　" " " "

چھوٹے بچے جھولتے ہیں بار بار　　اُن کا ہنسنا اور ہنسانا دیکھیے　　" " " "

آپ بچوں کی دکاں میں جایئے　　اُن کی محنت اور سلیقا دیکھیے　　" " " "

دیکھیے خرگوش خانہ دیکھیے　　اور چڑیا گھر ہمارا دیکھیے　　ناظم الدین عمر ۱۲ سال

گھومیے، کام اب ہمارا دیکھیے　　رات ہو جائے ڈراما دیکھیے　　سہیل احمد " ۱۳ "

بچہ بچہ اب نظر آتا ہے خوش　　اُن کی پھرتی اور اشارا دیکھیے　　" " "

چپہ چپہ دیکھیے روشن ہوا　　روشنی میں سب ڈراما دیکھیے　　" " "

آج دُلہن بن گئی ہے جامعہ　　اس کی رونق کا تماشا دیکھیے　　محمد عتیق عمر ۱۱ سال

کار پر اپنی ذرا آجایئے　　شام تک میلا ہمارا دیکھیے　　اختر جمیل " ۱۲ "

جا کے کمرے میں نمائش دیکھیے　　سال بھر کا کام ہمارا دیکھیے　　عشرت میاں ۱۰ "

دن کو دکانوں سے سودا لیجیے　　رات ہو جائے ڈراما دیکھیے　　" " "

میوزیم کی سیر کرنے جایئے　　وقت دیجے کام سارا دیکھیے　　محمد یحییٰ " ۱۱ "

آیئے بچوں کے ٹی اسٹال میں　　اُن کی سروس اور سلیقا دیکھیے　　" " "

صدر، بچوں کی حکومت آ گئے
اُن کی مسند کا ڈراما دیکھیے　　جہانگیر علی " ۱۲ "

محمد حسین حسان

انوکھا چناؤ

(۴)

پر کیا وہ چھڑ کے اوپر سے صفائی سے
نکل گیا؟ جی نہیں۔ نیچے آتے وقت
اس کے ہاتھ کی انگلی چھڑ سے چھو گئی۔
چھڑ تھرتھرائی اور نیچے گر پڑی۔

بوڑھے جج نے اعلان کیا:-

"بڑسنگا جیت گیا"

جیتنے ہوئے امیدوار کے ساتھی
خوشی سے چیخ اٹھے۔

اب چوتھے مقابلہ کا نمبر تھا۔ چوتھا
جج میدان کے بیچوں بیچ آکر کھڑا ہو گیا
ایک نوجوان بہادر نے ڈھول پیٹ پیٹ
کر لوگوں کی توجہ اس طرف کی جج نے
میدان میں پہنچ کر یوں بات شروع کی:-
"سات مقابلوں میں سے چوتھا مقابلہ
برچھا پھینکنے کا ہے۔ یہ برچھا جیسے لڑائی
کے زمانے میں کام آتا ہے۔ اسی طرح
امن کے زمانے میں یہ کام کی چیز ہے۔
جب کوئی خطرناک شکار تیر کمان سے
قابو میں نہیں آتا تو ہمارے شکاری
اس برچھے سے اس کا کام تمام کرتے
ہیں۔ جب جنگلوں میں شکار نہیں ملتا
اور کھانے پینے کی چیزیں ختم ہونے
لگتی ہیں تو ہمارے مچھیرے اسی کا
سہارا لیتے ہیں اور اسی کی بدولت
مچھلیاں ہمارے وگوام میں آتی ہیں۔

لڑائی میں برچھا ہمارے بہادر
لڑاکوؤں کے ہاتھ میں ایک خوفناک
ہتھیار ہے۔ ہمارا سردار لڑائی کے وقت

یا امن کے زمانے میں اس برچھے سے ٹھیک ٹھیک کام لے گا۔"

میدان میں بیچ کی جگہ صاف کر دی گئی۔ نشانے اپنی اپنی جگہ لگا دیے گیے۔ پہلا نشانہ ایک لٹھا یا لکڑی کا تنہ تھا۔ یہ میدان کے سرے پر کھڑا کیا گیا۔ اس کی اونچائی آدمی کے قد کی برابر تھی۔ لٹھے میں ایک جگہ لال لال سا نشان تھا۔ یہ جیسے اس کا دل تھا۔

دوسرا لٹھا اس سے چھوٹا تھا۔ اس کے چاروں بازو یا پنکھ بھی تھے۔ یہ زمین سے تین فٹ اونچا تھا۔ یہ جیسے ہرن تھا۔ اگلے پیروں سے ذرا پیچھے ایسی جگہ سرخ نشان لگا دیا گیا تھا جسے سبھی شکاری نشانے بناتے ہیں۔ ہرن کا دل اس کے اگلے بائیں پیر کے پاس ہی تو ہوتا ہے۔

اس مقابلے کے لیے بہادروں نے ٹھیک ٹھیک ناپ کا درخت ڈھونڈھ نکالا تھا۔ اس میں پنکھ یا بازو بھی ٹھیک جگہ لگے تھے۔ یہ بازو ہرن کے پیروں کے ناپ کے کاٹے گئے تھے۔ پیڑ بھی ٹھیک ٹھیک ناپ کے مطابق کاٹا گیا تھا۔ یہ بہت اچھا نشانہ تھا۔

تیسرا نشانہ بہت چھوٹا سا تھا۔ یہ دو ہاتھ سے کچھ ہی لمبا تھا۔ ایک پودے کا تنہ کاٹ کر اسے بیچ سے چیر دیا گیا تھا۔ یہ ایک مچھلی کے برابر تھا۔ آنکھوں کی جگہ ایک چھوٹا سا سرخ نشان تھا۔ ایک لمبا سا نشان سر کے لیے تھا۔ یہ بھی سرخ ہی تھا۔

غرض ججوں نے بھالے یا برچھے کے لیے بہت اچھے نشان تلاش کیے تھے ایک لڑائی کا، ایک جنگل کے جانوروں کے شکار کا اور ایک مچھلی کے شکار کا دونوں بہادر تینوں نشانوں پر ایک ایک بار برچھا پھینکیں گے۔

اس جج نے آواز دی:-

"ہرن قدم!"

بھی کود میں اسی بہادر لڑاکو کو بلایا گیا تھا۔ اس وقت مقابلے میں پہلے آنا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی اس سے مقابلے میں آنے والے دوسرے بہادر کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے کے لگائے ہوئے نشانے کو دیکھ کر نشانہ لگا دیا۔ ہرن قدم کے ساتھیوں کو امید تھی کہ اس مقابلے میں پہلے بڑ شنگے کو بلایا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا ہرن قدم اپنا نام سنتے ہی مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہرن قدم پہلے ججوں کے پاس آیا انھوں نے اس کا لڑائی کا برچھا اچھی طرح دیکھا بھالا۔ برچھے کا دستہ اخروٹ کی پکی لکڑی کا تھا۔ اس کا سرا خوب نوک دار پتھر کا تھا۔ یہ پتھر ہرن کی تانت سے دستے کے ساتھ خوب مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔

ججوں نے سر ہلایا:۔

"ہاں، ہاں یہ لڑائی کا بہت اچھا ہتھیار ہے۔"

پہلے نشانے کے چاروں طرف لکیر کھینچ دی گئی تھی اسی لکڑی کے تنے کے چاروں طرف کھینچی گئی تھی، جو آدمی کے قد برابر تھا۔

یہ کنڈل یا چکر گاؤں کے چوک جتنا بڑا تھا۔ نشانہ بیچ میں رکھا گیا تھا، جہاں گاؤں کے چوک میں الاؤ جلتا ہے، لال ہندیوں میں برچھے کی لڑائی اسی طرح ہوتی تھی۔

ہر قدم لکیر کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پنجے لکیر سے کافی پیچھے تھے۔ بھیڑ پیچھے کی طرف ہٹ گئی تھی کہ ہرن قدم کو بہت سی جگہ مل جائے۔

ہرن قدم نے سرخ نشان پر اپنی نگاہیں جمالیں، لڑائی کے اس بھاری برچھے کو اپنے ہاتھ میں تولا۔ اسے اپنے سرے سے اوپر لے گیا۔ کندھے کے پیچھے کی طرف جھکائے

بھیڑ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سے کانا پھوسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ چپکے چپکے برچھا پھینکنے والے کی آن بان کو سراہ رہے تھے۔ یہ لوگ ہرن قدم کے پیچھے کھڑے تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں کو اس بھیڑ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی، پھر بھی وہ خیموں سے نکل نکل کر آ گئی تھیں۔ پیڑوں کی اوٹ میں شرمائی لجائی کھڑی تھیں۔ اور اپنے بہادروں کی طاقت اور ہنر کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

لے لیجیے ہرن قدم نے اپنا برچھا پھینک دیا۔ یہ بالکل سیدھا گیا اور ٹھیک نشانے پر پڑا۔ پتھر کی تیز نوک سرخ نشان کے بیچوں بیچ گھستی چلی گئی۔

یہ برچھا وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

اب بڑ سنگا آیا۔ بڑ سنگے نے بہت دیکھ بھال کے نشانہ لیا۔ اس کے برچھے کی نوک ٹھیک اسی سوراخ میں جا گھسی جو ہرن قدم کے برچھے سے بن گیا تھا۔

اس کے ساتھیوں نے بہت زور کا نعرہ لگایا:۔

"وہ مارا!"

جج نے ہرن قدم کو دوسرے مقابلے کے لیے آواز دی اس مرتبہ وہی ہرن والا چھوٹا لٹھا تھا جس میں چار پیر لگے تھے۔

ہرن قدم اب اپنا شکار والا برچھا لایا۔ یہ لڑائی کے برچھے سے ہلکا تھا۔ مگر ہرن کو مار گرانے کے لیے کافی بھاری تھا۔

ہرن قدم نے اسی شان سے اپنا برچھا پھینکا۔

بھئی واہ، کیسا ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔ اس کی نوک لال نشان کے بالکل بیچوں بیچ گھس گئی۔

اس کے ساتھی اور دوست خوشی سے اچھل پڑے اور ایک آواز ہو کر بولے:۔

"بھلا برچھے سے ایسا اچھا نشانہ کون لگا سکتا ہے؟"

اب بڑ سنگا اپنا شکاری برچھا لیے بچوں کے پاس پہنچا۔

بچوں نے اسے دیکھا بھالا اور پاس کر دیا۔

بڑ سنگا، چکّر کے کنارے پہنچا۔ برچھے کو سنبھالا احتیاط سے نشانہ لیا اور بہت اچھے انداز سے پھینکا

اے لیجیے، پھر اس کا برچھا ٹھیک نشانے پر پڑا۔ ہرن قدم کے برچھے نے جو سوراخ بنایا تھا۔ اسی میں جا گھسا۔

اب تو دونوں کے ساتھیوں نے ایک زبان ہوکر کہا:۔

"پورے دیس میں ان دونوں جیسا سچّا نشانہ باز نہیں ہے۔"

بنسی بھارتی صاحب

اِسکول چلو، اِسکول چلو

اِسکول میں عزت بٹتی ہے اِسکول میں شہرت بٹتی ہے
اِسکول میں طاقت بٹتی ہے تعلیم کی دولت بٹتی ہے
اِسکول چلو، اِسکول چلو
اِسکول چلو

ذہنوں کو اگر چمکانا ہے کندن کی طرح دمکانا ہے
گل بن کے اگر مسکانا ہے دنیا کو اگر مہکانا ہے
اِسکول چلو، اِسکول چلو
اِسکول چلو

اِسکول ہی ایک ایسی دُنیا پھولوں کا وہاں کے کیا کہنا
اس صحن چمن کا ہر کانٹا ہے کومل سُندر البیلا
اِسکول چلو، اِسکول چلو
اِسکول چلو

آزاد و جواہر گاندھی جی بچے تھے وہ ہم جیسے ہی کبھی
تعلیم نے ہر نعمت بخشی لینا ہی بہت کچھ ہم کو بھی
اِسکول چلو، اِسکول چلو
اِسکول چلو

ہمارا تعلیمی میلا

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی جامعہ میں تعلیمی میلا بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ ہفتوں پہلے جامعہ کی بستی میں چہل پہل شروع ہوگئی، لوگ میلے کی تیاری میں لگ گئے، اور دو تین دن پہلے تو جامعہ والوں نے رات دن ایک کردیا تھا۔ میلے کی جگہ ایک نئے انداز سے سجائی گئی تھی۔ میلا بازار کے چوک کا دروازہ اب کے بہت ہی خوب صورت تھا۔ گیٹ سے لے کر چوک تک روشنی کا انتظام بھی بہت اچھا تھا۔ رات کو بجلی کی رنگ برنگی روشنی کچھ عجیب سماں پیدا کرتی تھی۔

۲۹ر نومبر کو صبح کے وقت ہمارے شیخ الجامعہ یا وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جامعہ کا جھنڈا لہرایا، پھر ایک جلسہ ہوا۔ اس میں نرسری سے لے کر کالج تک سب شعبوں نے اپنی رپورٹیں پڑھیں، آخر میں شیخ الجامعہ کی تقریر ہوئی۔

تیسرے پہر کو ساڑھے تین بجے کانووکیشن کا یعنی سند تقسیم کرنے کا جلسہ ہوا۔ امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے سندیں تقسیم کیں اور خطبۂ صدارت پڑھا۔

۳۰ر اکتوبر کو صبح کے وقت دہلی کارپوریشن کے میئر باوا بچھتر سنگھ نے میلے کا افتتاح کیا۔ ساڑھے تین بجے بڑے پنڈال میں ٹریننگ کالج کی طرف سے "قومی نظام تعلیم" پر سمپوزیم تھا۔ دوسری طرف دوسرے پنڈال میں خواتین کا

مشاعرہ تھا۔ رات کو مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کے تین ڈرامے تھے۔ تینوں ڈرامے بہت دلچسپ تھے۔ بس دیکھنے کی چیز تھے۔

۳۱ اکتوبر کو ۹½ بجے جیت بازی کا مقابلہ تھا، ۱۱ بجے بچوں کے گیت تھے۔ تیسرے پہر کو محفل موسیقی تھی۔ رات کو آرٹ انسٹی ٹیوٹ اور جامعہ کالج کی طرف سے دو ڈرامے تھے۔

پہلی نومبر کو ۹½ بجے گاندھی ٹرانی کے مقابلے تھے۔

اس مقابلے میں بچوں اور بڑوں نے اتنی دلچسپی لی کہ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ تیسرے پہر کو مکتبہ جامعہ کی طرف سے کاروان غزل کے عنوان سے ایک تقریب ہوئی اردو کے عہد بعہد کے مشہور شاعروں کی غزلیں سنائی گئیں بیچ بیچ میں ہر عہد کی شاعری پر مختصر تبصرہ بھی ہوتا جاتا تھا۔ یہ ایک نئی اپج تھی سننے والوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوا۔ ان کے سامنے یہ تصویر آئینے کی طرح واضح ہوگئی کہ اردو غزل میں شروع سے اب تک کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور اردو غزل نے کتنی ترقی کی۔

رات کو ڈراما سوسائٹی کی طرف سے ڈراما (اُجالے سے پہلے) دکھایا گیا۔ اس ڈرامے کو دیکھنے کے لئے شہر کے لوگ بھی اُمنڈ آئے تھے۔ ڈراما ہر طرح کامیاب رہا۔

اچھا آئیے اب ان سرگرمیوں کی کچھ تفصیل بھی سن لیجیے۔ پہلے مدرسہ ابتدائی کا حال سید منیر الحسن صاحب کی زبانی سنئے۔

(۱) تعلیمی نمائش

چہارم الف نے "ج پروجیکٹ" چہارم ب نے "مکھی مچھر پروجیکٹ" پنجم الف نے "نہرو پروجیکٹ" "اتحاد پروجیکٹ" "ہمارا دیس پروجیکٹ"، پنجم ب نے "گاندھی پروجیکٹ" "مولانا آزاد پروجیکٹ" اور ششم نے "تحریک آزادی کے مراکز اور ہمالیہ کی ہندوستانی مہم پروجیکٹ" چلائے۔

(۲) ٹی اسٹال

بچے سال بھر ایک پروجیکٹ چلاتے ہیں جو بچوں کا خوانچہ کے نام سے مشہور ہے میلے کے موقع پر بچے خوانچے کے بجائے ٹی اسٹال چلاتے ہیں تاکہ جامعہ کا تعلیمی میلا دیکھنے کے لیے آنے والے مہمان ٹی اسٹال سے اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق چیزیں لے سکیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بچے سال بھر اس کی آرزو کرتے ہیں کہ انھیں جامعہ کا میلا دیکھنے اور اس میں شرکت کرنے کا موقع ملے۔ یہ کام وہ بڑے شوق اور انہماک اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ واقعی انھوں نے اس کام کا حق ادا کر دیا ہے۔

امسال ٹی اسٹال حالی منزل اور اقبال منزل کے طلبا نے چلایا ہے جو اس کی آمدنی سے آگرہ کی تاریخی اور تعلیمی سیر کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

(۳) پھلوں کی دکان

میلا بازار کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں جتنے بھی اسٹال ہوتے ہیں وہ جامعہ کے کسی نہ کسی شعبے سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اس ادارے کے اراکین بھی اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صاف۔ تازہ اور اچھے (خشک وتر) پھلوں کی فراہمی کا انتظام اجمل منزل کے طلبا نے کیا اور بڑے سلیقے سے اپنی اس دکان کو چلایا۔ چنانچہ یہ بھی پھلوں کی اس دکان کی آمدنی سے آگرہ کی تعلیمی سیر کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

(۴) ڈرامے

جامعہ والوں نے ڈرامے کو بھی تعلیم کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اس کے تحت بچوں نے دو ڈرامے پیش کیے جن میں سے پہلے کا نام "چندا ماموں زندہ باد"

اور دوسرے کا نام: "لالچ بری بلا ہے" تھا۔

"چندا ماموں" ڈرامے کے ذریعے ضدی، رونے والے اور شرارتی بچوں کی توجہ صحت مند کاموں کی طرف کی گئی ہے۔ اس لیے کہ چھوٹے بچے اپنی ضد، خواہش اور ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ حربے استعمال کرتے ہیں نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اچھی طرح بچوں کی ان عادتوں کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ رات کی رانی کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوتا ہے رات کی رانی ان کو سزا دینے کا اعلان کرتی ہے۔ اتنے میں چندا ماموں داخل ہوتے ہیں اور رات کی رانی کو مشورہ دیتے ہیں کہ تم نے ان کی خوبیوں پر نگاہ نہیں ڈالی ان میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں، یہ سب اچھے بچے ہیں، مجھے امید ہے کہ یہ اپنی ان خرابیوں کو بھی دور کرلیں گے۔ اس پر بچے چندا ماموں زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور ڈرامہ ختم ہوجاتا ہے۔

"لالچ بُری بلا ہے" نام کے ڈرامے کا مرکزی کردار ایک ایسا لڑکا تھا جو دوسروں کی چیزیں چرا لیتا ہے، اس میں یہ عادت اس وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے کہ ماں باپ اس کی ہر خواہش اور ضرورت کو پورا نہیں کرپاتے جبکہ اس کے پڑوسی دوست (بچے) کے ماں باپ اس کی ہر خواہش پورا کرنے (اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے) کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس کی اس خراب عادت کو اس کا ایک ساتھی بھوت بن کر چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعد میں چور بچے پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ اس کے دوست نے یہ سوانگ بھرا تھا اور بھوت وغیرہ کوئی نہ تھا تو بھی وہ اس خراب عادت کو چھوڑنے کا پکا ارادہ کرلیتا ہے۔

یہ دونوں ڈرامے ہر اعتبار سے

بہت خوب تھے کیا چھوٹے کیا بڑے سب ہی نے ان کو پسند کیا اور ان کی تعریف کی۔

از سید منیر الحسن استاد مدرسہ ابتدائی
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اور اب مدرسہ ثانوی کی سرگرمیوں کا حال جمال اختر متعلم مدرسہ ثانوی) کی زبانی سنئے :-

گاندھی ٹرافی کے مقابلے

اس مرتبہ گاندھی ٹرافی کے مقابلے مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں ہوئے۔ دہلی کے پندرہ سولہ مدرسوں نے اس میں حصہ لیا اور اپنے پروگراموں سے لوگوں کو خوش کیا۔

اس مرتبہ پچھلے سالوں سے بھی زیادہ مدرسوں نے حصہ لیا۔ گانے، مائو ایکٹنگ گروپ سانگ کے علاوہ بھی بہت سے مقابلے ہوئے ان میں مدرسہ ثانوی نے بھی حصہ لیا، چند پروگرام تو اس قدر دلچسپ تھے کہ جی چاہتا تھا کہ دیکھا ہی کریں، ہر صوبے کے لوک گیت بھی پیش کیے گئے۔ خاص بات یہ تھی کہ گیت سنانے والے اسی دیس کے لباس اور زبان میں تھے جو اس علاقے کی خاص تھی۔ ہر علاقے کی پوشاک دیکھ کر جی خوش ہو جاتا۔ چند چھوٹے ساتھیوں نے بہت ہی اچھے گیت گائے، جن کو سن کر لوگ جھوم اٹھے، مائو ایکٹنگ بھی دل ہلا دینے والی تھی، ایک ہی طالب علم اپنے گلے سے مختلف قسم کی آوازیں نکالتا۔ بڈھے، بچے، ہر قسم کی آواز بنا کر ایکٹنگ کرنا ایک بہت بڑا کمال ہے۔ میرے ایک ساتھی رضی احمد کمال نے ایک غریب بڈھے اور اس کے بیمار بچے کی دکھ بھری کہانی انہی آوازوں میں پیش کی جس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اب کی بار دو چیزیں نئی رکھی گئی تھیں، (۱) مضمون نگاری کا مقابلہ اور (۲) پینٹنگ۔ مضمون ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ اگرچہ عنوان وقت

کے وقت دیا گیا تھا۔ پینٹنگ میں دہلی کے مختلف اسکولوں کے ۴۰ سے زیادہ طلباء نے پورے جوش وخروش کے ساتھ حصّہ لیا، اور عمدہ سے عمدہ تصویریں بنائیں۔

ان مقابلوں میں دو اسکولوں بٹلر ہائر سکنڈری اسکول اور ماڈرن ہائر سکنڈری اسکول) نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے، اس وجہ سے شیلڈ دونوں اسکولوں کو چھ چھ مہینے کے لئے دی گئی، جن کو انعامات ملے ان کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن جن کو مایوسی ہوئی وہ اس جذبہ کے ساتھ پنڈال سے باہر آرہے تھے کہ اگلی دفعہ زیادہ محنت اور خوبی کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے، اور انعام حاصل کریں گے۔ (جمال اختر)

جغرافیہ پروجکٹ کی نمائش

اس مرتبہ ہم نے میلے میں اپنے جغرافیہ پروجکٹ کی نمائش کی۔ اس پروجکٹ کے سلسلے میں ہم نے بہت سی معلومات حاصل کیں۔ موسم کے بارے میں جتنی کتابیں مل سکیں ان سب کو ہم نے پڑھ ڈالا۔ ان کتابوں کی تصویروں کو چارٹوں پر بنایا۔ اپنی معلوما ت کی بنیاد پر پمفلٹ لکھے۔

اس کے علاوہ ہوا پانی کے دفتر گیے وہاں ان مشینوں کو دیکھا جن سے موسم کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہاں لوگوں نے بہت تفصیل کے ساتھ ساری باتیں بتائیں۔ ہماری درخواست پر انھوں نے چند مشینیں ہمیں عاریتہ بھی دیں انھیں بھی ہم نے اپنی نمائش میں رکھا۔ پروجکٹ کی اس نمائش کو بہت سے لوگوں نے دیکھا اور پسند کیا۔

بیت بازی

بیت بازی کا پروگرام ہر سال

ہوتا ہے۔ اس سال ایک نئی بات ہوئی۔ اب کے یہ مقابلے جامعہ کے نئے اور پرانے طالب علموں کے درمیان ہوئے۔ اس کی تیاری بھی بہت دن پہلے سے کی گئی تھی۔ طلباء کو شعر پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا —— انہیں اچھے اچھے شعر یاد کرائے گئے اور تلفظ کی غلطیوں کو دور کیا گیا۔

اس مرتبہ یہ مقابلہ پچھلے سال سے بہتر رہا۔ اور دونوں پارٹیوں کو دو دو انعام دئے گئے۔

ڈراما

ہر سال کی طرح ہم نے میلے میں ایک مزاحیہ ڈراما (چور نہیں آتے) پیش کیا۔ ڈرامے کی تیاری ہم نے بڑی محنت سے کی تھی۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ سبھی نے اسے پسند کیا۔ یوں کہیے کہ ہماری محنت وصول ہوگئی۔ (صلاح الدین متعلم مدرسہ ثانوی)

جواہر لال نہرو انعام

ابھی پچھلے جون (۱۹۶۴ء) کی بات ہے، ہمارے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) پروفیسر محمد مجیب نے جواہر لال نہرو انعام کا اعلان فرمایا تھا۔ اس انعام کی رقم ایک ہزار روپیے رکھی تھی۔ یہ اعلان ہمارے شیخ الجامعہ نے ایک تعزیتی جلسے میں کیا تھا جو پنڈت جی کے انتقال کے بعد کیا گیا تھا۔ آپ نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ۱۲ سے ۲۵ سال تک کے طالب علم مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں یعنی ابتدائی سے کالج تک کے لڑکے۔

پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ انعام مدرسہ ثانوی کے ایک طالب علم سید رضا مہدی کو ملا۔ ہم اپنی طرف سے، اپنے پیامیوں کی طرف سے سید رضا مہدی، ان کے والد حکیم سید حسن مہدی (میرٹھ) جامعی اور مدرسہ ثانوی جامعہ کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

پچھلے مہینے (۱۵ر نومبر ۱۹۶۴ء) اس سلسلے میں ایک خاص تقریب منائی گئی اور امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ کے ہاتھوں یہ انعام سید رضا مہدی کو دلوایا گیا۔

اس موقع پر ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس کے ضروری حصے نیچے دیے جاتے ہیں۔

"اس انعام کا اعلان اسی سال جون میں کیا گیا تھا، اس کی کوشش کی گئی کہ جامعہ کے کھلنے سے پہلے ہی طالب علموں کو اس انعام کی اطلاع ہو جائے اور جامعہ کے کھلنے کے بعد ان کو ذہنی طور پر

مقابلے کے لیے تیار کرنے کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ چونکہ امیدوار بارہ سے لے کر ۲۵ سال کی عمر تک کے ہو سکتے تھے، اس لیے ہر ادارے کے طالب علموں نے اور بعض ایسے سابق طالب علموں نے، جنھوں نے ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء میں سند حاصل کی تھی، مقابلے میں شرکت کا ارادہ کیا۔ پہلا انتخاب وسط اکتوبر میں کیا گیا اور تحریری امتحان ۲۸ اکتوبر کو لیا گیا۔ ۷ نومبر کو ایک کمیٹی نے، جس کے صدر جناب ڈاکٹر تارا چند تھے، آخری انتخاب کیا، اور یہ طے پایا کہ یہ انعام سید رضا مہدی متعلم ثانوی سوم کو دیا جائے۔

اس بات پر تعجب ہو سکتا ہے کہ ایسے مقابلے میں، جس میں ابتدائی بچّم سے لے کر ایم اے تک کے طالب علم شریک ہوں، صحیح انتخاب کیسے کیا جا سکتا ہے، لیکن ہم نے دیکھا کہ جو معیار رکھا گیا تھا، اس کے مطابق ایسا انتخاب ہو سکتا ہے۔

سید رضا مہدی کو اس لیے پسند کیا گیا کہ ان میں اعتماد ہے، وہ جتنا جانتے ہیں اچھی طرح ان کے ذہن نشین ہو گیا ہے، وہ اپنا مطلب صاف سمجھا سکتے ہیں اور جس سے گفتگو کرتے ہیں اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں، ان میں متانت ہے اور خلوص اور شوق اور انکسار کی ایک کیفیت جو ان کی خود اعتمادی کو اور نمایاں کرتی ہے اپنے ساتھیوں پر وہ قابلیت کا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کی شخصیت خود دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس طرح وہ سب کی نظروں میں ممتاز رہتے ہیں، ان میں خاصی ظرافت ہے اور وہ اکثر مسکراتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کا انتخاب کرتے وقت یہ بات کمیٹی کے ذہن میں نہ تھی، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت مناسب ہے کہ

جواہر لال نہرو انعام اس عمر کے
بچے کو دیا جائے۔ جس کی طرف
جواہر لال نہرو سب سے زیادہ مائل
تھے۔

اس تقریر کے بعد جناب امیر جامعہ
نے رضا مہدی کو انعام مرحمت فرمایا
اور موقع کے مناسب اور برمحل
تقریر کی۔ آپ نے رضا مہدی کو
مبارک باد دی، اور فرمایا کہ جو
جو باتیں تمھارے بارے میں شیخ الجامعہ
نے بتائی ہیں یہ اگر مجھ میں بھی
ہوتیں تو میں اس پر فخر کرتا، امید
ہے کہ ان اچھی صفات کو تم نہ
صرف باقی رکھو گے بلکہ انھیں اور
ترقی دو گے۔ آخر میں آپ نے
جامعہ کے اس ماحول کی تعریف
کی جس میں رہ کر بچے کی اچھی
صلاحیتوں کے ابھرنے کا موقع
ملتا ہے۔

آخر میں عزیز رضا مہدی نے
ایک ننھی منی سی تقریر کی، یہ بھی
آپ پڑھ لیجیے۔

محترم جناب صدر، بزرگو، بھائیو اور بہنو
مجھے اس بات سے بڑی مسرت
ہے کہ جج صاحبان نے مجھے نہرو پرائز
کا مستحق ٹھہرایا۔ مگر مجھے یہ غلط فہمی
نہیں ہے کہ یہ انعام مجھے اس لیے
دیا گیا کہ میرے اندر آج وہ سب
خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے
طالب علم میں ہونی چاہئیں اور
جو پنڈت نہرو اور دوسرے بڑے
آدمیوں میں ان کی طالب علمی کے
زمانے میں پائی جاتی تھیں۔ ہاں
شاید میرے بزرگوں کو کچھ ایسے
آثار نظر آئے ہوں کہ اگر میں کوشش
کرتا رہوں تو ایک دن مجھ میں وہ
خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں
کہ میں دل و جان سے اپنے اندر
ان صفات کو پیدا کرنے کی کوشش
کروں گا۔ جن کی بدولت میں
سچ مچ اپنی جامعہ کا اچھا طالب علم

اور دیس کا اچھا شہری بن جاؤں۔ میں جامعہ میں جو علم حاصل کروں گا وہ اس لیے نہیں کہ بہت سا روپیہ کماؤں اور ٹھاٹ باٹ سے رہوں، بلکہ اس لیے کہ اپنے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح اپنے آپ کو دیس کی، اپنی قوم کی اور سب انسانوں کی خدمت میں کھپا دوں، میرے لیے سب سے زیادہ خوشی اور فخر کی بات یہ ہوگی کہ لوگوں کی بھلائی کا کوئی ایسا کام کر جاؤں، جس سے دنیا میں میری جامعہ کا اور میرے دیس کا نام روشن ہو۔

"میں خدا سے دُعا کرتا ہوں، اور آپ سب لوگ بھی دعا کیجیے، کہ یہ ارادے جو میرے دل میں ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ میرے اور بھائیوں کے دل میں بھی ہوں گے، پورے ہوں۔ اور ہم مل کر اپنے دیس میں اور ساری دنیا میں امن اور خوش حالی کا راج قائم کریں، جس سے ہمارے پیارے پنڈت جی کی روح خوش ہو۔ "جے ہند"

میر تقی میر
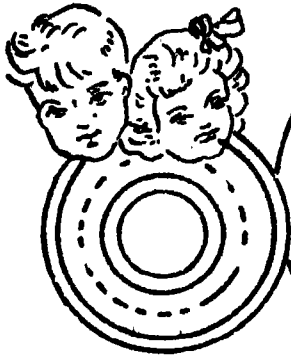
انوکھی لائبریری

دہلی میں بچوں کے لیے ایک انوکھی لائبریری کھل رہی ہے۔ بالکل انوکھی! کھلونوں کی لائبریری! اس لائبریری میں اپنے دیس کے بنے ہوئے کھلونے بھی ہوں گے دوسرے ملکوں کے کھلونے بھی ہوں گے۔ یہ بالکل اسی طرح بچوں کو دئے جائیں گے جس طرح بچوں کو لائبریری کی کتابیں دی جاتی ہیں۔ اس لائبریری کا نام "چاچا نہرو ٹوائز لائبریری" ہوگا۔ ڈنمارک نے تقریباً ایک ہزار گڑیاں اور کھلونے بھیجے ہیں۔ ڈنمارک میں اس طرح کی ان گنت لائبریریاں پہلے سے موجود ہیں۔ ڈنمارک کے چار بچوں کا ایک وفد ہندوستان آرہا ہے اور ۲۶ر جنوری کو اس لائبریری کا افتتاح کرے گا۔

مصنوعی گھاس

جی ہاں مصنوعی گھاس، یعنی زمین میں بیج بوئے بغیر گھاس اُگانا۔ یہ تجربہ ارجنٹائن کے ایک کسان اور مغربی جرمنی کے ایک مستری نے مل کر کیا ہے۔ انھوں نے یہ گھاس زمین میں بوئے بغیر صرف مشین کی مدد سے اگائی ہے۔ یہ گھاس مویشیوں کے لیے اچھے چارے کا کام دے سکے گی۔ یہ گھاس انھوں نے مویشیوں کو کھلائی بھی ہے اور انھوں

نے خوب شوق سے کھائی ہے۔

یوم تاسیس

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو قائم ہوئی تھی۔ اسی لیے ہر سال اس تاریخ کو جامعہ کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ اس سال بھی ۲۹ر اکتوبر کو یہ تقریب منائی گئی۔ اس کی تفصیل آپ اس پرچے میں دوسری جگہ دیکھیے۔

جلسہ تقسیم انعام

۲۹ر اکتوبر کی شام جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند نے جو جامعہ ملیہ کے چانسلر بھی ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کامیاب طلباء کو اسناد تقسیم کیں۔

وزیر اعظم کویت کی آمد

۱۸ر نومبر کو کویت کے ولی عہد شیخ صباح السلام الصباح جو اپنے ملک کے وزیر اعظم بھی ہیں۔ جامعہ ملیہ میں تشریف لائے۔ جامعہ کی طرف سے سپاسنامے کے جواب میں ممدوح نے کلام پاک، عربی کتابیں اور پچاس ہزار روپیہ نقد جامعہ ملیہ کو عطیہ دیا۔

ہاکی ٹیسٹ میچ

نومبر کے آخری ہفتے میں مشرقی جرمنی کی ہاکی ٹیم ہندوستان آئی۔ اور ہندوستانی ٹیم سے دو ٹسٹ میچ کھیلی۔ دونوں میچوں میں ہندوستان کی ٹیم کو فتح ہوئی۔

جامعہ کا تعلیمی میلا

ہمیشہ کی طرح اس سال بھی ۳۰۔ ۳۱ر اکتوبر کو یکم نومبر کو تعلیمی میلا ہوا۔ اس کی تفصیل بھی آپ اسی رسالے میں پڑھیے۔

سیّد رضا مہدی کے متعلق آپ نے بہت کچھ معلوم کرلیا۔ اب ان کی تصویر بھی اس شمارے کے سرورق پر دیکھیے اور کوشش کیجیے کہ آپ کی تصویر بھی اسی طرح چھپے
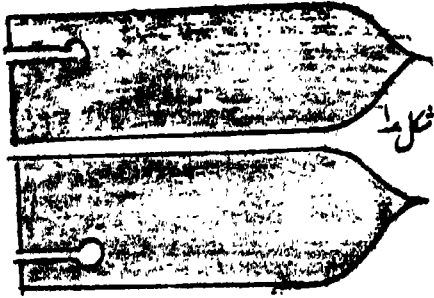
ناؤ چلایئے

۱- انگریزی دوا فروش کی دکان سے تھوڑا سا کافوری گوند (GUM CAMPHOR) خرید لایئے۔

۲- تھری پلائی یا چکنے موٹے کاغذ کے ۲ انچ لمبے اور ۱½ انچ چوڑے دو ٹکڑے شکل ۱ کے مطابق کاٹ لیجیے۔ ان ٹکڑوں میں ایسے کھانچے بھی کاٹ لیجیے جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔

۳- کسی بڑی لگن یا تسلے میں پانی بھر دیجیے۔

۴- تھری پلائی کے کھانچوں میں کافوری گوند کے ٹکڑے اس طرح اٹکا دیجیے کہ وہ گرنے نہ پائیں اور اگر ان ٹکڑوں کو لگن میں چھوڑا جائے تو کافور کے ٹکڑے پانی کو چھوتے رہیں۔

۵- لگن کا پانی جب ٹھہر جائے تو اس کی سطح پر دونوں ٹکڑوں کو آہستہ سے رکھ دیجیے۔ دونوں ٹکڑے کشتی کی طرح پانی پر تیرنا شروع کر دیں گے۔ دیکھیے شکل ۲

شکل ۲

"تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے"۔ اس کا اندازہ رسالہ ٹائم میں چھپنے والے ایک مضمون سے ہوتا ہے۔ رسالہ ٹائم کے تازہ شمارے میں ابراہام لنکن اور کنڈی کے قتل کے متعلق تفصیلات شائع کی گئی ہیں وہ بالکل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ آپ بھی پڑھیے :-

پریسیڈنٹ ابراہام لنکن

۱- ابراہام لنکن کا انتخاب سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوا تھا۔
۲- ابراہام لنکن کو جمعہ کے دن قتل کیا گیا۔
۳- پیچھے سے گولی چلائی گئی جو ابراہام لنکن کے سر میں لگی۔
۴- قتل کے موقع پر صدر کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔
۵- لنکن کے قتل کے بعد جنوبی ریاستوں

پریسیڈنٹ کنڈی

۱- کنڈی کا انتخاب سنہ ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا۔
۲- صدر کنڈی کا قتل بھی جمعہ کے دن ہوا۔
۳- پیچھے سے گولی چلائی گئی تھی جو صدر کنڈی کے سر میں لگی۔
۴- مسز جیکولین کنڈی بھی قتل کے وقت صدر کے ساتھ تھیں۔
۵- کنڈی کے قتل کے بعد نائب صدر

سے تعلق رکھنے والے جانسن نامی لیڈر نے صدارت کا عہدہ سنبھالا۔

۶- صدر ابراہام لنکن کا قاتل مقدمہ چلائے جانے سے قبل گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

۷- لنکن کے نام کے انگریزی حروف تہجی کی تعداد سات ہے۔

۸- صدر کے قاتل کا نام (۱۵) حروف تہجی پر مشتمل ہے۔

۹- لنکن کا قاتل جان ولکس بوتھ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا تھا۔

۱۰- صدر لنکن کے بعد برسر اقتدار آنے والے انڈریو جانسن ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔

۱۱- ابراہام لنکن کو ایک تھیئٹر میں قتل کیا گیا اور قاتل نے ایک ویر ہاوز میں پناہ لی۔

۱۲- لنکن کو اس وقت قتل کیا گیا جبکہ وہ فورڈ تھیئٹر میں موجود تھے۔

جانسن صدر بنے۔ ان کا تعلق بھی جنوبی ریاستوں سے ہے۔

۶- صدر کنڈی کے قاتل کو مقدمہ چلائے جانے سے پہلے گولی مار دی گئی۔

۷- کنڈی کے نام میں بھی سات انگریزی حروف تہجی ہیں۔

۸- کنڈی کے قاتل کا نام بھی (۱۵) حروف پر مشتمل ہے۔

۹- کنڈی کا قاتل لی ہاروے اسوالڈ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا۔

۱۰- کنڈی کے بعد برسر اقتدار آنے والے لنڈن جانسن کی پیدائش ۱۹۰۸ء کی ہے۔

۱۱- کنڈی کے قاتل نے ایک ویر ہاوز کی عمارت سے انھیں قتل کیا اور بعد میں ایک تھیئٹر میں پناہ لی۔

۱۲- کنڈی کو اس وقت قتل کیا گیا جبکہ وہ فورڈ کی تیار کردہ موٹر میں سفر کر رہے تھے۔

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پورے سو سال بعد ایک ہی نوعیت کے واقعہ کا پیش آنا نہ صرف ایک اتفاق ہے بلکہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

لطیفے

سٹورکیپر : یہ کیا بات ہے کہ اور مزدور تو دو دو بوریاں اٹھاتے ہیں اور تم ایک ہی اٹھاتے ہو۔
مزدور : بندہ نواز۔ یہ کام چور ہیں، دو پھیرے ڈالنے سے کتراتے ہیں۔

" میری عینک کھو گئی ہے۔"
" تو اسے ڈھونڈ کیوں نہیں لیتے۔"
" جب تک وہ مجھے مل نہ جائے میں کوئی چیز ڈھونڈھ کیسے سکتا ہوں۔"

" بڑے میاں یوں نہ روؤ — اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو یوں نہ روتا۔"
" تم جس طرح تمھارا جی چاہے رونا۔ مجھے تو یہی طریقہ آتا ہے۔"

" وہ سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا رہا ہے"
" پر تھیں کیسے پتہ چلا۔"
" میں صبح سے اسے دیکھ رہا ہوں۔"

" جب کبھی میں تمھیں دیکھتا ہوں مجھے ایک بہت بڑا آدمی یاد آتا ہے۔"
" بھلا کون ہے وہ عظیم الشان ہستی"
" ڈاروِن۔"

مالکن : شیراتن اری او شیراتن۔ ہائے اللہ آوازیں دیئے جا رہی ہوں۔ کیا تجھے سنائی نہیں دیتا۔
شیراتن : نہیں بیگم صاحب۔ جب تک آپ نے تیسری بار آواز نہیں دی مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔

بیوی: تم بڑے فضول خرچ ہو جی۔ ہمیشہ ایسی چیز لاتے ہو جن کا کوئی استعمال ہی نہیں ہوتا۔
شوہر: بھلا بتاؤ تو میں نے ایسی کونسی فضول چیز خریدی ہے۔
بیوی: اب میں تمھیں کیا کیا گنواؤں؟ ابھی پچھلے سال تم وہ آگ بجھانے والا آلہ اُٹھا لائے، آج تک کام نہیں آیا۔

دوست: تم نے اپنی بیوی پر کُرسی کیوں دے ماری۔
شوہر: صوفہ بہت بھاری تھا۔

احمد:- بھئی سرکس میں ایک شخص تو گھوڑے پر عجیب عجیب کرتب دکھاتا ہے۔ کبھی اس کی پیٹھ پر سے پھسل جاتا ہے۔ کبھی اس کی گردن پکڑ کر جھول جاتا ہے۔ کبھی بھاگتے گھوڑے سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔

نسیم:- واہ یہ بھی کوئی کمال کی بات ہے۔ احمد میاں یہ سارے کرتب تو میں نے اس وقت دکھائے جب میں پہلی بار گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔

مالک: گدھے! یہ چھری صاف نہیں ہے، سُنا،
نوکر: حضور یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی تو میں نے اس سے صابن کاٹا ہے۔

کتابوں ـــ کی ـــ باتیں

صبحِ اُمیدِ نو ـــــ (مہاراشٹر، نمبر) حصہ دوم

جہازی سائز۔ ضخامت ۱۶۲ صفحات، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت سالانہ چھ رُوپے، اس خاص نمبر کی قیمت: تین رُوپے۔ ملنے کا پتہ: دفتر صبح امید بمبئی ۳

یہ علمی وادبی رسالہ جناب عبدالحمید خاں صاحب بوبیرے تقریبًا تیس سال سے نکال رہے ہیں بڑی کامیابی سے نکال رہے ہیں۔ یہ بڑوں کا رسالہ ہے، بڑوں کے رسالوں میں اس کا ذکر آنا چاہیے۔ مگر اس کا مہاراشٹر نمبر بڑوں اور چھوٹوں سب کے لیے یکساں مفید ہے۔ اس میں مہاراشٹر کی پوری ریاست کی صنعتی سرگرمیوں کے بارے میں مستند اور بھرپور معلومات ہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے قصبوں کی صنعتی کاروبار کو خاصی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

عبدالحمید بوبیرے صاحب نے یہ خاص نمبر بڑی محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ تیرہ چودہ صفحوں پر تصویریں ہیں۔ ان تصویروں نے رسالے کی افادیت اور خوب صورتی کو بہت بڑھا دیا ہے۔

اسکول کی لائبریریوں سے اس معلوماتی خزانے کو منگانے کی ہم خاص طور پر سفارش کرتے ہیں۔

شعلۂ حیات (پندرہ روزہ) مدھیہ پردیش، اردو نمبر

سائز بڑا، ضخامت ۱۴۰ صفحے، اس خاص نمبر کی قیمت دو روپے پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ: دفتر شعلۂ حیات جہانگیر آباد، بھوپال

یہ پندرہ روزہ رسالہ بھی بڑوں کا رسالہ ہے مگر اس کا مدھیہ پردیش اردو نمبر خاص طور پر اس قابل ہے کہ اس کا ذکر ان صفحوں میں کیا جائے۔ اس میں مدھیہ پردیش خاص طور پر بھوپال میں اردو کی عہد بہ عہد ترقی کا ذکر ہے۔ رسالے کے قابل ایڈیٹر جناب عرفان صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بڑی محنت اور بڑی دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے۔

اس میں اردو زبان کی تاریخ ہے۔ اور مدھیہ پردیش میں اردو سے متعلق موجودہ سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ لکھائی بہت اچھی ہے مگر بہت باریک ہے۔ اگر جلی ہوتی تو یہی مواد دوگنی ضخامت میں آتا۔ ہمیں امید ہے کہ اردو سے محبت رکھنے والے بچے اور بڑے اس کارآمد نمبر کو ضرور خریدیں گے۔

(پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپواکر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا)

نرسری اسکول کے بچے گا رہے ہیں

ember 1964.

Regd. No. D. 1457

Payam -i- Taleem

NEW DELHI. 25